ریاست حیدرآباد میں
جدّوجہد آزادی

(ابتدائی دور)

۱۸۰۰ء — ۱۹۰۰ء

سیّد محمد جواد رضوی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

Riyasat Hyderabad Men Jadde Jahd-e-Azadi

By

Syed Mehd Jawwad Rizvi

سنہ اشاعت اپریل، جون ــ 1992 شک 1913

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن: 2000

قیمت: ₹/20

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 683

ناشر: ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی-110066

طابع: جے. کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لئے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا، ڈولسانی اور اردو۔اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہونچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

فہمیدہ بیگم

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست

(ا) پیش لفظ	11
(ب) دیباچہ — گوپال راؤ ایکبوٹے	17
(ج) تمہید	21
پہلا دور — ۱۸۰۰ء — ۱۸۱۵ء	31
عالی جاہ کی بغاوت ۱۷۹۵ء	32
نور الامراء کی بغاوت	34
راجہ راؤ رمبا نمبال کر کی بغاوت	36
راجہ مہی پت رام کی بغاوت	38
پہلے دور کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	41
دوسرا دور — ۱۸۱۵ء — ۱۸۵۷ء	44
سامراجی فوجوں کا قیام	
پامیر اینڈ کمپنی کا قیام	50
مبارز الدولہ کی بغاوت اور وہابی تحریک	53
مبارز الدولہ کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	61
کرنول کی بغاوت	67
مقامی بغاوتیں — ۱۸۱۸ء — ۱۸۴۱ء	69
اورنگ آباد میں بغاوتیں	69

اورنگ آباد کی بغاوتوں میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست	76
بیڑ میں بغاوتیں۔ ۱۸۱۸ء	79
امبڑ میں بغاوت	82
بیڑ کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	82
ناندیڑ میں بغاوتیں	83
ناندیڑ کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	67
کپل میں بغاوتیں	88
کپل کی بغاوتوں میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	92
اُدگیر کے دیس مکھ کی بغاوت	
بیدر میں بغاوت	97
عادل آباد میں بغاوت	99
مومن آباد میں فوجی بغاوت	102
رائچور میں بغاوت	103
رائچور کی بغاوت میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	106
تیسرا دور ـ ۱۸۵۷ء ـ ۱۸۸۰ء	107
۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا پس منظر اور برٹش رزیڈنسی پر مجاہدین کا حملہ	107
رزیڈنسی پر حملہ میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	[illegible]

ریاست حیدر آباد میں زرعی اور نظم و نسق کے اصلاحات کی شروعات	125
سر سالار جنگ کے اصلاحات	127
مقامی بغاوتیں۔ ۱۸۵۸ء۔ ۱۸۸۰ء	131
شورا پور میں بغاوتیں	132
شورا پور کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست	136
مل کھیڑ میں بغاوت	137
کوڑگو کے راجہ صاحب کا دلچسپ قصہ	
نظام آباد میں بغاوت	138
راجہ صاحب کولاس کی بغاوت	140
نظام آباد اور راجہ صاحب کولاس کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست	142
روہیلوں کی بغاوتیں	144
نرمل میں بغاوت	149
اجنٹہ کے بھیلوں کی بغاوت	150
چولہ میں بغاوت	151
نلنگہ میں بغاوت	
شاہ غلام حسن	152
بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	153
گنگا کھیڑ کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست	161

کھرڑلہ کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	162
عمرگہ اور تامسہ کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	163
ہنگولی کی بغاوت میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	164
راجورہ کی سازش میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	165
مرہٹواڑہ کے مختلف اضلاع کی بغاوتوں میں حصہ لینے اور اعانت کرنے والے اصحاب کی فہرست	168
بیگم بازار (شہر حیدرآباد) کی باغیانہ تحریک	174
بیگم بازار کی بغاوت میں حصہ لینے والے اصحاب کی فہرست	
سکندرآباد اور کوکٹ پلی میں باغیانہ سرگرمیاں اور گرفتاریاں	178
بھالکی میں سازش	180
بھالکی کی سازش میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست	182
واسدیو بلونت پھٹکے کی بغاوت	188
واسدیو پھٹکے کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	190
رامپا بس بغاوت	193
رامپا کی بغاوت میں حصہ لینے والے اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست	198

ریکاپلی میں بغاوت 196
ریکاپلی کی بغاوت میں حصہ لینے والے 201
اور مدد کرنیوالے اصحاب کی فہرست
چوتھا دور ۔ ۱۸۸۰ء ۔ ۱۹۰۰ء 202
چاندہ ریلوے اسکیم کے خلاف احتجاج 203
انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 204
صحافتی سرگرمیاں اور ریاستی حکومت کی 205
پابندیوں کا آغاز
آریہ سماج تحریک کی ابتداء 207
گنیش اُتسو کی شروعات
ڈاکٹر رگھوناتھ چیٹو پادھیا 209
مُلّا عبد القیوم 214
مولوی محب حسین 222
بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری 230
باباصاحب کی بغاوت 232
سابق ریاست حیدرآباد کا نقشہ 241
ضمیمہ 243
آصف جاہی خاندان کے بادشاہوں اور 243
اعلیٰ عہدیداروں کی فہرست
ریاست حیدرآباد سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و 247
رسائل کی فہرست
اہم تاریخی واقعات 249
کتابیات
(ا) اردو کتابیں 257
(ب) انگریزی کتابیں 259

پیش لفظ

ریاست حیدر آباد کی جدوجہد آزادی پر یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

تو جانی حساب کم و بیش را!

اور "کم و بیش" کا ناقدانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیجئے۔ اظہار خیال میں پس و پیش سے بالکل کام نہ لیجئے۔ سابق ریاست حیدر آباد کی جدوجہد آزادی (ابتدائی دور) پر اردو میں شاید یہ پہلی کتاب ہے جو پوری انیسویں صدی (۱۸۰۰ء - ۱۹۰۰ء) کا احاطہ کرتی ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی پر جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں عام طور پر (۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے (۱۹۴۷ء (یعنی ۹۰ سال) کے درمیانی دور کا جائزہ لیا گیا ہے اور میرا یہ احساس ہے کہ ان کتابوں میں زیادہ تر شمالی ہند کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جن مجاہدین آزادی کے سوانحی خاکے پیش کئے گئے ہیں ان کی اکثریت کا تعلق بھی ان ہی علاقوں سے ہے۔ اسی بناء پر مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ جنوبی ہند (خاص طور پر سابق ریاست حیدر آباد) کے عوام کی جنگ آزادی اور اس میں حصہ لینے والے مجاہدین کے کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے۔ یہی جذبہ اس کتاب کے لکھنے کا محرک بنا!

اسی سلسلہ میں یہ عرض کر دوں کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور جب بغاوت کا یہ شعلہ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی اور شمالی ہند کے دوسرے علاقوں میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ ان واقعات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں سامراجی استبداد کے خلاف عوامی بغاوتوں کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس کتاب میں سابق ریاست حیدر آباد کی ان سامراج دشمن بغاوتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا سلسلہ ۱۸۰۶ء سے شروع ہوا اور ۱۸۴۱ء تک جاری رہا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ مسلسل (۳۵) سال تک جنوبی ہند کی ان مقامی بغاوتوں نے

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے لئے راہیں ہموار کیں۔

میں یہ کتاب ملک کے دانشوروں اور مجاہدین آزادی کی خدمت میں اس امید سے نذر کر رہا ہوں کہ وہ آئندہ اس موضوع پر اس سے بہتر اور جامع نگارشات پیش فرمائیں گے۔ اس گذارش احوال واقعی کے بعد اس کتاب کے قدوخال کو واضح کر دوں۔

یہ کتاب تمہید کے علاوہ چار ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلے دور کی ابتداء ۱۸۰۰ء سے کی گئی ہے کیونکہ اس سال کمپنی سرکار اور نظام علی خاں آصف جاہ دوم کے درمیان معاہدہ معاونت طے پایا تھا۔ جس نے ریاست حیدرآباد کی خودمختار حیثیت کو بالکل ختم کر دیا اور کمپنی سرکار کے اقتدار اعلیٰ کی بنیاد رکھی اور اس اقتدار اعلیٰ کو مستحکم بنانے اور مستقبل میں انگریز دشمن طاقتوں نے اگر سر اٹھایا تو ان کی سرکوبی کے لئے تین طاقتور فوجیں تشکیل دی گئیں۔ ریاست پر ان تباہ کن سیاسی اور فوجی وار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کا شیرازہ پوری طرح بکھیرنے میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اس کو "پامر اینڈ کمپنی" کے قیام اور اس کی من مانی لوٹ کھسوٹ نے پورا کر دیا۔ ان بگڑتے ہوئے حالات اور ریاستی امور میں کمپنی سرکار کے ایجنٹ برٹش رزیڈنٹ کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کے خلاف ریاست کے شہزادے، امراء اور رؤسا کی بغاوتیں شروع ہوئیں۔ ان بغاوتوں میں انفرادی مفادات اور آپسی رقابتوں کا عنصر موجود تھا لیکن اسی کے ساتھ انگریز دشمن جذبہ بھی کارفرما تھا اور مبارز الدولہ کی بغاوت میں تو پہلی بار ایک کل ہند سیاسی تحریک (وہابی) نے بہت ہی اہم رول ادا کیا۔ اس کے بعد ریاست کے اکثر اضلاع میں (خاص طور پر رہٹواڑہ اور کرناٹک میں) مقامی بغاوتوں کا جوالامکھی پھوٹ پڑا۔ ان بغاوتوں کی نوعیت میں ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ ان میں چھوٹے راجوں، دیسی مکھوں اور زمینداروں کے علاوہ جنگجو قبائل نے نمایاں طور پر حصہ لیا۔ اور اسی کے ساتھ دوسرا دور اختتام کو پہنچتا ہے۔

کتاب کا تیسرا دور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۵۸ء اور ۱۸۸۰ء کی درمیانی مدت کی مقامی بغاوتوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا اور آخری دور (۱۸۸۰ء — ۱۹۰۰ء) کے درمیانی مدت کا احاطہ کرتا ہے۔

پہلے دور میں ریاست کے مختلف حصوں میں ایک درجن سے زیادہ مقامی بغاوتیں

ہوئیں جن میں چند رجواڑوں کے علاوہ گونڈ قبیلوں اور روہیلوں کا حصہ قابل ذکر ہے جنہوں نے اس جدوجہد کو ایک لڑاکا کا روپ دیا اور چھاپہ مار لڑائی کے طریقۂ کار کی ابتداء کی۔ البتہ چوتھا دور جو سب سے مختصر (۲۰) سالہ دور ہے وہ نسبتاً پُرامن رہا لیکن اسی زمانہ میں ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر تحریک آزادی کو زیادہ منظم بنیادوں پر آگے بڑھانے کیلئے انڈین نیشنل کانگریس اور آریہ سماج جیسی اہم تنظیمیں قائم ہوئیں اور سماجی اصلاح اور تعلیمی مسائل پر زیادہ توجہ کی گئی۔

اس کتاب کو جن چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے ہر دور کے ابتدا میں اس دور کے اہم واقعات کے نمایاں قدوخال اور خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں شروع ہونے والی مقامی بغاوتوں اور ان میں حصہ لینے والے مجاہدین آزادی کے کارناموں کو اُجاگر کیا گیا ہے اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ ان بغاوتوں کے رہنماؤں کے علاوہ ان مجاہدین کو بھی فراموش نہ کیا جائے جنہوں نے ان بغاوتوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے حصہ لیا تھا یا تعاون کیا تھا۔

ریاست کے جن مختلف مقامات پر بغاوتیں ہوئیں ان کے ذکر سے پہلے اس مقام کی دور قدیم، دور وسطیٰ اور دور جدید کی تاریخ کا اجمالاً تذکرہ کیا گیا ہے اور ان مقامات کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نوعیت کی کوشش غالباً پہلی بار کی گئی ہے۔ یہاں ایک اور بات واضح کرتا چلوں کہ یہ کتاب ریاست حیدرآباد کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک وسیع تر تاریخ کا صرف ایک حصہ ہے جو یقیناً بہت اہم ہے۔ چونکہ یہ کتاب حیدرآباد کی جدوجہد آزادی تک محدود ہے اس لئے اس میں اُن ہی مسائل، تنظیموں اور تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس سے جڑی ہوئی ہیں یا پھر پس منظر کے طور پر بعض امور کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب میں حیدرآبادی عوام کی مخالف انگریز جدوجہد کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور جو عناصر ان کے خلاف صف آرا تھے انہیں بے نقاب کیا گیا ہے۔

آخر میں یہ میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ ان ماخذوں، اداروں اور اشخاص کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں جن کی بدولت یہ کتاب مکمل ہو سکی۔ اس کتاب کا سب سے اہم اور بنیادی ماخذ حیدرآباد کی جدوجہد آزادی پر لکھی ہوئی وہ تین جلدیں ہیں جنہیں

سابق حکومت حیدرآباد کی جانب سے اس مقصد کے لئے قائم کردہ اسٹیٹ کمیٹی نے مرتب کیا تھا اور ۱۹۵۶ء ۔ ۱۹۵۷ء میں شائع کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا تفصیلی ذکر کتابیات میں کیا گیا ہے۔

جن اداروں نے میری اعانت کی ان میں اسٹیٹ آرکیوز، سالار جنگ میوزیم کا کتب خانہ، جامعہ عثمانیہ کی لائبریری، سٹی سنٹرل لائبریری اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے لائبریری قابل ذکر ہیں۔

جب اشخاص کا ذکر آتا ہے تو ان میں سرفہرست جناب نصیر الدین ہاشمی مرحوم کے فرزند ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی ہیں جنہوں نے حق دوستی ادا کیا اور اپنے والد کی لائبریری کی کتابیں، رسائل اور اہم دستاویزات کے پورے ذخیرے سے مجھے استفادہ کا موقع فراہم کیا۔ ان ہی کاغذات میں مجھے ایک انمول فہرست ملی جس میں چھ سو (۶۰۰) کے قریب حیدرآباد کے مجاہدین آزادی کے نام اور ان کو دی گئی سزاؤں کی تفصیلات درج ہیں جو (۵۷) سال (۱۸۰۶ء ۔ ۱۸۶۳ء) کی تحریک آزادی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فہرست میں درج مجاہدین آزادی کے ناموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے جو حیدرآباد کے لئے ایک قابل فخر بات ہے۔ اس دور کے حیدرآباد سے شائع ہونے والے اردو اخباروں اور رسائل کی فہرست (۱۸۵۵ء تا ۱۹۰۰ء) اور حیدرآباد کے (۱۲۵) سالہ (۱۷۶۱ء ۔ ۱۸۸۴ء) کے اہم تاریخی واقعات جو ضمیمہ میں شامل کئے گئے ہیں وہ بھی ہاشمی صاحب کے ذخیرہ کی دین ہیں۔

میرے جن احباب نے اس کتاب کی ترتیب میں مدد کی ان میں پہلا نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور دوسرا پروفیسر رشید الدین خاں کا ہے جنہوں نے نہ صرف کتاب کے مسودے کو پورے انہماک سے پڑھا، زبان کے نوک پلک سنوارے بلکہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی کے متعلقہ عہدیداروں سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی جس کی بنا پر اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اسی طرح میں اونکار پرشاد، بی۔ نرسنگ راؤ اور مرزا حیدر حسین کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مسودے میں پائے گئے فرو گذاشت کی اصلاح کی، حذف و اضافہ کیا اور اس طرح کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں میری مدد کی۔ میں جناب مرزا ریاست علی بیگ (ٹائپسٹ اردو آرٹس کالج) کا بھی

مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب کے پورے مسودے کو ٹائپ کیا۔

مجھے گوپال راؤ ایکبوٹے صاحب، سابق ریاستی وزیر تعلیم اور حیدرآباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے کیونکہ انہوں نے میری درخواست پر اس کتاب کا دیباچہ تحریر فرمایا۔

آخر میں! میں ارباب ترقی اردو بیورو کا مشکور ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب منظر عام پر نہیں آسکتی تھی

جواد رضوی

دیباچہ

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس میں مختلف زبانوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے (۸۰) کروڑ عوام بستے ہیں۔ ایسے ملک کی ایک خاص دور سے متعلق جدوجہد آزادی کی تاریخ لکھنا اور وہ بھی ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء کے دوران ریاست حیدرآباد میں چلائی گئی تحریک سے متعلق قلم اٹھانا بڑے دل وگردے کا کام اور جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے میری نظر سے کوئی ایسی مبسوط کتاب نہیں گزری جس میں آزادی کی قومی تحریک کے ایک مخصوص زمانہ کا احاطہ کیا گیا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کی قومی جدوجہد آزادی کے تعلق سے مختلف زبانوں میں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے دوران اس موضوع پر سارے ہندوستان میں مختلف زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ آسانی سے دستیاب نہیں۔

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دور ہے۔ اسی صدی کے دوران انگریزوں نے ہندوستانی عوام کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا دیا حالانکہ وہ مغل بادشاہوں کی اجازت سے یہاں تجارت اور کاروبار کرنے کی غرض سے آئے تھے۔

اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ملک میں جو غیر یقینی حالات پیدا ہو گئے تھے ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر مغل بادشاہوں کے مقرر کردہ بعض صوبہ داروں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان بگڑتے ہوئے حالات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے چالاک اور مکار عہدہ داروں نے مثلاً کلائیو اور وارن ہسٹنگس نے ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر (۱۷۵۷ء) میں انگریزوں نے اپنے سامراجی اقتدار کی بنیاد رکھی۔ اسی زمانہ میں ملک کے مختلف حصوں میں سماجی اور تہذیبی اصلاحات کے لئے کئی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ اسی دور میں چوٹی کے کئی لیڈروں نے نہ صرف

سماجی اصلاح بلکہ سیاسی تحریکوں کی بھی رہنمائی کی۔ ان میں قابل ذکر مادھوگوبند رانا ڈے، گوکھلے اور تلک تھے۔ ان لیڈروں نے بار بار پڑنے والے قحطوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ سے متاثرہ عوام کے مسائل سے گہری دلچسپی لی، ان کے شکایات کی خوب تشہیر کی اور ان کی یکسوئی کا مطالبہ کیا۔

۱۸۱۸ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں ان سے ملک بھر میں ایک ہل چل پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر مرہٹی بولنے والے علاقوں میں کئی بغاوتیں ہوئیں جیسے بیڑ، امبڑ، ناندیڑ، اورنگ آباد اور مومن آباد اسی طرح کنڑ علاقوں گلبرگہ اور رائچور میں بھی عوامی شورشیں ہوئیں۔ اس کے علاوہ سماج کے کچلے ہوئے اور غریب طبقے کے عوام نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا مثلاً ہٹ کر، بھیل، مہار، دامُوجی، مانگ، باباوی، نائک اور آدی واسی وغیرہ۔ مومن آباد (۱۸۲۷ء) میں اور اورنگ آباد (۱۸۵۱ء) میں مقیم کچھ فوجیوں نے بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کئی ممتاز شخصیتوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔

پانچویں نظام کے بھائی مبارز الدولہ نے ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۰ء تک وہابی تحریک کی رہنمائی کی۔ اسی زمانہ میں روہیلوں اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو زریڈنسی پر حملہ کیا۔ طرہ باز خاں قتل کر دیئے گئے اور مولوی علاؤالدین کو گرفتار کر لیا گیا۔

شورا پور کے راجہ ونکٹ اپا، نرگھنڈ کے راجہ رنگ راؤ پاگے، واسدیو بلونت پھڈکے، بال کرشنا ہری شانے کر، بابا صاحب عرف راؤ صاحب کی بغاوتیں کافی مشہور ہیں۔ آنند لکشمن کنھارے نے ناسک میں جیک سن پر گولی چلا دی جس کی پاداش میں کنھارے، دیش پانڈے اور کردے کو پھانسی دے دی گئی۔ ناگپور کے اپا صاحب بھونسلے بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے ایک بڑی بغاوت کی رہنمائی کی تھی۔ یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ناگپور، ستارا، کولہاپور اور ساونت واڑی میں پیشواؤں کے اہم عہدہ داروں کو معزول کر دیا گیا اور مرہٹہ سلطنتوں کے پیروؤں نے بھی چند بغاوتوں میں حصہ لیا۔

ان تمام بغاوتوں کو پوری طاقت سے کچل دیا گیا کیونکہ باغیوں کی تعداد محدود

تھی اور وہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ منظم نہ تھے۔ ان کا کوئی لیڈر نہ تھا۔ ان کے پاس لڑنے کے لئے پرانے اور فرسودہ ہتھیار تھے۔ اس کے برخلاف انگریزوں کے پاس بڑی فوج تھی، عصری ہتھیار اور گولہ بارود کا ذخیرہ تھا اور وہ پوری طرح منظم تھے۔ یہ بات اہم نہیں کہ ہر مرتبہ عوامی بغاوتوں کو کچل دیا گیا بلکہ بڑی اہمیت کی حامل یہ بات ہے کہ انگریز حکومت کے خلاف کئی مرتبہ اور اہم مسائل پر سماج کے مختلف طبقات نے بغاوتوں کو جاری رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت صحیح معنوں میں آزادی کی پہلی لڑائی تھی۔ اس عظیم جدوجہد کے رہنماؤں میں نانا صاحب پیشوا، راؤ صاحب پیشوا، جھانسی کی رانی، بہادر شاہ ظفر، تانیتا ٹوپے، عظیم اللہ خاں وغیرہ تھے۔ لیکن سندھیا، ہول کر اور گائیکواڈ کے راجوں نے اپنے کو اس سے الگ رکھا۔

اس جدوجہد کا زور عام طور پر شمالی ہند کے علاقوں تک محدود تھا، جنوبی ہند میں اس کا کوئی خاص ردعمل نظر نہیں آیا سوائے اس کے کہ ریاست حیدرآباد کے کچھ حصوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کا اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے اور بعد نہ صرف شمالی اور جنوبی ہند کے علاقوں میں بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں چھوٹی بڑی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

سید محمد جواد رضوی نے، جو خود ایک مجاہد آزادی ہیں، یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے۔ اردو زبان میں اس اہم موضوع پر ایسی مبسوط کتاب شاید ہی آپ کی نظروں سے گزری ہوگی۔ اس کتاب میں مصنف نے ایک سو سال (۱۸۰۰ء۔۱۹۰۰ء) کے درمیانی زمانہ میں جو مختلف النوع بغاوتیں ہوئیں ان کا انتہائی دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں ۱۸۰۰ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیانی زمانہ میں ہونے والی بغاوتوں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں ان تمام بغاوتوں کو پیش کیا گیا جو بعد کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئیں۔ ہر حصہ کی ذیلی تقسیم کی گئی ہے اور ان میں اہم بغاوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کچھ مفید اور کارآمد ضمیمے شامل کئے گئے ہیں۔

یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جنوبی ہند میں آزادی کی تحریک کے تعلق سے جو تھوڑا بہت لٹریچر موجود ہے اس میں یہ کتاب ایک ٹھوس اور قابل قدر اضافہ ہے اور اردو زبان میں اس نوعیت کی کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

مجھے یقین ہے کہ اس اہم اور معلوماتی کتاب کو قارئین پسند فرمائیں گے اور ہر خانگی اور عام کتب خانوں میں اس کتاب کو اپنا مستحقہ مقام ملنا چاہیئے۔

گوپال راؤ ایکبوٹے

ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی

ابتدائی دور

۱۸۰۰ء — ۱۹۰۰ء

تمہید اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا کے ساتھ ہی سامراجی قوتوں نے جنوبی ہند میں اپنی ناپاک ریشہ دوانیوں کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فروری ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ملک کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ اب بیرونی سامراجی طاقتوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ صوبوں کے گورنر خود مختار ہونے لگے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۵۷ء کے بعد سے ملک گیری کی پالیسی پر شدت سے عمل کرنا شروع کر دیا اور ۱۸۰۰ء کے پہلے دھے تک تقریباً تمام ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

ان حالات میں مغلیہ سلطنت کی جانب سے ۱۷۱۳ء میں نظام الملک آصف جاہ اول (۱۷۲۴ء — ۱۷۴۸ء) کو پہلی بار دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ لیکن دو سال بعد انہیں واپس دہلی بلا لیا گیا اور ان کی جگہ مبارز خاں کو صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ نظام الملک نے مبارز خاں کے خلاف جنگ کی اور اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد نظام الملک کو جون ۱۷۲۵ء میں دوبارہ دکن کا صوبہ دار بنایا گیا۔ اسی دوران مغلیہ سلطنت کے بڑھتے ہوئے انتشار سے فائدہ اٹھا کر نظام الملک نے ۱۷۲۴ء میں ایک آزاد مملکت کا اعلان کر دیا اور اس طرح آصف جاہی خاندان کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس زمانہ میں دکن کے تحت چھ (۶) صوبے، خاندیس، اورنگ آباد، بیدر، برار، بیجاپور اور گولکنڈہ (حیدرآباد) تھے۔ اور نظام الملک کو ان صوبوں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مغلیہ سلطنت کی جانب سے ارکاٹ، کرنول، راج مندری اور سری کاکولم کے حکمرانوں پر کنٹرول رکھنے کا انہیں مجاز گردانا گیا تھا۔ چند

سمستانوں مثلاً ونپرتی، گدوال، شورا پور، جٹ پرول، انناگنڈی اور امرچنتا کو بھی آصف جاہی سلطنت سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ لیکن آصف جاہ کا ان علاقوں پر کنٹرول کمزور اور برائے نام تھا۔[1]

آصف جاہی سلطنت کی چند اہم خصوصیات

مغلوں نے آصف جاہ کو دکن کا صوبہ دار تو بنا دیا تھا لیکن ان پر کچھ پابندیاں بھی عائد کی تھیں تاکہ اقتدار کا ناجائز استعمال نہ ہو اور اعتدال و توازن باقی رہے۔ لیکن جب آصف جاہ نے خودمختاری کا اعلان کیا تو یہ تمام پابندیاں ختم ہو گئیں اور وہ مشرقی روایات کے مطابق ایک طاقت ور بادشاہ بن گئے جن کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔[2]

(۱) اقتدار صرف ایک شخص۔ بادشاہ۔ میں مرکوز تھا جس پر کسی قسم کی پابندی یا نوکیبل نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

(۲) بادشاہت کو آبائی بنا دیا گیا اور پہلے نظام کے خطاب آصف جاہ نظام الملک کو بھی موروثی حیثیت دے دی گئی۔

اس کے برخلاف دوسری ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے خطاب۔ عام طور پر مہاراجہ اور نواب ہوتے تھے یا پھر انہیں خاندان کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

(۳) آصف جاہ اول نے اپنا دیوان خود ہی نامزد کیا تھا اور اس کی اجازت مغل شہنشاہ سے حاصل نہیں کی تھی۔

(۴) انتظامی امور کی نگرانی دیوان کی ذمہ داری تھی اور عدلیہ کا کام قاضی کے سپرد تھا۔

حیدرآباد کا جاگیرداری نظام مغلوں کے جاگیرداری نظام سے تھوڑا مختلف تھا۔ یہاں کے جاگیرداروں کو یوں تو اپنی جاگیر کی زمینات پر ملکیت کے حقوق حاصل نہ تھے لیکن انہیں محاصل وصول کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ عملاً یہ جاگیریں موروثی بنا دی گئی تھیں تاکہ فوجی عہدہ داروں اور نوابوں کو خوش رکھا جائے۔ پوری ریاست ایک مربوط قلمرو کی نوعیت کی نہ تھی جس پر ایک مرکزی نظم و نسق کی عمل داری ہو بلکہ وہ کئی حصوں میں بٹی ہوئی تھی مثلاً:

---

[1] Bawa, V. K. the Nizams between Moghals and British

[2] Ibid

(۱) خالصہ یا دیوانی کا علاقہ جو دیوان کے زیر انتظام تھا (جملہ رقبہ کا ۶۰ فیصد)
(۲) پائیگاہ (یا خانگی فوج) تیغ جنگ کے تحت تھی۔ جسکا مقصد منصب داروں اور فوجی کمانڈروں پر کنٹرول رکھنا تھا۔
(۳) صرف خاص۔ بادشاہ کے خاندانی اخراجات کے لئے مختص کی گئی تھی (جملہ رقبہ کا ۱۰ فیصد)
(۴) جاگیریں۔ (جملہ رقبہ کا ۳۰ فیصد)
(۵) سمستان۔ ان میں سے بعض سمستان فوجی خدمات کے صلے میں اور بعض سیول خدمات کے لئے عطا کئے گئے تھے (مثلاً گدوال، ونپرتی وغیرہ) خالصہ، پائیگاہ، صرف خاص، جاگیریں اور سمستان کسی ایک علاقہ میں مرکوز نہیں تھے بلکہ مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

ریاست کے سرکاری افسروں کو عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔
(۱) ایسے عہدہ دار جن کی رسائی راست دربار تک تھی۔ یہ دلّی دربار کی روایات تھیں جو انہیں ورثہ میں ملی تھیں۔
(۲) سیول افسر جیسے دیوان، پیش کار، ریکار پیر، قاضی، کوتوال اور فوجی عہدہ دار جس میں منصب دار، پائیگاہ کے عہدہ دار اور جمعدار بھی شامل تھے۔[1]

آصف جاہی سلطنت کے علاوہ جنوبی ہند میں میسور کی ریاست اور مرہٹوں کی بھی حکومت تھی۔ میسور کے بادشاہ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے (۱۷۶۷ء - ۱۷۹۹ء) کی درمیانی مدّت میں انگریزوں کے خلاف چار مرتبہ نبرد آزمائی کی۔ پہلی دو لڑائیوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ تیسری اور چوتھی لڑائیاں فیصلہ کن رہیں اور ٹیپو سلطان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ آخری لڑائی میں ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا گیا اور ریاست میسور کے علاقوں کو کمپنی سرکار اور نظام نے آپس میں تقسیم کر لیا اور ایک پرانے شاہی خاندان کے ہندو راجکمار کو کمپنی سرکار کا پٹھو تھا گدّی پر بٹھا دیا۔

اسی زمانہ میں مرہٹہ پیشواؤں اور کمپنی سرکار کے درمیان (۱۷۵۵ء - ۱۸۱۸ء) میں چار جنگیں ہوئیں لیکن پیشواؤں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور آخرکار ۱۸۱۸ء میں

---

[1] Bawa, V.K. the Nizams between Moghals and British P. (23)

فتح کئے ہوئے علاقوں کو ملاکر بمبئی پریسیڈنسی کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ کمپنی سرکار کے خلاف میسور اور مرہٹوں کی اہم لڑائیوں میں نظام حکومت نے ہمیشہ کمپنی سرکار کا ساتھ دیا۔ اپنی فوجیں بھیجیں اور اس طرح جنوبی ہند میں کمپنی سرکار کے اقتدار کو مستحکم کرنے میں ممکنہ مدد کی۔

آصف جاہ اول کے انتقال (۱۷۴۸ء) کے بعد دکن میں مختلف سامراجی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دس سال (۱۷۵۸ء) تک ریاست حیدرآباد میں فرانسیسی سامراج کا دور دورہ رہا۔ نظام نے اپنی فوجوں کی تربیت کے لئے کافی عرصہ تک فرانسیسی کمانڈروں کو مقرر کیا تھا۔ جن میں موسیو ریمان کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جب نظام کے ایک لڑکے علی جاہ نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کردی تو موسیو ریمان کے ذریعہ اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ صلابت جنگ کے دور (۱۷۵۱ء - ۱۷۶۲ء) میں تو ایک فرانسیسی فوجی کمانڈر بیوسی ریاست کا عملاً دیوان بن بیٹھا۔ کیونکہ صلابت جنگ یہ محسوس کرتے تھے کہ فرانسیسیوں کی مدد کے بغیر وہ اپنی حکومت دکن میں قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاکر فرانسیسیوں نے حیدرآباد میں اپنے قدم جمانے کے بعد وہ نہ صرف دکن کے دوسرے علاقوں پر بلکہ سارے ہندوستان پر اپنے اقتدار کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور عزائم کو اہل دکن ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے اور انہیں یہ قطعی پسند نہ تھا کہ ان کا حکمران ایک فرانسیسی جنرل کی کٹھ پتلی بن جائے۔ اس دوران حالات میں اچانک یہ تبدیلی آئی کہ ۱۷۵۹ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو مدراس سے بے دخل کردیا اور اس کے بعد کمپنی سرکار اور نظام کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے "شمالی سرکار" (Northern Circar) کے کچھ علاقے کمپنی سرکار کے حوالے کرنا پڑا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر انگریزوں کو ریاست میں وہی اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے فرانسیسیوں کو حاصل تھا۔[1] اس طرح فرانسیسیوں کا جو اثر و رسوخ آصف جاہ اوّل کی وفات کے بعد سے شروع ہوا تھا وہ ۶۲ - ۱۷۶۱ء میں ختم ہوگیا اور نظام علی خاں نے اپنے بڑے بھائی صلابت جنگ کو تخت سے اتار کر انہیں قید کردیا اور

---

[1] Basu, V. K. The Nizams between Moghals and British P. (11)

اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور اسی کے ساتھ انگریز سامراجیوں کا عمل در آمد شروع ہو گیا۔
فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہر حیدر آباد میں فرانسیسی اور دوسرے یوروپی باشندوں کی ایک چھوٹی کالونی بن گئی تھی یہاں کے چوٹی کے جاگیرداروں اور نوابوں کا فرانسیسیوں اور دوسرے یوروپی باشندوں سے میل ملاپ اتنا بڑھتا گیا کہ ان پر مغربی طرز زندگی اور رہن سہن کے گہرے اثرات پڑنے لگے۔ شہر حیدر آباد میں موسی رام باغ، ترپ بازار، میسرم اور گن فونڈری فرانسیسی اقتدار کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا معاہدہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایلچی مسٹر ہالینڈ کو آصف جاہ کے دربار میں ۱۷۷۹ء میں بھیجا گیا۔ اور اٹھارہویں صدی کے ختم تک ریاست حیدر آباد پر کمپنی سرکار کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس کے بعد کمپنی نے اپنے ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر دیئے۔
۱۷۵۹ء سے ۱۸۵۳ء کی درمیانی مدت (تقریباً سو سال) میں کمپنی سرکار نے ریاست کے حکمرانوں سے ۹، ۱۰ معاہدے کئے اور ہر معاہدہ کے نتیجہ کے طور پر ریاست کا کوئی نہ کوئی علاقہ کمپنی سرکار کے قبضہ میں چلا گیا۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں سرکار کے علاقے ایلورو، مصطفےٰ نگر، راج مندری، سری کاکولم۔ ۱۷۸۸ء میں گنٹور اور ۱۸۰۰ء میں کڑپہ، کرنول، اننت پور اور بلاری کے علاقے ریاست کی دسترس سے نکل گئے۔[1]

۱۸۰۰ء میں بہت ہی تباہ کن عہد نامہ معاونت طے پایا جس کی رو سے:

(۱) دونوں سلطنتوں نے یہ معاہدہ کیا کہ اگر تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ آور ہو گی تو دونوں مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

(۲) انگریز اپنے علاقوں کی طرح نظام کے قلمرو کی بھی حفاظت کریں گے۔ جس کے لئے سابقہ امدادی فوج میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ اس فوج کے مصارف کی ادائی کے لئے نظام نے وہ تمام رائل سیما کے علاقے کمپنی سرکار کے حوالے کر دیئے جو نظام کو میسور کی تیسری اور چوتھی جنگ میں دیئے گئے تھے۔ اس لئے انہیں آج بھی (Ceded Districts) کہا جاتا ہے۔

---

[1] Regani, Sarojini, Highlights of the freedom movement P. (4)

(۳) کمپنی کی رضامندی کے بغیر کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کے تعلقات نہیں رکھیں گے۔
(۴) کمپنی سرکار حیدر آباد کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ ہوگی (اس پر صرف چند سالوں تک عمل کیا گیا)
(۵) دوسری طاقتوں سے نظام کی کوئی نزاع ہونے کی صورت میں کمپنی کو ثالث کی حیثیت سے قطعی فیصلہ کا اختیار ہوگا۔ اس معاہدہ کے بعد حیدر آباد کی خارجی آزادی پر ایک گہری اور آخری ضرب لگادی گئی اور ریاست کی نام نہاد خود مختاری بالکل ختم کردی گئی[1] اس نام نہاد اندرونی آزادی کا یہ حال تھا کہ سکندر جاہ کی جانشینی ۱۸۰۳ء سے پہلے لارڈ ولزلی نے ان سے رزیڈنٹ کے ذریعہ یہ بات منوالی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر کو قبول کریں گے اور اس پر آمادگی کے بعد مسند نشینی انجام پائی اور آئندہ کے لئے یہ روایت بن گئی کہ صوبہ دار دکن (نظام) کی جانشینی کا مسئلہ برٹش سرکار کے صوابدید کے بموجب طے پائے گا۔ چار سال بعد یعنی ۱۸۰۴ء میں دو ہزار سواروں کی حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج بنائی گئی جو بالکلیہ رزیڈنٹ کے تحت کردی گئی اور نظام سرکار کو ۴۰ لاکھ سالانہ کے اخراجات بھی برداشت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پڑوسی ریاستوں۔ بھونسلے اور سندھیا نے معاہدہ معاونت قبول کرنے سے انکار کیا تو ان کے خلاف جنرل ولزلی کو جنگ کرنا پڑی اور نظام سرکار کی فوجوں نے ولزلی کا ساتھ دیا۔

۱۸۰۵ء تک ریاست حیدر آباد اور کمپنی سرکار میں بظاہر برابر کے سفارتی تعلقات قائم تھے یعنی حیدر آباد میں رزیڈنٹ اور کلکتہ میں ایلچی متعین تھا لیکن اس سال گورنر جنرل نے ایلچی کو واپس کردیا اور سفارتی تعلقات ختم کردیئے گئے اور رزیڈنٹ کو مکمل اختیارات دے دیئے گئے۔ ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے دور میں کمپنی سرکار سے ایک اور مضرت رساں معاہدہ ۱۸۵۳ء میں طے پایا جس کی رو سے برار، عثمان آباد اور رائچور کے اضلاع کو کمپنی کے حوالے کرنا پڑا تاکہ ان اضلاع کی آمدنی سے کنٹنجنٹ فوج کے اخراجات کی پابجائی کی جاسکے۔ برابر کو کمپنی سرکار کے حوالے کئے جانے کو حیدر آباد کے تمام طبقات نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور کہا جاتا ہے کہ دیوان سلطنت سراج الملک کا اسی سال انتقال

---

[1] The Hydrabad State Committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol I (1000 - 105) PP2-9.

اس معاہدہ کے صدمہ کی وجہ سے ہوا۔ ان تمام شرمناک معاہدوں کو آصف جاہی حکمرانوں کو بلا چون و چرا مان لینا پڑا کیونکہ ان کے تخت و تاج، حکمرانی اور جاگیردارانہ سماج کے بقاء کا انحصار انگریزوں اور ان کی فوجوں کی پشت پناہی پر تھا۔

کمپنی سرکار نے ان سیاسی اور فوجی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ ریاست میں اپنا موقف مضبوط کرنے اور اپنی سماجی بنیادوں کو وسعت دینے کے لئے دوسرے طریقے کار بھی اختیار کرنا شروع کئے۔ ۱۸۰۶ء میں رزیڈنسی کی مستقل عمارت تعمیر کی گئی۔ جہاں یوروپین، مشرقی ایشیا کے باشندوں اور مقامی کرسچنوں کی ایک چھوٹی سی کالونی بنادی گئی۔ اس سے پہلے ۱۸۰۵ء میں سکندرآباد میں بھی ان ہی لوگوں کی ایک اور کالونی تیار ہوگئی۔ ان ہی علاقوں میں عیسائی مشنریوں کا قیام عمل میں آیا۔ جنہوں نے عیسائی مذہب کے پرچار کا کام بڑے پیمانے پر شروع کردیا۔ انگریزی زبان کی ترویج کے لئے ۱۸۳۴ء میں شہر حیدرآباد میں گرامر اسکول قائم کیا گیا اور ۵ سال بعد ایک میڈیکل اسکول بھی کھولا گیا۔ رومن کیتھولک مشنری کی جانب سے ۱۸۵۵ء میں ایک اور انگریزی اسکول شروع کیا گیا جو بعد میں آل سینٹس اسکول میں تبدیل ہوگیا۔ انگریزوں کے ان مثبت تعلیمی اور سماجی اقدامات کے اثرات ریاست کے چند جاگیرداروں اور امراء پر پڑنا شروع ہوئے۔ ان امراء میں سب سے پیش پیش پائیگاہ کے امیر شمس الامراء تھے۔ انہوں نے نہ صرف رہن سہن میں مغربی طرز معاشرت اختیار کی بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ٹیکنیکل مضامین کی ترویج کی جائے اور ان پر کتابیں شائع کی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے جہاں نما پیلیس میں ۱۸۳۴ء میں ایک دارالترجمہ قائم کیا اور کتابوں کی اشاعت کے لئے سنگی چھاپہ خانہ (لیتھو پریس) بھی شروع کیا۔ دارالترجمہ کی جانب سے دینیات، ریاضی، طبیعات، کیمیا، علم نجوم اور طب وغیرہ کی کوئی پچاس کتابیں شائع کی گئیں۔[1]

غرض یہ کہ کمپنی سرکار اور آصف جاہی حکمرانوں کے درمیان طے شدہ افسوس ناک معاہدوں اور ان پر عمل آوری کے نتیجہ کے طور پر ریاست کا رقبہ سکڑتا گیا اور پھر ان کی

---

[1] The Hydrabad State committee, the freedom struggle in Hydrabad, Vol I, (1850-1859) P. 21.

بڑھتی ہوئی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ریاست کے امراء کے ایک طبقے، فوجیوں اور پڑھے لکھے لوگوں میں کمپنی سرکار کے خلاف بغاوت اور نفرت کے جذبات ابھرنا شروع ہوئے لیکن انہیں ان کے اظہار کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ انتہائی تناؤ کے ان حالات میں ویلور چھاؤنی کے بہادر سپاہیوں نے ۱۸۰۶ء میں بغاوت کر دی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس بغاوت کے پیچھے ٹیپو سلطان کے فرزندوں کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کے لڑکے پرنس معزالدین کو اس الزام میں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ جہاں ان کا ۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا اور اس بناء پر ان کے خاندان کو کلکتہ کے ایک مضافات میں (جو اب ٹالی گنج کہلاتا ہے) ۱۸۰۶ء میں منتقل کر دیا گیا۔ ویلور چھاؤنی کی اس بغاوت نے ناراض امراء، بعض اعلیٰ عہدیداروں اور دوسری چھاؤنیوں کے سپاہیوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا کیا اور ان کی ہمت بڑھائی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ریاست کے چوٹی کے امراء نواب نور الامراء، راجہ راؤ رمبا، عبال کر اور راجہ مہی پت رام نے ریاست کے داخلی معاملات میں رزیڈنٹ کی بڑھتی ہوئی مداخلت کے خلاف بغاوتیں کیں۔ گو ان کی بغاوتیں بڑی حد تک شخصی نوعیت کی تھیں اور ان کے پیچھے کچھ انفرادی مفادات ومناقشات بھی کارفرما تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بغاوتیں انگریز دشمن تھیں اور ان کی وجہ سے آئندہ اور زیادہ منظم اور بامقصد بغاوتوں کا راستہ کھل گیا۔ اس دور کی اہم ترین بغاوت مبارز الدولہ کی بغاوت تھی جو ۱۸۱۵ء سے شروع ہوئی اور وقفہ وقفہ سے (۲۴) سال ۱۸۳۹ء تک جاری رہی۔ جس کی پاداش میں انہیں تین مرتبہ نظر بند رکھا گیا جس کی جملہ مدت (۲۲) سال تھی۔

ریاست حیدرآباد کے امراء کی مذکورہ بالا بغاوتوں کے بعد ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۱ء کی درمیانی مدت میں ریاست کے مختلف اضلاع میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں قابل ذکر اورنگ آباد (۱۸۱۹ء)، ناندیڑ (۱۸۱۹ء)، کیل (۱۸۱۹ء)، بیدر (۱۸۲۰ء) عادل آباد (۱۸۲۲ء)، مومن آباد (۱۸۲۷ء) اور رائچور (۱۸۴۱ء) کی ہیں۔ یہاں اجمالاً اس امر سے واقف ہونا ضروری ہے کہ آخر وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے ریاست میں افراتفری پھیلی اور سیاسی بے چینی پیدا ہوئی جنہوں نے بغاوتوں کو جنم دیا۔ سیاسی حیثیت سے آصف جاہی حکمرانوں کی خودمختاری کو پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔

معاشی حیثیت سے ریاست کا تقریباً دیوالیہ نکل چکا تھا کیونکہ حکومت وقت نے

روہیلوں اور عربوں سے کثیر رقم قرض لے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ پامر اینڈ کمپنی (۱۸۱۱ء) نے معاشی حالت کو اور زیادہ ابتر بنانے میں تباہ کن رول ادا کیا اور چند و لعل کی فضول خرچی اور بد انتظامی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت نظم و نسق کے نام کی کوئی چیز باقی نہ تھی۔ ان حالات میں میر تراب علی خاں سر سالار جنگ کو ۱۸۵۳ء میں ریاست کا دیوان بنایا گیا۔ چنانچہ انہوں نے نظم و نسق کے اصلاحات کی ایک جامع اسکیم مرتب کی تھی اور وہ ان جدید اصلاحات کو نافذ کرنے والے ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت پھوٹ پڑی (پامر اینڈ کمپنی نے ریاست کا دیوالیہ نکالنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی اور سر سالار جنگ نے نظم و نسق کے اصلاحات کی جو اسکیم بنائی تھی اس پر تفصیل سے آئندہ بحث کی جائے گی)۔

شمالی ہند کی اکثر دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے بعض علاقوں میں ۱۸۵۷ء میں فوجی بغاوت بڑے پیمانے پر شروع ہوئی اور ابتدائی کچھ دنوں میں کمپنی سرکار کی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب باغی سپاہیوں کی کامیابی کی خبریں حیدر آباد پہنچیں تو یہاں کے مجاہدین کے حوصلے بلند ہوئے اور ان میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو مجاہدین آزادی نے مولوی علاء الدین اور طرہ باز خاں کی سرکردگی میں برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے (۲۸) سال بعد ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر حیدر آباد میں بھی بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ اس لہر کو تحریک کا روپ دینے والوں میں سب سے آگے اگھور ناتھ چٹوپادھیا (مسز سروجنی نائیڈو کے والد) اور ان کے دیرینہ رفیق کار ملا عبد القیوم تھے۔ وہ نہ صرف کانگریس میں شریک ہوئے بلکہ انہوں نے قوم پرستی کے خیالات کو تقویت دینے کے لئے ایک تنظیم "انجمن اخوان الصفا" شروع کی۔ لگ بھگ اس زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جس کو عام طور پر "جامدہ ریلوے اسکیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو آگے بڑھانے کے لئے ایک انجمن بنائی گئی، جس کے رہنما ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیا اور ملا عبد القیوم تھے اور اس مسئلہ پر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی پاداش میں ان دونوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ اس زمانے کے اہم سیاسی و سماجی کارکن سوم سندرم مدلیار، رام چندر اور محب حسین بھی تھے۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۰ء کا درمیانی زمانہ عام طور پر پر امن سیاسی، سماجی اور تعلیمی بیداری

اور ان مقاصد کے حصول کے لئے مختلف نوعیت کے تنظیموں اور اداروں کے قیام کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کی سب سے اہم تنظیم آریہ سماج ہے۔ جس کا قیام ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اور جس نے حیدرآباد میں آنے والے (۵۰) سالہ مدت میں بہت ہی نمایاں سماجی اور سیاسی رول ادا کیا۔

البتہ اس پرامن فضا میں اس دہے کے آخری دو تین سالوں میں بال کرشنا شانے کر کی گرفتاری (۱۸۹۷ء) اور باباصاحب کی ضلع بیڑ میں بغاوت (۱۸۹۸ء) نے ہل چل پیدا کردی۔ ایک اور بات قابل ذکر یہ تھی کہ اس زمانے میں تیزی سے بڑھتی ہوئی سیاسی اور سماجی بیداری سے خائف ہوکر حکومت نے اخبارات پر پابندیاں عائد کرنا شروع کردی تھیں۔

غرض یہ کہ اس کتاب میں اس دور کی اہم تحریکات اور واقعات کو نمایاں طور پر پیش کرنے اور ان کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔

پہلا دور

۱۸۰۰ء — ۱۸۱۵ء

ریاست حیدر آباد کی اٹھارہویں صدی کے آخری پانچ دہے (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۰ء) بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ کیونکہ تقریباً ان پچاس برسوں میں آصف جاہی حکمرانوں اور کمپنی سرکار کے درمیان جو معاہدے طے پائے، جن کا تفصیلی ذکر تمہید میں کیا جا چکا ہے، ان کی بدولت ریاست کا رقبہ مسلسل سکڑتا گیا' شاہی اختیارات کو تدریج سلب کیا جاتا رہا' ریاستی معاملات میں رزیڈنٹ کی مداخلت میں اضافہ ہوتا رہا اور بالآخر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ معاونت نے تو حیدر آباد کی ایک آزاد سیاسی وحدت کو بالکل ختم کر دیا اور وہ عملاً کمپنی سرکار کی ایک تابعدار ریاست بنا دی گئی جہاں کمپنی سرکار نے بڑی تعداد میں اپنی فوج مستقل طور پر متعین کر دی۔ اس کے علاوہ ریاست کے امراء کو اس کا بھی احساس تھا کہ برطانوی سامراجیوں نے اپنی فوجی کارروائیوں سے مغلیہ سلطنت کو تقریباً ختم کر دیا' دیسی ریاستوں کا یکے بعد دیگرے گلا گھوٹنے کا سلسلہ جاری تھا صرف یہی نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے خلاف انگریز سامراجیوں کی ریشہ دوانیاں نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ یہ وہ حالات و محرکات تھے جو ریاست کے امراء کے ایک طبقہ اور باشعور عوام میں کمپنی سرکار کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ امراء کے ذاتی مفادات اور آپسی رقابتوں کا ٹکراؤ بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں ۱۸۰۶ء میں سکندر آباد کی چھاؤنی میں مقیم سب سیڈری فورس میں بغاوت ہو گئی۔ اس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ دیسی سپاہیوں کی پگڑی کی شکل تبدیل کر دی گئی تھی اور ان کی یونیفارم کا رنگ بھی بدل دیا گیا تھا۔ ان اچانک تبدیلیوں نے سپاہیوں کو برہم کر دیا اور انہیں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کمپنی سرکار پگڑی اور یونیفارم کی تبدیلی کے بعد تمام ہندوستانیوں کے مذہب کو بدل کر انہیں عیسائی بنا دے گی۔ شک و شبہ کی اس چنگاری نے بغاوت کی آگ کو بھڑکا دیا۔ ان باغی سپاہیوں نے نواب نور الامراء اور راجہ راؤ رمبا سے ربط پیدا کیا۔ ان امراء نے باغی

سپاہیوں کی ہمت افزائی کی اور نور الامراء نے تو انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ ان امراء کے اس سنگین اقدام کو کمپنی سرکار بھلا کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔

یہاں ان بغاوتوں کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کرنے ضروری ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں جاگیرداری اور زمینداری نظام باقی ضرور تھا لیکن اب وہ مائل بہ زوال تھا' یہاں کے قدیم زرعی اور معاشی نظام کو درہم برہم کر دیا گیا تھا' تباہ حال کسان' فوجی وردی پہن کر سپاہی بن چکا تھا' امراء سلطنت امور مملکت میں کمپنی سرکار کی بڑھتی ہوئی مداخلتوں سے نالاں و ناراض تھے اور سامراجی تسلط نہ صرف شروع ہو چکا تھا بلکہ اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی ان حالات میں سامراج دشمن بغاوتوں کا پھوٹ پڑنا ایک فطری امر تھا۔ ان ابتدائی اور محدود بغاوتوں کو ظاہر ہے کہ جدید تاریخی نقطۂ نظر کے مطابق جدوجہد آزادی کا ایک حصّہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں صنعتی معیشت کی شروعات نہیں ہوئی تھی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے ہندوستانی قومیت اور آزادی کا واضح تصور ابھی پوری طرح ابھر کر نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود ان محدود بغاوتوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان بغاوتوں نے مستقبل میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے لئے تخم ریزی کا کام انجام دیا اور ان میں ایک معنویت پیدا کی۔ اس لئے ان کے اہم رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ وہ حالات تھے جن کی بناء پر ریاست کے بعض امراء بلکہ شاہی خاندان کے شہزادوں نے بھی کمپنی سرکار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جن کا ذکر ہم کرنے جا رہے ہیں۔

عالی جاہ کی بغاوت ۱۷۹۵ء[1]

عالی جاہ' نواب نظام علی خاں آصف جاہ دوم (۱۷۶۲ء۔۱۸۰۳ء) کے بڑے لڑکے تھے۔ انہوں نے ۱۷۹۵ء میں اپنے والد کے خلاف بغاوت کی جس کے محرکات و حالات یہ تھے۔ ۹۵-۱۷۹۴ء میں نظام علی خاں اور مرہٹوں کے درمیان کھڑلہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ نظام علی خاں نے پہلے کئے ہوئے معاہدہ (۱۷۶۷ء) کی بناء پر انگریزوں سے فوجی امداد کی درخواست کی لیکن انہوں نے فوجی امداد دینے سے صاف انکار کر دیا۔

---

[1] طالب' محمد سراج الدین' نظام علی خاں (حصّہ دوم)

اس جنگ میں نظام علی خاں کو شکست ہوئی جس کا انہیں بڑا صدمہ تھا۔ اپنی اس شکست سے برہم ہوکر انہوں نے انگریزوں کی فوجوں کو برطرف کر دیا اور حیدر آباد چھوڑ کر کمپنی کے علاقہ میں واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ اور دوسری طرف موسیو ریمان کے تحت فرانسیسی فوجوں میں اضافہ کا بھی حکم دیا۔ بھلا کمپنی سرکار یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ انگریز فوجیں برطرف کر دی جائیں اور پھر فرانسیسی فوجوں میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ حیدر آباد کے برٹش رزیڈنٹ ولیم کرک پیاٹرک (شوکت جنگ) نے نظام علی خاں کے ان اقدامات پر احتجاج کرتے ہوئے مراسلہ لکھا۔

اس انتشار اور پریشان کن حالات سے فائدہ اٹھا کر عالی جاہ نے بغاوت کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس بغاوت سے پہلے اندرونی طور پر ریاست کے دیوان مرشد الملک ارسطو جاہ (۱۷۸۱ء۔ ۸۴ء) کے خلاف کچھ امراء اور شاہی حلقوں میں بھی بے اطمینانی اور غصہ کے جذبات بھڑک رہے تھے اور ان لوگوں کے رہنما عالی جاہ تھے۔ ان تمام حالات سے فائدہ اٹھا کر عالی جاہ ۲۷ جون ۱۷۹۵ء کی رات کو حیدر آباد سے نکل گئے اور یہ افواہ پھیلا دی کہ مرہٹوں نے ان کا اغوا کر لیا ہے۔ اس دوران انہوں نے قابل لحاظ فوج اکٹھا کر لی اور بیدر روانہ ہوئے اور وہاں کے قلعہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس بغاوت میں ان کا ساتھ دینے والی اہم شخصیتیں سدا شیوا ریڈی، غالب جنگ، سیف جنگ بدیع الزماں ناظم جنگ تھے جنہوں نے نظام کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ ٹیپو سلطان نے بھی اپنی تائید کا یقین دلایا۔ اتنی کم مدت میں اتنی بڑی فوج جمع کرنے میں وہ اس لئے کامیاب ہو سکے کہ کھڑلہ کی لڑائی (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کے فوراً بعد نظام علی خاں نے جن فوجوں کو نکال دیا تھا ان کی ایک بڑی تعداد عالی جاہ کے ساتھ مل گئی۔

عالی جاہ کی تادیب کے لئے سدی عبداللہ خاں کی جمعیت روانہ کی گئی۔ سدا شیو ریڈی نے اچانک اس فوج پر حملہ کر دیا اور سرکاری فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ سدی عبداللہ خاں بری طرح زخمی ہوئے۔ اس کے بعد نظام علی خاں کی ایما پر عالی جاہ کی والدہ بخشی بیگم نے اپنے لڑکے کو خط لکھا کہ وہ بغاوت ختم کر دیں اور حیدر آباد واپس آجائیں۔

اس اثناء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ میر عالم کے مشورہ پر انگریز فوجوں کو بلا لیا گیا جو ۳۱ اگست ۱۷۹۵ء کو حیدر آباد پہنچ گئیں۔ یہ بھی طے پایا کہ عالی جاہ کو نکی جاگیر سے محروم کر دیا جائے۔

جب عالی جاہ بغاوت ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کی سرکوبی کے لئے میر عالم کے زیر کمان انگریز فوجوں کو مامور کیا گیا۔ اس سے پہلے نظام علی خاں نے[1] موسیو ریمان کی سرکردگی میں فرانسیسی فوجیں بھیج دی تھیں۔ ان کے علاوہ سردار الملک گھانسی میاں بھی پائیگاہ کی فوج لے کر وہاں پہنچ گئے۔

ظاہر ہے کہ عالی جاہ کے لئے اتنی کثیر اور باقاعدہ فوج کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا اس لئے وہ بیدر چھوڑ کر اورنگ آباد چلے گئے۔ انہوں نے مرہٹوں سے مدد مانگی۔ لیکن انہیں نفی میں جواب ملا اور دوسری طرف سرکاری فوجوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان مشکل حالات میں اپنے آپ کو سرکاری فوجوں کے حوالے کر دینے کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جب انہیں حیدر آباد واپس لے جایا جا رہا تھا تو اس بہادر اور غیور شہزادے نے ایک بار پھر کنج قفس میں بند ہونے کی بجائے اپنے آپ کو زندگی کے بندھنوں سے آزاد کر لیا۔ پرانے شہر میں کوٹلہ عالی جاہ کے نام سے ایک محلہ ہے غالباً اس علاقے میں عالی جاہ کی کوٹھی ہو گی جو ممکن ہے کہ کثرت استعمال سے کوٹلہ عالی جاہ کہلائے جانے لگا۔

۱۔ نواب محمد نور خاں نور الامراء

اس خاندان کا وطن مالوف پٹیالہ (پنجاب) تھا۔ ان کے والد محمد قاسم خاں پٹیالہ میں کئی قلعوں کے قلعہ دار تھے۔ جس کے تحت ایک ہزار سوار، ۵ ہزار پیدل فوج تھی۔ لیکن نور الامراء اودھ کے حکمراں آصف الدولہ بہادر کی سرپرستی سے متاثر ہو کر وہیں مقیم ہو گئے اور ان کے چچازاد بھائی غلام سید خاں ارسطو جاہ دکن آئے اور آصف جاہی سلطنت سے منسلک ہو گئے۔ ریاست کے کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ۱۷۸۱ء تا ۱۸۰۳ء تک ریاست کے دیوان رہے۔[2]

چونکہ نور الامراء نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لئے وہ اپنی آبائی جائداد

---

[1] موسیو ریمنڈ ۱۷۵۵ء کو فرانس میں پیدا ہوا۔ بہت کم عمری میں حیدر آباد آیا اور نظام کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۷۹۸ء میں بمقام حیدر آباد اس کا انتقال ہوا۔

[2] The Hydrabad State Committee, the freedom struggle in Hydrabad. Vol I (1800-1857) P.P. 23, 25, 29.

(پٹیالہ میں) اور زمینات وغیرہ کی نگرانی نہ کر سکے۔ ان کے غیاب میں مقامی سکھوں اور دوسرے عناصر نے ان کی جائداد پر قبضہ جما لیا۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ان کی جائداد کو ہڑپ کرنے میں کمپنی سرکار کے مقامی کارندوں کا بھی ہاتھ رہا ہو۔ کیونکہ اسی زمانے میں کمپنی سرکار اور اودھ کے حکمرانوں کے تعلقات بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور نور الامراء ریاست اودھ کے ایک اہم اور بااثر رکن تھے۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال (۱۷۹۷ء) کے بعد انہوں نے لکھنؤ کو خیرباد کہا اور چاہتے تھے کہ فوج کشی کر کے اپنی آبائی جائداد پر دوبارہ قبضہ کریں۔ لیکن ارسطو جاہ کے مشورہ پر انہوں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا اور وہ بھی اورنگ آباد آئے اور آصف جاہی سلطنت سے منسلک ہو گئے۔[1]

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۷۶۲ء — ۱۸۰۳ء) نے انہیں بیش بہا جواہرات اور کثیر رقم سے نوازا۔ اس کے علاوہ فوج، جاگیرات و منصب، ہفت ہزاری و نقارہ اور خطابات سلیمان یار جنگ دلاور الدولہ انوار الملک اور نور الامراء عطا کئے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد آصف جاہ ثانی کا انتقال ہو گیا اور اسی سال ارسطو جاہ نے بھی داعی اجل لبیک کہا (۱۸۰۴ء)۔ اب سوال ارسطو جاہ کے عہدہ کے لئے (دیوان سلطنت) کسی امیر کے انتخاب کا تھا۔ سکندر جاہ آصف جاہ سوم کی یہ خواہش تھی کہ یہ عہدہ راجہ مہپت رام کو دیا جائے۔ لیکن برٹش رزیڈنٹ اس کے خلاف تھے اور وہ ایک زیادہ وفادار امیر یعنی میر عالم کو اس عہدہ پر فائز کرنا چاہتے تھے اور آخر کار وہی ہوا جو رزیڈنٹ کی مرضی تھی چنانچہ میر ابوالقاسم میر عالم کو دیوان سلطنت بنایا گیا (۱۸۰۴ء — ۱۸۰۵ء)۔ اس تقرر سے دو تضادات ابھر کر آئے۔ ایک تو یہ کہ راجہ مہپت رام کو چونکہ دیوانی کے عہدہ سے محروم کر دیا گیا تھا اس لئے وہ میر عالم اور انگریز رزیڈنٹ کے خلاف ہو گئے اور دوسرے یہ کہ میر عالم اور ارسطو جاہ (مرحوم) کی بڑی پرانی دشمنی تھی۔ ان کی موت سے میر عالم کو ان کے چچازاد بھائی نور الامراء سے انتقام لینے کی سوجھی۔ اس اثنا میں ۱۸۰۶ء میں سکندر آباد چھاؤنی اور دوسرے مقامات پر سپاہیوں نے کمپنی سرکار کے خلاف بغاوت کر دی۔ نور الامراء نے ان باغی

---

[1] The Hydrabad State committee: The freedom struggle in Hydrabad vol I, (1800-1857) PP 20-22, 24-31,

سپاہیوں سے نہ صرف اظہار ہمدردی کی بلکہ انہیں پناہ بھی دی اور اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ یہ تو کمپنی سرکار کی نظر میں ناقابل معافی جرم تھا اور میر عالم کو بھی اپنی پرانی دشمنی چکا لینے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اس وقت کے برٹش رزیڈنٹ کیپٹن سینڈ ہام نے نظام اور میر عالم کو لکھا کہ وہ نور الامراء اور راجہ راؤ رمبا (جنہوں نے باغی سپاہیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا) کے خلاف فوراً سخت کارروائی کریں۔ چنانچہ نور الامراء کو ان کی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا اور بعد میں انہیں عثمان آباد کے ایک قلعہ اوکسا میں قید کر دیا گیا اور راجہ راؤ رمبا کو اپنی جاگیر میں نظر بند رکھا گیا۔ ان افسوسناک حالات میں نور الامراء کا انتقال ۱۲۳۶ھ میں ہوا۔

پرانے شہر میں نور خاں بازار یا بازار نور الامراء ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس محلہ میں ان کی ایک ڈیوڑھی تھی جو سلیمان یار جنگ کی ڈیوڑھی کہلاتی تھی اب وہاں ایک چھوٹی سی کالونی بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ بلدیہ حیدرآباد کا قدیم دفتر (جس میں مدرسہ اعزہ بھی تھا) حمام کی باؤلی اور عاشور خانہ (غالباً نعل صاحب کا) ان ہی کی ملکیت تھی۔

(۲) راجہ کھنڈے راؤ ارجن بہادر راؤ رمبا نمبال کر[1]

راجہ راؤ رمبا اور نور الامراء دونوں ہم عصر امراء تھے۔ ان کے تعلق سے انگریز رزیڈنٹ اور آصف جاہی حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ وہ ابتداء ہی سے انگریزوں اور کمپنی سرکار کے کٹر دشمن تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے کمپنی سرکار کو کسی طرح نکال باہر کیا جائے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ سزا دی گئی لیکن مختلف نوعیت کی۔

راجہ راؤ رمبا جیونت بہادر نمبال کر کا شمار حیدرآباد کے امراء عظام میں ہوتا تھا۔ اور انہیں ریاست کے گیارہ عظیم امراء میں شامل کیا جاتا تھا۔ اور امراء یا نیگاہ کے بعد ان ہی کا مقام تھا۔

راجہ راؤ رمبا بہادر کا سلسلہ نسب مہاراشٹرا کے جنگجو اور بہادر سورج بنسی چھتریہ خاندان سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان دہلی کے قریب "نمبال" نامی ایک علاقہ میں سکونت پذیر

---

[1] The Hydrabad State committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800-1857) PP 33-34, 41, 43.

تھا اور اسی مناسبت سے ان کا خاندانی نام نمبال کر ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ راجہ شنبواجی چھترپتی بھونسلے (ناگپور) کے خاندان کی ایک لڑکی نمبال کر خاندان میں بیاہی گئی تھی۔ اس طرح ان کا رشتہ ایک ایسے بہادر سپاہی گھرانے سے ہو گیا جو سامراج دشمن روایات کا حامل تھا۔[1]

راؤ رمبا خاندان کے پہلے راجہ رمبھاجی باجی راؤ کے تعلق سے "تاریخ گلزار آصفیہ" کے مصنف نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ راجہ رمبھاجی کو کسی آپسی تنازعہ کی بنا پر مغلیہ سلطنت کے ایک امیر الامراء سید حسین علی خاں بہادر (یہ شاہ عالم اوّل کا دور تھا ۱۷۰۷ء — ۱۷۱۲ء) نے انہیں شاہ جہاں آباد میں قید کر دیا تھا۔ اتفاق سے اس قید خانہ کے قریب ہی ایک امام باڑہ تھا جہاں پابندی سے اعزاداری حسین کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ رمبھاجی عزاداری سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ منّت مانگی کہ اگر وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں یا پھر انہیں جلد رہا کر دیا جائے تو وہ ہر سال ماہ محرم میں اعزاداری حسین کا اہتمام کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں دوسرے ہی دن رہا کر دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کے مطابق علم ایستادہ کیا اور ہر سال عشرہ محرم پورے اعتقاد اور اہتمام کے ساتھ منانا شروع کیا۔ ان اخراجات کی پابجائی کے لئے سالانہ بارہ سو کی رقم مختص کی گئی۔ اس طرح ہر سال محرم منانے کا سلسلہ اس خاندان میں اس صدی کے پانچویں دہے تک جاری رہا۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ آصف جاہی خاندان سے ان کا ربط کیسے پیدا ہوا۔

اس خاندان کے دوسرے راجہ، راجہ جانوجی جسونت کو آصف جاہ نظام الملک اپنے ساتھ دکن لائے اور انہیں دس ہزار سوار، تین لاکھ سالانہ کی جاگیر اور ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کیا اور ان سے دیرینہ مراسم کے پیش نظر جسونت بہادر کا خطاب بھی عطا کیا۔

اس خاندان کے جس مجاہد آزادی کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ پانچویں راجہ تھے جن کا نام راجہ کھنڈے راؤ ارجن بہادر راؤ رمبا تھا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے نہ صرف باغی سپاہیوں کی پشت پناہی کی ہے بلکہ پوشیدہ طور پر سکندر آباد کی فوجی چھاؤنی

---

[1] تاریخ خاندان راجہ راؤ رمبا جسونت بہادر نمبال کر۔

کے سپاہیوں سے باقاعدہ ربط پیدا کیا۔ اس کے علاوہ سندھیا اور ہول کر جیسے انگریز دشمن رجواڑوں سے خفیہ طور پر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان الزامات کی بنا پر راجہ چندو لعل (جو ریاست حیدر آباد کے گیارہ سال تک ۱۸۳۲ء - ۱۸۴۳ء) دیوان سلطنت تھے اور اس بنا پر حیدر آباد کو اس زمانہ میں چندو لعل کا حیدر آباد کہا جاتا تھا)۔ یہ تجویز پیش کی تھی کہ راجہ راؤ رمبا کو فوراً گرفتار کر کے قلعہ گولکنڈہ میں مقید کر دیا جائے۔ میر عالم نے جو اس وقت کے دیوان سلطنت تھے (۱۸۰۶ء - ۱۸۰۸ء) نے اس تجویز کی تائید کی اور اس تجویز کو روبہ عمل لانے کے لئے رزیڈنٹ نے یہ پلان پیش کیا کہ سکندر جاہ آصف جاہ سوم (۱۸۰۳ء - ۱۸۲۳ء) سیر کے بہانے راؤ رمبا کو اپنے ساتھ قلعہ گولکنڈہ لے جائیں اور وہیں انہیں گرفتار کر کے مقید کر دیا جائے۔ لیکن سکندر جاہ بہادر نے راجہ راؤ رمبا کے خاندان سے ریاست حیدر آباد کے دیرینہ تعلقات اور امرار سلطنت میں انہیں جو اہم اور اعلیٰ مقام حاصل تھا اس کے مدنظر مذکورہ تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ موجودہ راؤ رمبا کی جاگیر ضبط کر لی جائے یا ان کے باوقار و باعزت مقام کو کسی قسم کی گزند پہنچائی جائے۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سکندر جاہ نے یہ حکم صادر کیا کہ راجہ راؤ رمبا کو ان کی جاگیر میں نظر بند رکھا جائے۔ البتہ ان کے دوسرے ساتھیوں ڈگمبر راؤ پنڈت اور نرسنگ راؤ کو جن پر چھاؤنی کے فوجیوں سے خفیہ طور پر خط و کتابت کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا مل کھیڑ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

یہاں یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ راؤ رمبا کی دیوڑھی (جو نور خاں بازار کے قریب تھی اور اب وہاں رہائشی مکانات تعمیر ہو گئے ہیں) کے قریب کامریڈ ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۰ء میں ایک دار المطالعہ قائم کیا تھا اور اس دیوڑھی میں ایسوسی ایشن کی جانب سے کئی جلسے منعقد کئے گئے تھے جن میں شری سراج الحسن ترمذی (کانگریس لیڈر) اور قاضی عبدالغفار (ایڈیٹر پیام) کی تقاریر ہوئی تھیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس خاندان کے افراد نے مطلق العنان دور میں بھی اپنی روایتی رواداری اور حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے اس مجاہد کا انتقال ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ جب ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی شروع ہوئی تھی۔

(۳) راجہ مہی پت رام

راجہ مہی پت رام کا تعلق ایک گجراتی برہما کھتری گھرانے سے تھا۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

(۱۷۶۲ء - ۱۸۰۳ء) کے وزیر اعظم (دیوان) ارسطو جاہ کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور مختصر مدت میں ہی انہوں نے نظام علی خاں اور ان کے جانشین سکندر جاہ (۱۸۰۳ء - ۱۸۲۰ء) کی قربت اور اعتماد حاصل کر لیا۔ ریکارڈ آفس کے دستاویزات کے مطابق انہیں کئی ہزار کی شخصی جاگیر اور فوج کے اخراجات کے لئے بھی کئی ہزار کی جاگیر عطا کی گئی غرض یہ کہ وہ حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار، اعلیٰ مرتبہ اور بااثر امیر تھے۔ انہیں آصف جاہ ثانی کے پرسنل سکریٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ وہ موسیو ریماں کی فرانسیسی فوج کے ملٹری سکریٹری بھی بنائے گئے۔ جب ۱۷۶۲ء میں ریاست میں فرانسیسیوں کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا اور ان کی فوجوں کی تنظیم جدید ہوئی تو مہی پت رام کو ان کا کمانڈر بنایا گیا اور ان کی سرکردگی میں مرہٹوں کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد کی صوبہ داری اور برار کی گورنری جیسے اعلیٰ مرتبت عہدوں پر فائز ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

راجہ مہی پت رام کا کافی عرصہ تک فرانسیسیوں سے قریبی ربط رہا اس لئے وہ یوروپین حکمرانوں اور خاص طور پر انگریز سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اسی بناء پر ان کا یہ خیال تھا کہ انگریز ہندوستان کے دشمن _ اس لئے نہ صرف ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکا جانا چاہیئے بلکہ ان کا کسی طرح دیس نکالا بھی ہونا چاہیئے۔

ان حالات میں دیوان سلطنت ارسطو جاہ کا ۱۸۰۴ء میں انتقال ہوا۔ مہی پت رام کو یہ یقین تھا کہ ان کی جگہ انہیں دیوان بنایا جائے گا۔ لیکن رزیڈنٹ نے اس کی سخت مخالفت کی اور نظام پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ میر عالم کو دیوان سلطنت بنائیں۔ کیونکہ کمپنی سرکار انہیں اپنا وفادار دوست سمجھتی تھی۔ اس واقعہ نے مہی پت رام کے انگریز دشمن جذبات کو اور بھی بھڑکا دیا۔

اسی زمانے میں انگریزوں نے ایک محب وطن رجواڑے الینتونت راؤ ہولکر (ناسک) پر حملہ کر دیا اور نظام سے خواہش ظاہر کی گئی کہ وہ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے تحت اپنی فوجیں انگریزوں کی مدد کے لئے فوراً روانہ کریں۔ چنانچہ میر عالم نے مہی پت رام کو حکم دیا کہ وہ ریاستی

پچھلے صفحہ سے آگے
۱؎ The Hydrabad State committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800 - 1857) PP 33, 34, 41, 43

فوج کے ساتھ انگریزوں کی مدد کے لئے وہاں پہنچ جائیں۔ مہی پت رام نے عمداً فوجیں روانہ کرنے میں نہ صرف تاخیر کی بلکہ ان کی تعداد بھی بہت کم کر دی۔ اس کے خلاف رزیڈنٹ نے میر عالم کو یہ شکایتی خط لکھا کہ فوجیں دیر سے بھیجی گئیں اور وہ مقررہ تعداد سے بہت کم تھیں۔ اس کے علاوہ یہ فوجیں فرانسیسیوں کی تربیت یافتہ تھیں جن کا رویہ انگریزوں کے خلاف تھا۔ اس طرح نظام کی حکومت پر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا۔ ان تمام شکایتوں کے باوجود جب مہی پت رام ہول کر مہم سر کر کے حیدرآباد آئے (۱۸۰۵ء) تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ سکندر جاہ کی سرپرستی سے محروم نہیں ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انکی یہ کوشش تھی کہ انہیں پیش کار سلطنت کا عہدہ دیا جائے۔ لیکن رزیڈنٹ نے ایک بار پھر اس تجویز کی مخالفت کی اور میر عالم سے ساز باز کر کے نظام کو آمادہ کیا گیا کہ مہی پت رام کو اپنے موجودہ عہدہ سے معزول کر کے برار واپس بھیج دیا جائے (۱۸۰۶ء) اور ان کے عہدہ پر راجہ گوبند بخش کو مامور کیا جائے۔ جب سکندر جاہ نے رزیڈنٹ کی اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو انہیں دھمکی دی گئی کہ سب سیڈیری فوج (Subsidiary) حیدرآباد پر حملہ آور ہوگی۔ ان حالات میں سکندر جاہ کو راجہ مہی پت رام اور اسمٰعیل یار جنگ کو ان کے عہدوں سے علیحدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مہی پت رام کے متعلقین کو انگریزوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ ان واقعات کے بعد مہی پت رام نے اعلانیہ طور پر انگریزوں کی مخالفت شروع کر دی، سکندر جاہ سے خفیہ طور پر خط و کتابت جاری رکھی تاکہ ان کی معزولی ختم کر کے انہیں حیدرآباد واپس ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس کے ساتھ انہوں نے صوبہ برار کے بااثر امراء سے ربط پیدا کیا اور انہیں ایک اقرار نامہ پر دستخط کرنے پر آمادہ کیا کہ وہ راجہ مہی پت رام کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہول کر، سندھیا اور دوسرے انگریز دشمن رجواڑوں کی تائید حاصل کرنے کیلئے ان سے خفیہ طور پر خط و کتابت کے ذریعہ ربط باقی رکھا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ خط و کتابت سکندر جاہ کے علم و اطلاع کے بغیر نہیں کی گئی تھی۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد مہی پت رام قلعہ سگر شاہ پور میں پناہ گزیں ہوئے اور وہاں کافی فوج جمع کر لی۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کمپنی سرکار کسی وقت ان کے خلاف بدلہ کی کارروائی کر سکتی ہے۔

جب رزیڈنٹ کو مہی پت رام کی فوجی تیاریوں کا علم ہوا تو انہوں نے پائگاہ کی ایک جمعیت اور نظام کی باقاعدہ فوج (انگریزی) ولیم پالمر اور میجر گارڈن کی سرکردگی میں بھیجی۔ جس کا مقابلہ مہی پت رام کی فوج سے؛ جو عربوں، روہیلوں اور سکھوں پر مشتمل تھی، ہوا اور پہلے حملے میں انگریزوں اور نظام کی فوجوں کو شرمناک شکست اٹھانی پڑی۔ ایک انگریز فوجی افسر گورڈن لڑائی میں مارا گیا ایک اور افسر پیرس بری طرح زخمی ہوا اور قید کر لیا گیا۔ ہزاروں سپاہی مارے گئے۔

فتح یاب فوج کے کمانڈر مہی پت رام اور محمد رضا خان تھے۔ جب نظام کی فوج کی شکست کی خبر حیدر آباد پہنچی تو رزیڈنٹ نے ایک انگریز کرنل کی سرکردگی میں طاقتور سب سیڈیری فورس مہی پت رام کے مقابلہ کے لئے روانہ کی۔ اس عظیم الشان فوج کا مقابلہ راجہ مہی پت رام کے بس کی بات نہ تھی اور انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اندور جا کر ہولکر کے پاس پناہ لیں۔ انہوں نے ہولکر کو آمادہ کیا کہ وہ نظام کو ایک خط لکھیں اور انہیں کمپنی سرکار کے خلاف جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ لیکن رزیڈنٹ کے دباؤ کے پیش نظر نظام نے اس دعوت کو نامنظور کر دیا اور مہی پت رام کو ایک باغی قرار دیا۔ اس کے بعد مہی پت رام نے ہولکر کے یہاں پناہ لی اور وہیں قتل کر دیئے گئے۔

۱۸۰۰ء۔ ۱۸۱۵ء کے دور میں بغاوتوں میں حصہ لینے یا مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست

۱۔ ڈگمبر راؤ پنڈت ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے نور الامراء اور راجہ راؤ رمبا نمبال کر کا ساتھ دیا۔ ہندوستانی فوجوں سے خط و کتابت کے ذریعہ مسلسل ربط رکھا اور انہیں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے لئے اکسایا۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں مل کھیڑ کے قلعہ میں قید رکھا گیا۔

۲۔ نرسنگ راؤ ان پر بھی وہی الزامات لگائے گئے تھے جو ان کے ساتھی ڈگمبر راؤ پر لگائے گئے تھے اور انہیں بھی مل کھیڑ کے قلعہ میں رکھا گیا۔

۳۔ راجہ رگھوتم راؤ راجہ صاحب بھی ریاست کی پیش کاری کے اعلےٰ عہدہ کے دعوے دار تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے خفیہ طور پر سکندر جاہ کو انگریزوں اور میر عالم کے خلاف بہکانے کی مہم چلائی تھی اور وہ فوجوں کو بغاوت کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔

۴۔ اسمٰعیل یار جنگ راجہ مہی پت رام کے قریبی ساتھی اور ریاستی عدالت کے اعلےٰ عہدہ پر فائز تھے۔ نظام کے نام سندھیا اور ہول کر راجاؤں (جو انگریز دشمن تھے) کے جو خطوط آئے تھے ان کو وہ پڑھ کر سناتے تھے۔ ان پر ایک اور الزام یہ تھا کہ وہ نہ صرف مہی پت رام کے ساتھی تھے بلکہ ان دونوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ سکندر جاہ کو انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کیا جائے۔ انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا اور آخری زمانہ میں تو نظام نے ان سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور انہیں اپنی جاگیر واپس جانے کا حکم دیا گیا۔

۵۔ برق انداز خاں یہ سکندر جاہ کے دودھ بھائی تھے۔ مہی پت رام، نور الامراء کو ان کے عہدہ سے علیحدہ کرنے کے خلاف تھے۔ جب سکندر جاہ نے اس مسئلہ پر خاں صاحب کی رائے پوچھی تو انہوں نے مہی پت رام کی رائے سے اتفاق کیا اور ان کی وفاداری پر شک کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی کہ مہی پت رام کے تعلق سے نظام کو بدظن نہ ہونے دیا جائے۔

۶۔ راز دار خاں یہ بھی بادشاہ وقت کے دودھ بھائی تھے اور برق انداز خاں کے خیالات سے متفق تھے۔

۷۔ اسد علی خاں (مظفر الملک) سیڈڈ Ceded اضلاع کے جاگیر دار تھے اور وہ ایک دوسرے اہم جاگیر دار شہر یار الدولہ کے چچا تھے۔ انہوں نے نظام کی ایماء پر ہزاروں کی فوج تیار کی اور دار السلطنت کی طرف کوچ کیا۔ لیکن انہیں اس کا علم نہ تھا کہ فوج کس مقصد سے طلب کی گئی ہے۔ جب انگریزوں کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اس پورے منصوبے کی مخالفت

کی اور ان کی اطلاعات کے مطابق وہ خاں صاحب کو ناقابل بھروسہ شخصیت تصور کرتے تھے جو اپنی فوج کے ساتھ ٹیپو سلطان سے مل جانا چاہتے تھے اور جب کارنوالس سری رنگا پٹنم سے پسپا ہو کر واپس ہو رہا تھا تو انھوں نے اس پر قاتلانہ حملہ کا منصوبہ بنایا تھا۔

۸۔ محمد رضا خاں

ایک مشہور فوجی کمانڈر تھے۔ وہ اور مہی پت رام دونوں نے مل کر نظام کی فوجوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ نظام کی فوج کے کمانڈر نظامت جنگ اور مسٹر گورڈن تھے۔ اس لڑائی میں نظام کی فوج کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ گورڈن لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا' اسے قید کر لیا گیا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی اور انگریز فوجی افسروں مثلاً یرگ اور بی۔ بسیر اس لڑائی میں مارے گئے۔

دوسرا دور

۱۸۱۵ء ـــــ ۱۸۵۷ء

ریاست حیدرآباد کی تاریخ کا چالیس سالہ یہ طویل دور کئی حیثیتوں سے بہت اہم رہا ہے۔ اس دور میں سیاسی رسہ کشی اس وقت شروع ہوئی جب (۱۸۰۸ء) میں وزیر اعظم میر عالم کا انتقال ہوا اور یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کے جانشین شمس الامراء ہوں یا منیر الملک۔ کمپنی سرکار چاہتی تھی کہ شمس الامرا کو وزیر اعظم بنایا جائے لیکن سکندر جاہ (آصف جاہ سوم) منیر الملک کی تائید میں تھے۔ آخر کار رزیڈنٹ کو منیر الملک کو وزیر اعظم (۱۸۰۸ء۔ ۱۸۳۲ء) کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن راجہ چندو لعل کو انگریزوں کی ایماء پر بیش کار سلطنت بنایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ منیر الملک برائے نام وزیر اعظم بنے رہیں اور چندو لعل کو رزیڈنٹ اور کمپنی سرکار کی تائید کی وجہ سے وسیع اختیارات دیئے جائیں۔ اس طرح ریاست کا پورا نظم و نسق عملاً انہیں سونپ دیا گیا اور وہ ۳۵ سال تک (۱۸۰۸ء۔ ۱۸۴۳ء) پیشکار اور دیوان کی حیثیت سے اس سلطنت کے صحیح معنوں میں مالک و مختار بنے رہے۔ چندو لعل جن اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے تھے اور انہیں جو غیر معمولی اختیارات حاصل تھے وہ صرف کمپنی سرکار کے رحم و کرم کی وجہ سے تھے۔ اس لئے کمپنی سرکار نے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو ریاست میں مستحکم کرنے کے لئے چندو لعل اور ان کو دیئے گئے وسیع اختیارات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا چنانچہ:

برٹش رزیڈنٹ نے چندو لعل کی مدد سے نہ صرف حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج کی شروعات کی بلکہ اس کو اتنی وسعت دی گئی اور طاقت ور بنایا گیا کہ بعد میں اس فوج کو ریاست کے عوام اور دوسری ریاستوں کی عوامی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ اور اس سے چند سال پہلے معاہدہ معاونت (۱۷۸۹ء۔ ۱۸۰۰ء) کے مختلف دفعات کی عمل آوری کے دوران اس سال سب سیڈیری فورس بنائی گئی اور کوئی (۵۰) سال بعد ایک اور فوج امپیریل سروس ٹروپس کے نام سے تشکیل دی گئی۔ آیئے ذرا تفصیل سے

اس کا جائزہ لیں کہ نظام سرکار کی فوج کی موجودگی کے باوجود ان تینوں فوجوں کے قیام کی ضرورت کیوں سمجھی گئی۔ ان کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما تھے اور کیا ان فوجوں کے کثیر اخراجات کا بار ریاستی حکومت برداشت کرنے کے قابل تھی یا پھر ریاست کو ان فوجی اخراجات اور اپنی دوسری مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے روہیلوں اور عربوں سے بھاری سود پر قرضہ لینے اور سود کی ادائی کے لئے ریاست کے اضلاع کو ان قرض دہندوں کے پاس رہن رکھنے اور پامر اینڈ کمپنی کے جال میں پھنسنے کا تباہ کن راستہ مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان نئی تشکیل شدہ انگریز فوجوں اور کمپنی سرکار کی پروردہ پامر اینڈ کمپنی کے بیوپاری کاروبار اور معاشی پالیسیوں کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں غرض یہ کہ ریاست میں سیاسی افراتفری پھیلانے اور اسے معاشی دیوالیہ پن کے کنارے پہنچانے کی ذمہ داری بڑی حد تک راجہ چندو لعل کی بدانتظامی اور فضول خرچی کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

سب سیڈیری فورس (Subsidiary Force) اور کنٹنجنٹ (Contingent) فوج[1]

امپیریل سروس ٹروپس (Imperial Service Troops) کا قیام

تمہید میں اس امر کا ذکر کیا گیا ہے کہ کمپنی سرکار اور میسور کے بادشاہوں کے درمیان چار لڑائیاں ہوئی تھیں۔ میسور کی پہلی جنگ (۱۷۶۷ء - ۱۷۶۹ء) کے تعلق سے کمپنی سرکار کی یہ حکمت عملی تھی کہ مرہٹوں اور نظام سے کسی طرح سمجھوتہ کیا جائے اور تینوں مل کے حیدر علی پر حملہ آور ہوں کیونکہ کمپنی سرکار میسور کے بادشاہ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت خائف تھی۔

لیکن حیدر علی نے کچھ ایسی توڑ جوڑ کی کہ کمپنی سرکار کی اس سازش کو ناکام بنا دیا

---

[1] The Hydrabad State Committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800 - 1857) P (3)

اور خود نظام اور مرہٹوں سے سمجھوتہ کر کے کمپنی سرکار کے خلاف حالات کو پلٹا دیا اور اس کے حملے کو ناکام بنا دیا۔ کمپنی سرکار کو مجبور ہو کر ۱۷۶۹ء کا معاہدہ کرنا پڑا۔ دوسری طرف حیدر علی، نظام اور مرہٹوں نے یہ طے کیا کہ اس کامیاب حکمت عملی کو جاری رکھا جائے۔

میسور کی پہلی جنگ کمپنی سرکار کے لئے خطرہ کی ایک گھنٹی ثابت ہوئی اور انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر دکن کی یہ تین اہم طاقتیں۔ حیدر علی، نظام اور مرہٹے متحد ہو جائیں تو پھر دکن میں کمپنی سرکار کے پیر اکھڑ جائیں گے۔

ان پریشان کن حالات کا سامنا کرنے کمپنی سرکار نے دور رخی اور شاطرانہ پالیسی اختیار کی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دکن کی ان طاقتوں کو ایک نہ ہونے دیا جائے۔ اس لئے بیس، پچیس سال کے غور و فکر کے بعد ان کا پہلا سیاسی پینترا یہ تھا کہ ایک مبسوط، جامع اور تباہ کن معاہدہ معاونت (Subsidiary Alliance) جو یکم ستمبر ۱۷۹۸ء کو کمپنی سرکار اور نظام کے درمیان طے پایا۔ جس کی رو سے اب نظام کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ کمپنی سرکار کی رضامندی کے بغیر کسی دوسری طاقت (اندرونی یا بیرونی) سے کسی قسم کے تعلقات رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو دونوں مل کر اس کا مقابلہ کریں۔

کمپنی سرکار نے ٹیپو سلطان اور مرہٹہ پیشواؤں کو بھی اس معاہدہ میں پھانسنے کی ممکنہ کوشش کی لیکن ان دونوں نے صاف انکار کر دیا یا یوں کہئیے کہ زنجیر کی ان تین کڑیوں میں سے صرف ایک کڑی جو بوسیدہ اور زنگ آلود ہو چکی تھی اور مزاحمت کے قابل نہ تھی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اس لئے کمپنی سرکار کو یہ خدشہ تھا کہ جن دو حکومتوں نے غلامی کے اس طوق کو اپنے گلے میں ڈالنے سے انکار کر دیا ہے وہ کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اس بات کا بھی احساس ہو چکا تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی زرعی معیشت کو جس طرح تباہ و برباد کر دیا، کسانوں کو اپنی زمینوں سے اور دستکاروں کو اپنے پیشوں سے محروم کر دیا۔ ان کے دور رس اثرات یہ ہوئے کہ ان طبقات میں کمپنی سرکار کے خلاف بیزارگی اور نفرت کے جذبات ابھرنا شروع ہو گئے تھے اور آثار و قرائن تو یہ تھے کہ کسی وقت بھی عوامی بغاوتوں کا جوالا مکھی پھوٹ پڑے۔

ان دھماکو حالات کے پیش نظر کمپنی سرکار نے یہ طے کیا کہ معاہدۂ معاونت (۱۷۹۸۔۱۸۰۰ء)

کے مطابق اسی سال سب سیڈیری فوج کا بھی قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ میر نظام علی خاں آصف جاہ دوم کے دور حکومت کے آخری سال تھے اور انگریزوں کے دو خیر خواہ میر عالم (دیوان) اور راجہ چندو لعل (پیش کار) جیسے اہم خدمات پر مامور تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان ہی کی مدد اور کوششوں سے اس فوج کا قیام ممکن ہو سکا۔ یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت ریاست حیدر آباد کی فوج کی تعداد ۷۰ ہزار تھی جس میں افریقی عرب، روہیلے اور کچھ بیرونی ملکوں کے سپاہی بھی شامل تھے، لیکن کمپنی سرکار کی نظر میں نظام کی فوج ناقص، نا اہل اور سب سے بڑھ کر ناقابل بھروسہ تھی۔ غرض یہ کہ سب سیڈیری فوج قائم کی گئی جو چھ پلٹون (فی پلٹون ایک ہزار جوان) ایک رجمنٹ (۵ سو سواروں کی) اور توپ خانے پر مشتمل تھی اور جسے مملکت حیدر آباد میں متعین کیا گیا۔ اس فوج اور توپ خانے کا سالانہ خرچ (۲۰) لاکھ ۷۰ ہزار روپے تھا۔ اس پورے خرچ کی ادائی کی ذمہ داری نظام پر تھی۔ لیکن فوج پر پورا کنٹرول انگریز فوجی افسروں کا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس فوج میں دو پلٹنوں اور ایک رجمنٹ کا مزید اضافہ کیا گیا۔ ان تمام مصارف کی پابجائی کے لئے نظام سرکار نے وہ تمام علاقے دوامًا کمپنی سرکار کے حوالے کر دیئے جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی تیسری اور چوتھی جنگ میسور کے بعد ان کو ملے تھے۔ گڑپہ بلاری اور انت پور کے زرخیز علاقوں پر کمپنی سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح کمپنی سرکار کی سرحد دریائے تنگبھدرا تک پہنچ گئی۔

حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج (Hydenabad Contingent Force) کا قیام[1]

۱۹ ویں صدی عیسوی کے پہلے دہے میں مرہٹہ فوجوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کے حملے بھی بڑھنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مرہٹہ فوجوں نے سارے وسط ہند اور راجپوتانے میں کہرام مچا رکھا تھا۔ اس پس منظر میں ۱۸۱۱ء میں جب سر ہنری رسل رزیڈنٹ (۱۸۱۱ء - ۱۸۲۷ء) ہو کر حیدر آباد آیا اور اس نے دیکھا کہ سب سیڈیری

---

[1] The Hydrabad state committee, the Freedom struggle in Hydrabad Vol I. (1801 - 1857) PP 62, 70.

فوج (اعانتی فوج) اب قابل نہیں رہی کہ وہ ریاست حیدر آباد میں موثر انداز میں امن و امان قائم رکھ سکے اور مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے حملوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس فوج کی جدید تنظیم عمل میں لائی جائے۔ لیکن اس تنظیم کی اصلی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے زبردست فوج کی ضرورت ہوگی۔ خود گورنر جنرل ہند کا بھی یہ خیال تھا کہ اس فوج کو جس کے اخراجات نظام سرکار برداشت کرے گی اور جو انگریزوں کے مفاد کے لئے آسانی سے استعمال کی جا سکے گی، انگریزی حکومت بہت کچھ خرچ سے بچ جائے گی۔[1] چنانچہ ہنری رسل نے فوج کی جدید تنظیم کی جو رسل بریگیڈ کے نام سے موسوم ہوئی۔ بعد میں یہی بریگیڈ حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج (Contingent Force) کہلائی۔ ۱۸۱۴ء میں لیفٹننٹ ہیبر (Hebber) اس کا کمانڈر مقرر ہوا۔ اس فوج کی تنخواہیں پابندی سے ادا کرنے نظام سرکار نے رزیڈنٹ کو مجاز گردانا کہ وہ شمالی سرکار سے (۹) نو لاکھ روپے سالانہ پیش کش رقم حاصل کر لیا کریں۔ فوج کے افسروں کو تنخواہ کے علاوہ الاؤنس بھی دیا جاتا تھا۔ جس کی جملہ رقم ساڑھے تیرہ لاکھ ہوتی تھی۔ اس طرح سرکاری خزانہ کو جملہ ۲۸ لاکھ روپے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ جو سکندر جاہ کی مخالفت کے باوجود انگریزوں کے وفادار پیش کار راجہ چندو لعل کی بدولت پابندی سے ادا کی جاتی تھی۔

اس فوج کی زیادہ تعداد کو اورنگ آباد میں رکھا گیا تھا تاکہ آسانی سے مرہٹوں کے حملوں یا بغاوتوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ دو ہزار فوج شہر حیدر آباد میں توپ کے سانچہ میں رکھی گئی تاکہ ریاست کے کسی حصہ میں بغاوت پھوٹ پڑے تو یہاں سے آسانی سے فوجیں فوراً روانہ کی جا سکیں۔ اس زمانہ میں نظام کی فوج کی بھی تنظیم جدید کی گئی جو تین بریگیڈوں پر مشتمل تھی۔ ان میں دو بریگیڈ برار میں تھیں جس کے کمانڈر ایلیٹ تھے اور ایک بریگیڈ حیدر آباد میں رکھی گئی تھی۔

حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج کی تنظیم جدید

ریاست میں بڑھتی ہوئی عوامی بغاوتوں کے پیش نظر

---

[1] یوسف حسین خاں، ڈاکٹر۔ تاریخ دکن (عہد سانیہ) ص ۱۶۲۔۱۶۳

کمپنی سرکار نے یہ ضروری سمجھا کہ اس فوج کو جدید ہتھیاروں سے لیس کر کے ایک زیادہ منظم اور مکمل فوج میں تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ یہ تنظیم ۱۸۲۶ء میں شروع کی گئی اور اس کو وسعت دے کر ریاست کے مختلف علاقوں میں متعین کیا گیا۔

۱۔ بلارم کو پہلی آل حیدرآباد ڈویژن کا مرکز بنایا گیا جو انفنٹری آرٹیلری اور غیر منظم بیاٹری پر مشتمل تھی۔

۲۔ اورنگ آباد اور اس کے اطراف کے علاقوں میں گھوڑا سوار فوج (کیاولری) متعین کی گئی۔

۳۔ ہنگولی میں بھی انفنٹری، آرٹیلری اور کیاولری کے دو بٹالین رکھی گئیں۔ اس پوری فوج کے کمانڈر اعلےٰ ریاست کے رزیڈنٹ اور مقامی فوجی افسروں کو تبدیل کر کے انگریز افسر مقرر کئے گئے۔

فوج کی اس تنظیم جدید اور مختلف علاقوں میں اس کے پھیلاؤ کا اہم مقصد یہ تھا کہ ریاست کے مختلف علاقوں میں بڑھتی ہوئی عوامی بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا جائے۔ چنانچہ ریاست کے ایک سابق رزیڈنٹ مٹ کاف نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنے ایک خط مورخہ یکم مارچ ۱۸۳۲ء میں کیا تھا۔

امپیریل سروس ٹروپس[1]

مذکورہ بالا دو فوجوں کی موجودگی کے باوجود کمپنی سرکار ریاست میں امن و امان کی صورت حال سے مطمئن نہ تھی اور بغاوتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے سے بوکھلا گئی تھی۔ اس لئے یہ چاہتی تھی کہ ایک اور فوج اضافہ کی جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہیں ایک اچھا بہانہ مل گیا۔ ان دنوں یہ خبریں تیزی سے پھیلائی جا رہی تھیں کہ روس، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے (۱۸۸۶ء) اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی سرحدوں کو مستحکم بنایا جائے چنانچہ اس بہانے نظام سرکار سے (۶) ساٹھ لاکھ روپے کی رقم بٹور لی گئی اور لارڈ ڈفرن نے یہ بھی شوشہ چھوڑ دیا کہ ممالک محروسہ کے اندر امن و امان کو باقی رکھنے کے لئے سواروں کا ایک دستہ بنانا ضروری ہے جس کو جدید ترین جنگی تربیت

---

[1] یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، تاریخ دکن (عہد حالیہ) ص ۲۰۸ - ۲۰۹

دی جائے گی اور جب کبھی برطانوی حکومت کو ضرورت پڑے اس دستہ کو استعمال کیا جائے گا۔ ۷۰ لاکھ روپے کا جو عطیہ نظام نے دیا تھا اس سے امپیریل سروس ٹروپس تشکیل دی گئی۔ ایک اور فوج بنانے کی اس اسکیم کی سخت مخالفت نظام کے اعلیٰ عہدیداروں اور بعض وزیروں نے بھی کی جو ان سنی کر دی گئی۔

اس طرح انگریز فوجی افسروں کے زیر کمان تین فوجوں (جن کا تفصیلی ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) پر جملہ خرچ تقریباً ۹۰ لاکھ روپے کا ہو گیا تھا۔ جس کی ادائی ریاستی خزانے سے کی جاتی تھی اور نظام سرکار کی فوج کے اخراجات الگ تھے۔ فوجوں پر اتنے کثیر اخراجات کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کا معاشی حیثیت سے دیوالیہ نکل چکا تھا۔ اگر کوئی کسر باقی رہ گئی تھی تو اس کی تکمیل پامر اینڈ کمپنی نے کر دی جس کا ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی بڑی فوج کس کے مفادات کے لئے تھی اور ان فوجوں پر خرچ کے لئے لاکھوں روپے کہاں سے آئے؟ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے تحت تین فوجیں صرف اس لئے قائم کی گئی تھیں کہ ان کے سامراجی اور نوآبادیاتی مفادات کا تحفظ کیا جائے، آصف جاہی سلطنت اور جاگیرداری نظام کو باقی رکھا جائے۔ فوجی خرچ کے لئے لاکھوں روپے کی رقم حیدرآباد کے مفلوک الحال کسانوں، محنت کش عوام اور متوسط طبقات کے خون پسینہ کی کمائی ان سے زبردستی چھین کر ان ہی کی تحریکوں کو کچلنے، ان پر گولیاں چلانے اور انہیں پھانسی کے تختوں پر لٹکانے کے لئے سامراجی فوجوں کے حوالے کی گئی۔

پامر اینڈ کمپنی[1]: اس کمپنی کی بنیاد ولیم پامر نے رکھی تھی جس نے نظام کی فوج میں ملازمت چھوڑ دی اور پامر اینڈ کمپنی کے نام سے ریاست میں اپنی معاشی و بیوپاری سرگرمیاں شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ سیاسی میدان میں بھی اپنے قدم جما لئے۔ مختصر سی مدت میں ریاست کی سیاسی شطرنج کے اہم مہرہ کی

---

[1] The Hydrabad state committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800–1957) PP

حیثیت سے ابھر کر آئی۔ کمپنی کو معاش اور سیاسی استحکام حاصل کرنے میں ریاست کے رزیڈنٹ ہنری رسل اور مہاراجہ چندو لعل نے بہر پور کوشش اور ممکنہ مدد کی۔

ابتدا میں اس کمپنی نے گوداوری ندی کے قریب لکڑی کا کاروبار شروع کیا اور خوب منافع کمایا۔ پھر برار میں کپاس کی کاشت شروع کی۔ ۱۸۶۱ء میں گورنر جنرل نے اس کمپنی کی درخواست پر جس کی پُرزور سفارش ریاستی رزیڈنٹ ہنری رسل نے کی تھی اسے ایک بینکنگ ایجنسی کھولنے اور نظام حکومت سے مالی لین دین کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کمپنی کے حصہ داروں میں ایک ممتاز شخصیت سر ولیم رمبولڈ کی بھی تھی جو سمجھا جاتا ہے کہ گورنر جنرل کے داماد تھے۔ اس کے علاوہ چند اہم یوروپین اور خود ہنری رسل بھی شامل تھے۔

اس کمپنی کو زیادہ اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب مہاراجہ چندو لعل نے (۱۸۳۲ء-۱۸۴۳ء) ریاستی رزیڈنٹ کی ایماء پر کمپنی سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج کے اخراجات کے ادائی کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کے بدلہ کمپنی کو ریاست میں ایک بلند اور باوقار مرتبہ حاصل ہوگیا۔ چنانچہ کمپنی کو اس کی بھی اجازت مل گئی کہ وہ نظام حکومت کو ماہانہ دو لاکھ روپے کا قرضہ دے اور اس کے معاوضہ میں کمپنی کو مجاز گردانا گیا کہ وہ برار کے چند علاقوں کے محاصل خود وصول کرلے۔ اس طرح کمپنی کو ہر سال (۶) لاکھ روپے کا منافع ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمپنی کو اپنی رقم پر ۲۵ فیصد منافع ملتا تھا۔

کسانوں سے محاصل وصول کرنے کے لئے کمپنی نے فوجی دستوں کو مقرر کیا تھا۔ جو دیہاتوں پر حملہ کرتے اور بہیمانہ طریقے سے محاصل وصول کرتے تھے۔ اس طرح کمپنی رفتہ رفتہ ریاست کی واحد کمیشن ایجنسی بن گئی۔ کمپنی کی اس بے تحاشہ لوٹ کا سدباب کرنے کی بجائے مہاراجہ چندو لعل نے ریاست کے خزانے سے پامراور اس کے خاندان کو وظیفے جاری کئے جن کی مجموعی رقم ماہانہ ۸۰ ہزار روپے تھی۔

جب ریاستی حکومت کمپنی کے اتنے کثیر قرضوں میں جکڑی ہوئی تھی تو کمپنی نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ریاستی نظم و نسق میں بھی مداخلت شروع کردی اور اپنے ریشہ دوانیوں کا جال بچھادیا۔ اس طرح ریاستی حکومت کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

اس کمپنی کا زوال تقریباً دس سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۲۰ء میں پرانے رزیڈنٹ ہنری رسل ہٹا دیئے گئے اور ان کی جگہ لارڈ مٹ کاف کو حیدر آباد کا رزیڈنٹ بنایا گیا۔ مٹ کاف نے جلد ہی یہ محسوس کیا کہ ریاست کی معاشی حالت انتہائی تشویشناک ہے اور عوام معاشی بحران سے تنگ آکر ناگپور اور متصلہ برٹش انڈیا کے علاقوں میں ہجرت کر رہے ہیں۔ مٹ کاف نے جب اس معاشی تباہ حالی کے اسباب کی گہرائی میں جا کر پتہ لگانے کی کوشش کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسکی بنیادی وجہ پامر اینڈ کمپنی اور اس کی لوٹ کی پالیسی ہے۔ مہاراجہ چندو لعل پر جب سیاسی دباؤ ڈالا گیا تو مٹ کاف کو پتہ چلا کہ پامر اینڈ کمپنی کو جملہ ۸۲ ½ لاکھ روپے کا قرضہ واجب الادا ہے۔ اس کے برعکس مقامی بنکوں کو صرف ۱۷ لاکھ روپے کا قرضہ دینا ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل نے جملہ قرضوں کا تعین ۸۰ لاکھ روپے کیا (یعنی ۲½ لاکھ روپے کی کمی کی) اور یہ طے پایا کہ یہ رقم پامر اینڈ کمپنی کو برٹش پریسیڈنٹ کے خزانے سے ادا کر دی جائے اور اس کے معاوضہ میں نظام حکومت کو سات لاکھ روپے آمدنی والے شمالی سرکار کے اضلاع کو برٹش گورنمنٹ کے حوالے کرنا پڑا (۱۸۲۳ء)۔ اس معاشی اور سیاسی افراتفری کی وجہ سے حکومت کے خلاف بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ریاستی نظم و نسق کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ اس کے لئے ان بغاوتوں پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ چنانچہ نانڈیڑ، پربھنی اور بیدار کے اضلاع میں "ہٹ کر" نامی ایک جنگجو قبیلہ نے ۱۷۹۸ء میں بغاوتوں کی ابتداء کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ریاست کے دوسرے اضلاع میں "بھیل قبیلے" اور مرہٹوں کی بغاوتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غرض یہ کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے تقریباً ۵۰ سالہ دور میں انگریز حکمرانوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ریاست کے بعض اہم کارندوں اور عہدہ داروں کی شخصی بغاوتوں کے علاوہ ــــ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اکثر اضلاع میں مقامی بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا جن میں قابل ذکر اورنگ آباد میں بغاوت، اودگیر اور نظام آباد کے دیس مکھوں کی بغاوت، رائچور اور کریم نگر کی بغاوتیں ہیں۔ ان مقامی بغاوتوں کے علاوہ نظام کی کنٹنجنٹ فوج میں یوروپین افسروں کے خلاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سبسیڈیری فوج میں سپاہیوں کی کئی بغاوتیں ہوئیں جنہیں برٹش افسروں

کے خلاف شخصی حملوں اور عداوتوں کا نام دے کر کچل دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں حیدر آباد کے مجاہدین آزادی کا اطراف کے برٹش انڈیا صوبوں میں ابھرتی ہوئی تحریک آزادی اور مجاہدین کار بط و ضبط بڑھ رہا تھا۔ ان اثرات کی وجہ سے بغاوتوں کا جو سلسلہ ۱۸۰۶ء میں شروع ہوا تھا ان میں اور شدت پیدا ہوئی چنانچہ اس دور کی سب سے اہم بغاوت مبارز الدولہ کی ہے جو وقفہ وقفہ سے ۲۴ سال یعنی ۱۸۳۶ء تک جاری رہی۔ اس دور میں ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۱ء تک (یعنی ۲۳ سال) تلنگانہ کے دو اضلاع، مرہٹواڑہ کے چار اضلاع اور کرناٹک کے تین اضلاع میں مقامی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان بغاوتوں کی رہنمائی عام طور پر ان علاقوں کے دیسی مکھ، معاش دار، چھوٹے جاگیردار اور روشن خیال متوسط طبقے کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ان بغاوتوں میں مقامی عوام نے بھی حصہ لیا۔ یہاں ایک بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد ریاست کے جن اضلاع میں بغاوتیں ہوئیں ان میں تلنگانہ کا علاقہ وسیع ہونے کے باوجود یہاں کے صرف چند ہی اضلاع میں بغاوتیں ہوئیں اس کے برخلاف مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے زیادہ تر اضلاع بغاوتوں کے مراکز رہے۔

مبارز الدولہ کی بغاوت ۱۸۱۵ء-۱۸۳۹ء

مبارز الدولہ کی بغاوت پچھلی بغاوتوں سے کئی حیثیتوں سے مختلف تھی۔

(۱) یہ بغاوت صرف شخصی نوعیت کی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک کل ہند وہابی تحریک اور اس کے نظریات کارفرما تھے۔ اسی وہابی تحریک نے آگے چل کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی (بشمول حیدر آباد) اہم رول ادا کیا۔

(۲) دوسرے یہ بغاوت صرف شہر حیدر آباد کی حد تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی سرگرمیاں حیدر آباد کے پڑوسی علاقوں اور ریاستوں میں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دور مبارز الدولہ کی بغاوتوں کا دور تھا۔ اس لئے مبارز الدولہ کی اور مذکورہ بالا مقامی بغاوتوں کا حقیقی پس منظر میں جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریاست حیدر آباد میں کمپنی سرکار کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کو مدنظر رکھنے کے علاوہ وہابی تحریک کے نظریات اور برصغیر ہندوستان میں اسکے قدم و خال

کا بھی جائزہ لیا جائے۔

وہابی تحریک[1] اس تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب تھے جو مختلف روایتوں کے مطابق ۱۶۹۱ء یا ۱۷۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ مدینہ منوّرہ، بصرہ اور دمشق میں تعلیم پائی اور ان کا انتقال ۱۷۹۶ء میں ہوا۔ اس تحریک کے بارے میں قاضی عبدالغفار (سابق مدیر پیام) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار جمال الدین افغانی" میں لکھا ہے کہ "شروع میں جب انہوں نے عرب قبائل کے سامنے اپنے عقائد پیش کئے تھے تو ان عقائد کی اس قدر شدید مخالفت کی گئی کہ آخر ان کو محمد بن سعود سلطان نجد کے یہاں درعیہ میں پناہ لینی پڑی۔ ان کی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) صرف قرآن کی تعلیم کے مطابق اسلامی عقائد کا استحکام ہونا چاہیئے۔
(۲) عثمانی یا کسی دوسری خلافت کو قبول نہ کرنا چاہیئے۔
(۳) درویشوں اور فقراء کا کوئی غیر معمولی احترام نہ کیا جائے۔
(۴) نماز، روزہ اور حج وغیرہ کی سختی سے پابندی کی جائے۔
(۵) شراب، تمباکو، جوا، جادو، ریشم اور سونا یہ سب ممنوع ہیں۔
(۶) مقبرے اور پختہ قبریں نہ بنائی جائیں۔
(۷) خدا کی تمام صفات صرف اسی کے لئے مخصوص سمجھی جائیں اور کسی انسان کو اس میں شریک نہ بنایا جائے۔
(۸) پیغمبروں کو محض انسان سمجھا جائے اور صفات ربانی سے ان کی ذات کو نسبت نہ دی جائے۔
(۹) جو چیزیں خدا کے قبضے میں ہیں وہ غیر سے طلب نہ کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

۱۷۴۳ء میں محمد بن سعود نے ان عقائد کو قبول کر لیا اور وہ نجد کے پہلے وہابی امیر تھے۔ اس کے بعد ان کے تمام جانشین وہابی ہوتے رہے۔ عبدالعزیز بن سعود نے تمام نجد میں اپنی کامل حکومت قائم کر لی اور دوسرے عرب ممالک

---

[1] قاضی عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی مع مقدمہ

میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ اس تحریک کے بارے میں قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں۔
"وہابی تحریک کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ تحریک اتحاد اسلام کی طرح کوئی سیاسی تحریک تھی، درحقیقت وہ ایک خالص مذہبی اور فرقہ وارانہ تحریک تھی۔ جہاں کہیں وہ تحریک جدید تمدن اور علوم سے ٹکرائی تو کامیاب نہ ہو سکی۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہابیت میں دوسروں کے عقائد کے ساتھ رواداری کا عنصر بہت کم موجود تھا۔" وہابی تحریک کی ان کمزوریوں اور نقائص کے باوجود "نشاۃ ثانیہ درحقیقت شروع ہوئی وہابی تحریک سے جو عرب کے ایک گوشے سے پیدا ہوئی اور ۱۹ ویں صدی کے شروع میں تمام حجاز پر حاوی ہو گئی۔ اس تحریک کا اثر ہندوستان تک پہنچا۔" یہاں حضرت اسمٰعیل شہید کی جماعت ان کی تعلیمات سے متاثر ہوئی اور اس تحریک کے چوٹی کے رہنما سید احمد بریلوی تھے (۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء) اس تحریک نے شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) کے نظریات اور شاہ عبدالعزیز کی حرکیاتی قیادت سے بھی اثرات قبول کئے۔ ہندوستان میں وہابی تحریک کے رول کے بارے میں ڈاکٹر کنور محمد اشرف لکھتے ہیں کہ "..... ہندوستان کے وہابیوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور انہیں برطانوی اور مسلمان جابروں یا سی جور و ستم اور ہندوستانی مفاد پرستوں کے معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنے پر اکسایا۔ انہوں نے مسلم معاشرے کے اندر طبقاتی امتیازات کو کسی قدر مٹانے میں مدد دی اور اصلاح کے لئے روشن خیال طبقے کو غیر مطمئن عوام کے ساتھ متحد ہونے پر آمادہ کیا۔" اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا۔ اس محاذ میں سب ہی شامل تھے۔ جائدادوں سے محروم امراء، تباہ حال دستکار، ناکام و نامراد علماء اور غیر مطمئن فوجی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا۔"

اس تحریک کے ابتدائی دور میں سید احمد بریلوی نے مذہبی اور سماجی اصلاحات کیں، ہندو مسلم بھائی چارگی کو فروغ دیا اور اپنے گروپ میں جفاکشی، ضبط اور اتحاد پیدا کیا۔ لیکن جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا تیزی سے زوال ہو رہا تھا اور انگریزوں نے ۱۷۵۷ء کے بعد سے ملک گیری کی پالیسی پر شدت سے عمل کرنا شروع کیا اور ۱۸۰۰ء کے پہلے دہے تک تقریباً تمام ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس کے ساتھ

انہوں نے ہندوستان کے معاشی وسائل کی بے تحاشہ لوٹ کھسوٹ شروع کردی اور کسانوں اور دست کاروں کو پوری طرح کنگال اور مفلس بنادیا تو اس کے ردّعمل کے طور پر وہابی تحریک نے ایک نئی کروٹ لی اور ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اب وہ ایک طاقتور اور وشال انگریز دشمن تحریک کا روپ اختیار کرلی تھی۔ جس نے غریب مسلمانوں اور خاص طور پر بنگال کے کسانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی، یہ تحریک بہت تیزی سے ہندوستان کی اکثر ریاستوں اور علاقوں میں پھیلتی گئی۔ ریاست حیدرآباد بھی اس تحریک سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکی۔ اور یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ آصف جاہی خاندان کے تیسرے بادشاہ سکندر جاہ (۱۸۰۳ء۔ ۱۸۲۹ء) کے فرزند نواب مبارزالدولہ اس تحریک کے روح رواں تھے۔

وہابی تحریک کے اس پس منظر کے بعد ہم اس شاہی باغی کا ذکر چھیڑتے ہیں جو چوبیس سال (۱۸۱۵ء۔ ۱۸۳۹ء) کی مدت میں تین مرتبہ قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند رہا اور غلامی کی فضا میں دوبارہ سانس لینے کی بجائے اس مجاہد نے جدوجہد کے دوران اور نظر بندی کی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۱۸۵۴ء)

میر گوہر علی خاں المخاطب نواب مبارز الدولہ [1] (۱۷۹۵ء۔ ۱۸۵۴ء)

نواب مبارزالدولہ آصف جاہ سوم میر اکبر علی خاں سکندر جاہ بہادر کے فرزند تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نواب مبارزالدولہ کو انگریز دشمن رجحانات ورثے میں ملے تھے کیونکہ سکندر جاہ نے بھی اپنے دور حکومت میں اکثر موقعوں پر (خاص طور پر راجہ مہی پت رام کے معاملہ میں) کمپنی سرکار اور "رزیڈنٹ بہادر" کے خیالات اور بعض فیصلوں سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ضدی اور سرکش تھے، ارادے کے بڑے پکے تھے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں بے رحمی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ان کی ان ہی عادتوں کی وجہ سے تمام افراد خاندان اور خود بادشاہ سلامت بھی ان سے نالاں اور ناراض تھے۔ شاہی خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے انہیں فنون سپہ گری میں ماہر بنادیا گیا تھا،

---

[1] The Hydrabad state committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol. I, (1800-1857) P.P 120-132

تلوار چلانے اور تیر اندازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ ان میں ابتدا ہی سے وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو اس دور کے ایک باغی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔

پہلی نظر بندی اگست ۱۸۱۵ء

پہلی نظر بندی کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ تاریخ گلزار آصفیہ کے مطابق مبارز الدولہ کی دیوڑھی کے ملازم شیرین نامی ایک مرثیہ خواں کا جھگڑا ایک درزی سے ہو گیا جو رزیڈنسی بازار (جو اس وقت انگریزوں کے زیر نگرانی تھا) میں رہا کرتا تھا۔ مبارز الدولہ نے شیرین کو اپنی پناہ میں لے لیا اور درزی کو گرفتار کر لیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع اس وقت کے رزیڈنٹ ہنری رسل (۱۸۱۱ء - ۱۸۲۰ء) کو ہوئی تو اس نے ریاست کے عہدیداروں سے ربط پیدا کر کے بات چیت کے ذریعہ معاملہ طے کرنے کی بجائے درزی کی رہائی کے لئے مبارز الدولہ کی دیوڑھی (کوٹلہ عالی جاہ) پر حملہ کر دیا۔ مبارز الدولہ کے سپاہیوں نے بڑی بہادری سے مدافعت کی اور مبارز الدولہ کے تیر کا نشانہ ایک انگریز افسر بن گیا۔ اس کے باوجود جب انگریز فوج نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو مبارز الدولہ کے حبشی سپاہی نے بڑی بہادری اور چالاکی سے توپ خانہ سے اس طرح حملہ کیا کہ انگریز فوجوں کو پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب رزیڈنٹ کو اپنے حملہ کی پسپائی کی خبر ملی تو اس نے ایک اور طاقتور حملہ کرنے کے لئے سکندر آباد کی چھاؤنی سے انگریز فوج طلب کی۔ مگر مہاراجہ چندو لعل کے بیچ بچاؤ اور حکمت عملی سے مزید خون خرابے کی نوبت نہ آئی۔ لیکن مبارز الدولہ اور ان کے شریک کار صمصام الدولہ اور ممتاز الدولہ کو ۵ سال کے لئے قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا اور درزی کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اگست، ستمبر ۱۸۱۵ء میں پیش آیا۔

دوسری نظر بندی ۱۸۲۹ء - ۱۸۳۰ء

اپنی پہلی نظر بندی سے رہائی کے بعد مبارز الدولہ نے اپنے کو فوجی حیثیت سے مستحکم بنانے کے مقصد سے عربوں اور افغانوں کو بڑی تعداد میں اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ جب رزیڈنٹ کو اس کی اطلاع ملی تو رزیڈنٹ نے یہ بہانہ بنا کر کہ مبارز الدولہ اپنے بھائی ناصر الدولہ (۱۸۲۹ء - ۱۸۵۷ء) کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں، شہر پر حملہ کر دیا۔ لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

۱۹ اپریل ۱۸۳۰ء کو مبارز الدولہ کو دوبارہ گرفتار کر کے انکی والدہ فضیلت النسا بیگم کے ساتھ قلعہ گولکنڈہ بھیج دیا گیا۔ تاریخ گلزار آصفیہ کے مصنف کے بموجب جب مبارز الدولہ کو گرفتار کر کے ان کی دیوڑھی سے قلعہ کو لے جایا جا رہا تھا تو کوٹلہ عالی جاہ سے قلعہ گولکنڈہ کے دروازے کے اس لمبے راستے کے دونوں طرف ہزاروں عوام، بوڑھے، نوجوان، عورتیں اور بچے۔ اپنے مجاہد کے دیدار کے لئے سڑکوں، گلی کوچوں، دیوڑھیوں اور مکانوں کی چھتوں پر جمع ہو گئے تھے۔

تقریباً دو سال بعد یعنی ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو مبارز الدولہ اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد سرخ عماری میں بیٹھے شہر میں داخل ہوئے تو عوام کے پہلے سے زیادہ ہجوم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مبارز الدولہ ریاست کے عوام میں کس قدر مقبول اور ہر دل عزیز تھے اور کمپنی سرکار کی شیطانی حکومت کے کتنے خلاف اور اس سے کتنے برہم تھے۔ مبارز الدولہ کی دوسری نظر بندی ان کے بھائی ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے دور حکومت میں ہوئی۔

تیسری نظر بندی ۱۸۳۹ء

تیسری بار مبارز الدولہ کو وہابی تحریک کی سرپرستی اور سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اور ۱۵ سال تک قلعہ گولکنڈہ میں نظر بندی کے دوران ان کا انتقال ہوا۔

وہابیت کے بنیادی عقائد اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کا اجمالی جائزہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لیا جا چکا ہے اور اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کس سرعت سے یہ تحریک ہندوستان کے اکثر علاقوں اور خود ریاست حیدرآباد میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ چنانچہ اس تحریک کے رہنما سید احمد بریلوی نے سکندر جاہ بہادر (آصف جاہ سوم) کو خط لکھا تھا جس میں انہوں نے نواب صاحب کے خاندانی روایات کو سراہا، ان کی مذہبی عقیدت مندی کی مدح کی اور اس بات پر زور دیا کہ اس دو روزہ فانی دنیا میں بادشاہوں اور حکمرانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب اور عقائد کی حفاظت کریں اور ان غیر ملکی کافروں اور غاصبوں کے خلاف اعلان جہاد کریں جو ہمیں غلام بنائے ہوئے ہیں۔ یہی ہمارے اسلاف کی روایات ہیں۔ آخر میں سکندر جاہ سے اپیل کی گئی

کہ وہ بھی اس کارِ خیر میں ان کا ساتھ دیں۔ اگر وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکتے تو اپنی ریاست کے دانشوروں، نوابوں اور فوجیوں کو اس جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دیں اور اس تحریک کی ممکنہ مدد کریں۔ اس خط کے کچھ ہی دنوں بعد سنہ ۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی کا انتقال ہو گیا لیکن ان کے پیروؤں نے کمپنی سرکار کے خلاف اپنی جدوجہد کو کئی برسوں تک جاری رکھا۔ چنانچہ اس تحریک کے دو خلیفے مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم ۱۸۳۸ء میں دکن (حیدرآباد) آئے اور اپنے نمائندوں کو مدراس، بنگلور، کرنول اور بمبئی روانہ کیا۔ ان خلفاء نے مختصر سی مدت میں نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ اضلاع میں بھی سینکڑوں لوگوں کو اس تحریک میں شامل کر لیا۔ مبارز الدولہ کی پچھلی دو نظر بندیوں کے پیشِ نظر ان کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح نواب صاحب سے قربت حاصل کی جائے اور انہیں اس تحریک کا ہم نوا بنایا جائے۔ چنانچہ مولوی سلیم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے بہت جلد نواب صاحب کے پاس رسوخ حاصل کر لیا اور بالآخر نواب صاحب نے اس تحریک کی سرپرستی قبول کرنے سے اتفاق کر لیا۔ اس کے بعد تو نواب کی ڈیوڑھی وہابی تحریک کا مرکز بن گئی۔

وہابی تحریک کی تبلیغ کے سب سے اہم مراکز مساجد تھے۔ جہاں مولوی اپنے وعظ کے دوران عوام کو اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے واقف کراتے اور انہیں یہ سمجھایا جاتا کہ عالم دین شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے مطابق ہندوستان انگریزوں کی حکمرانی کے بعد دارالسلام باقی نہیں رہا بلکہ دارالحرب بن گیا ہے اس لئے ہر مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا کسی آزاد مسلم ملک کو ہجرت کریں۔ اس طرح نماز کے بعد مسلمانوں سے اپیل کی جاتی کہ وہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کریں۔ جمعہ کی نماز کے لئے فوجی بھی بڑی تعداد میں مسجدوں میں جمع ہوتے، ان سے بھی فوج میں بغاوت برپا کرنے کی تلقین کی جاتی۔ اس تحریک کے پرچار کا ایک خفیہ طریقہ یہ تھا کہ فقیروں کے بھیس میں اپنے کارندوں کو بھیجا جاتا، وہ مسجدوں، فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس اور ہر اس مقام پر جہاں عوام جمع ہوتے ہیں پہنچ جاتے اور بہت ہی ہوشیاری اور چالاکی سے اس تحریک کا پیغام عوام تک پہنچاتے اور انہیں رفتہ رفتہ بغاوت پر آمادہ کرتے۔

مبارز الدولہ کے زیر قیادت وہابی تحریک صرف حیدرآباد کے حدود اربعہ تک

محدود نہ تھی بلکہ اس کا پھیلاؤ جنوب میں چناپٹن (مدراس) اور کرنول تک تو انکے نمائندے اور ایلچی لاہور، سندھ، گوالیار، بمبئی، شولاپور وغیرہ میں سرگرم عمل تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ربط اور مراسلت ٹونک، رام پور، اودگیر اور کرنول کے نوابوں اور جودھپور، ستارا، پٹیالہ، میسور کے راجوں اور رنجیت سنگھ سے بھی تھی۔ نواب غلام رسول خاں والئ کرنول نہ صرف اس تحریک کے اہم رہنما تھے بلکہ انہوں نے اپنی ریاست میں توپ سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا تاکہ انگریزی فوج کا کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ ایران اور دوست محمد خاں (سندھ) کو بھی بغاوت کی تائید کرنے کے لئے آمادہ کر لیا گیا تھا۔ مذکورہ بالا نوابوں اور راجاؤں سے ربط قائم رکھنے اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھنے کا کام مولوی لعل خاں اور منشی فقیر صاحب کے ذمہ تھا۔ جب اس تحریک کا کوئی نمائندہ خفیہ طور پر دوسرے مقامات پر جاتا تو اس کی شناخت کے لئے لوہے کی انگوٹھی دی جاتی، جس پر چند حروف کندہ ہوتے۔

والئ ریاست ٹونک کے مصاحب نے مبارز الدولہ کے لئے "امیرالمومنین حامئ دین مبین عبدالعزیز مبارز الدولہ" کا لقب نقش نگین تجویز کیا اور اس لقب کی مہر بھی تیار کر لی گئی تھی جو اہم کاغذات پر ثبت کی جارہی تھی۔ خفیہ طور پر ان تمام تیاریوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی فوج کی کئی کمپنیاں بھی اس تحریک کا ساتھ دے رہی تھیں۔ یہ طے پایا تھا کہ جب زار روس اور ایران کی فوجیں دریائے سندھ تک آجائیں تو ایک ساتھ تمام اہم مراکز پر بغاوتیں شروع ہو جائیں۔ راجہ جودھپور اور نواب صاحب نابدار رنجیت سنگھ کی فوج سے مل جائیں اور فرانسیسی افواج کی مدد سے انگریز قلعہ پر حملہ کر دیں۔ اور ستارا کے راجہ ناگپور پر فوج کشی کریں اور حیدرآباد میں مبارزالدولہ بغاوت شروع کر دیں۔ اس پورے پلان کی عمل آوری کا انحصار روس اور ایران کی فوجوں کا سندھ کی سرحد پر جمع ہونے پر تھا، چونکہ اس میں تاخیر ہوتی اور اسی دوران مبارزالدولہ کی نواب صاحب کرنول اور دوسرے امراء سے اس تعلق سے جو خط و کتابت ہو رہی تھی وہ حیدرآباد رزیڈنٹ جے۔ لس فریزر (۱۸۳۸ء-۵۲ء) کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے فوراً نظام کو اس کی اطلاع دی اور مبارزالدولہ کو گرفتار کرکے قلعہ گولکنڈہ کے موتی محل میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے دس وہابی ساتھیوں،

مولانا سلیم، عبدالہادی (لعل خاں)، سید عباس، قاضی محمد عارف، الٰہی بخش (افضل علی خاں)، عبدالرزاق، پیر محمد مولانا، محمد فیض اللہ، منشی فخرالدین (عبدالرحمٰن) اور سید قاسم کو گرفتار کر کے حوالات میں رکھا گیا اور ان پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک کمیشن ۲۰ جون ۱۸۳۹ء میں تشکیل دیا گیا جس کے صدر میجر آرم اسٹرنگ اور دو انگریز افسر تھے۔ نظام حکومت کی جانب سے اعجاز الدولہ، خورشید جنگ اور بے نظیر جنگ کو نامزد کیا گیا۔ اس کمیشن نے اپنا کام مارچ ۱۸۴۱ء تک پورا کر لیا اور مبارز الدولہ پر یہ الزامات لگائے گئے کہ۔

(۱) برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے مبارز الدولہ نے کرنول کے نواب سے مل کر سازش کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے ٹونک، رام پور کے نواب اور دوسرے امراء سے خفیہ خط و کتابت کی۔

(۲) باغی یہ بھی چاہتے تھے کہ آصف جاہ چہارم کو تخت سے اتار کر مبارز الدولہ کو تخت نشین کر دیا جائے اور انہیں سید احمد شہید کا جانشین بنایا جائے۔

(۳) مبارز الدولہ اور ان کے ساتھیوں نے ان انگریز فوج کے مسلمان سپاہیوں میں بغاوت کے خیالات پیدا کئے جو مدراس اور سکندر آباد کی چھاؤنیوں میں رہتے تھے۔

مبارز الدولہ ۱۵ سال تک قلعہ گولکنڈہ میں رہے اور وہیں ان کا ۲۲ جون ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا اور انہیں برہنہ شاہ صاحبؒ کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مبارز الدولہ اور ان کے وہابی ساتھیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جو مبسوط منصوبہ بنایا تھا اگر وہ بروقت پورا ہو جاتا تو ہندوستان کی جنگ کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہوتا۔

مبارز الدولہ کی بغاوت (۱۸۱۵ء-۱۸۳۹ء) میں حصہ لینے یا مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست[1]

---

[1] The Hydrabad State committee, The freedom struggle in Hydrabad. Vol. I (1800-1857). pp. 133-150.

(۱) مولوی سلیم وہ مبارز الدولہ کے بہت ہی قابل اعتماد مشیر اور خاص ساتھی تھے۔ وہ بہت ہی ذکی، ہوشیار اور عالم آدمی تھے۔ وہابی تحریک کو وسعت دینے اور پھیلانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس لئے انہیں بجا طور پر وہابی تحریک کا ایک اہم ستون کہا جا سکتا ہے۔ مبارز الدولہ پر ان کا بے حد اثر تھا۔ برٹش فوج کے سپاہیوں کو انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کے لئے آمادہ کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ انہیں یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی کہ حیدر آباد کے باہر رہنے والے وہابی تحریک کے رہنماؤں سے ربط رکھیں اور ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ان کی باغیانہ مصروفیات کی بنا پر انہیں کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا اور بالآخر انہیں ۱۸ سال کی قید کی سزا دی گئی اور سزا کی مدت ختم ہونے کے بعد انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔

(۲) لعل محمد عرف عبد الہادی وہ انکول (Ankol) برطانوی ہند کے ایک علاقہ کے رہنے والے تھے۔ حیدر آباد آنے کے بعد انہوں نے مبارز الدولہ سے بہت قربت حاصل کر لی اور ان کے سفیر بن کر سندھ گئے، جہاں سے وہ مبارز الدولہ کے لئے خطوط لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں میسور کے راجہ اور رنجیت سنگھ کے نواب سے ملاقات ہوا کرتی تھی اور ان مقامات پر اپنی تحریک کا پرچار کرتے تھے۔ وہ فوج سے آنکھ بچا کر حسین ساگر کے قریب (کیونکہ حسین ساگر کا کنوال مبارز الدولہ کے ساتھ تھا) کہیں رہا کرتے تھے۔ جب فوج کو اس کا پتہ چلا تو وہاں سے منتقل ہو گئے اور مبارز الدولہ کی دیوڑھی میں رہنے لگے۔ ان کے خطوط مسجدوں میں پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ انہیں ۱۴ سال کی سزا دی گئی۔

(۳) مولوی ولایت علی کل ہند وہابی تحریک کے لیڈر سید احمد کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے اور ان ہی کی ہدایت پر مولوی صاحب کو وہابی تحریک کی تبلیغ کے لئے حیدر آباد بھیجا گیا تھا۔

(۴) سید عباس وہ قندھار (برطانوی ہند) کے ایک علاقہ کے باشندے تھے اور مبارز الدولہ کے یہاں بہت دنوں تک ایک استاد کی حیثیت سے رہا کرتے تھے۔ مبارز الدولہ نے انہیں اپنا قاصد بنا کر کئی مقامات پر بھیجا تھا۔ وہابی تحریک کے وہ ایک قابل بھروسہ رکن سمجھے جاتے تھے اور مبارز الدولہ کے بھی با اعتماد ساتھی تھے۔ انہیں بھی ۱۴ سال کی سزا دی گئی

(۵) قاضی محمد آصف وہ اندور کے قاضی تھے جہاں انہوں نے وہابی تحریک کا زبردست پرچار کیا، جس کی وجہ سے وہاں کافی ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس بنا پر انہیں قاضی کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد آ گئے اور مبارز الدولہ کے یہاں نوکری کر لی۔ پھر انہیں قاصد بنا کر سندھ بھیجا گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ سکندر آباد کی چھاؤنی میں رہنے لگے۔ ان کی باثر شخصیت کی وجہ مبارز الدولہ کے دربار میں وہابی تحریک کا بڑا گہرا اثر تھا۔ چونکہ وہ بہت عمر رسیدہ تھے اس لئے انہیں رعایتاً ۱۲ سال کی سزا دی گئی۔

(۶) الٰہی بخش عرف افضل علی خاں تھانہ دمہالاتش کے رہنے والے تھے۔ وہ مبارز الدولہ کے ملازم تھے اور ان کے تحت محکمہ راز دیا گیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ خفیہ طور پر شاہ ولی خاں جمعدار کرنول سے ربط قائم رکھیں۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے وہ اکثر سفر کرتے تھے لیکن یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان کے سفر کے تمام اخراجات مبارز الدولہ برداشت کرتے تھے۔ وہ ایک قابل اور بہت تیز آدمی تھے۔ اپنے فرائض بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے انجام دیتے۔ انگریزوں کو پریشان کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے ہتھکنڈے 'اچھے' 'برے' استعمال کرتے تھے۔ انہیں ۱۴ سال کی سزا دی گئی۔

(۷) مولوی عبدالرزاق حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ وہ مبارز الدولہ کے قدیم ملازم تھے اور مولوی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی اہم ذمہ داری یہ تھی کہ انگریز سپاہیوں میں وہابی تحریک کا پرچار کریں۔ وہ یہ کام عام طور پر مسجدوں میں انجام دیتے تھے۔ ان کے ایک خط سے جو تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش ہوا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ برار سے تین ہزار لوگ وہابی تحریک میں شریک ہونے حیدر آباد آئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت وہابی تحریک عوام میں کتنی مقبول تھی۔ انہیں بھی ۱۴ سال کی سزا دی گئی۔

(۸) پیر محمد مولانا ان کا تعلق بھی حیدر آباد سے تھا اور مبارز الدولہ کے ملازم تھے۔ وہ بڑے قوی، راسخ الخیال اور بہت ہی متصف قسم کے آدمی تھے۔ جب پولیس انہیں گرفتار کرنے آئی تو انہوں نے کئی پولیس والوں کو زخمی کر دیا۔

وہ قاضی آصف کے ساتھ سندھ گئے تھے جہاں سے مبارز الدولہ کے خطوط لایا کرتے تھے۔ انہیں بھی ۱۴ سال کی سزا دی گئی۔

(۹) محمد فیض اللہ حیدر آباد کے باشندے اور مبارز الدولہ کے ملازم تھے۔ وہ "مہر بردار" کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان پر مبارز الدولہ کی مہر کندہ کرنے کا سنگین الزام لگایا گیا تھا۔ اس کی پاداش میں انہیں ۱۴ سال کی سزا ہوئی۔

(۱۰) منشی فخر الدین نیلور کے رہنے والے تھے۔ مختصر مدت کے لئے مبارز الدولہ کے یہاں ملازم رہے۔ عبد الہادی کے ساتھ وہ بمبئی گئے اور وہاں سے کچھ خطوط لائے۔ وہ ایک مولوی کے بھیس میں مبارز الدولہ کے ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس لئے انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں ۱۴ سال کی سزا سنائی گئی۔

(۱۱) سید قاسم حکیم مبارز الدولہ کے ملازم تھے۔ وہ بھی قاضی آصف کے ساتھ سندھ گئے اور جب واپس ہو رہے تھے تو انہیں شولاپور میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں انہیں ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔

(۱۲) امام خاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ دکن کے مختلف شہروں کا بھیس بدل کر دورہ کریں، اہم معلومات جمع کریں اور پھر مقرر کردہ ایجنٹ کے پاس روانہ کر دیں۔ یہ ایجنٹ ان معلومات کی تصدیق کرنے کے بعد مبارز الدولہ کے قاصدوں جو تنگبھدرا اور کرشنا میں رہتے تھے، کو روانہ کریں۔ ان کی اطلاعات کی بموجب بھوپال کے نواب اور حسین ساگر کے کوتوال سے مبارز الدولہ کی گہری دوستی تھی۔ ان کے ذریعہ برطانوی فوجوں کو بغاوت کے لئے اکسایا جاتا تھا۔

(۱۳) شیخ عبد اللہ ان کے ذمہ بھی خفیہ طور پر معلومات اکٹھا کرنا تھا جو عام طور پر حیدر آباد سے نیلور جایا کرتے تھے اور وہاں سے راز کے خطوط لا کر نواب صاحب کے حوالے کر دیتے۔ بعض خطوط میں چنا پٹنم (مدراس) کے عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کے لئے تیار رہیں۔ اس طرح کئی افراد مختلف شہروں میں خفیہ طور پر کام کرنے اور معلومات جمع کرنے کے کام پر

مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں قابل ذکر محمد بھائی، جمال خاں وغیرہ تھے۔

(۱۴) بھیم داس سکھ تھے اور فتح گنج کے رہنے والے تھے۔ وہ فقیروں کا بھیس ڈال کر جاسوسی کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ کئی دنوں بعد انہیں پہچان لیا گیا اور نومبر ۱۸۳۸ء کو نیلور میں گرفتار کیا گیا۔ انہوں نے تحقیقاتی کمیشن کے سامنے جو بیان دیا وہ بہت اہم تھا جس سے کئی واقعات اور حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے بموجب وہ اس مقصد سے مہاراجہ جودھ پور کی طرف سے بھیجے گئے تھے کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے تمام راجاؤں اور نوابوں کو متحد کریں۔ ان کے بیان کے مطابق اس مہم میں سب سے پہلے مہاراجہ جودھ پور شریک ہوتے اور ان کے بعد مبارز الدولہ کا نام آتا ہے۔ پھر انہوں نے جن ناموں کا ذکر کیا تھا انہیں سلسلہ وار لکھا گیا ہے۔ (۳) ستارکا راجہ (۴) گائیکواڑ کے راجہ (۵) باندا کے نواب (۶) افغانستان کا شہزادہ جو روہیل کھنڈ میں مقیم تھا (۷) مان سنگھ (۸) ساگر کے پرنس (۹) پٹیالہ کے راجہ (۱۰) بھوپال کے نواب۔ اس سکھ کا کہنا تھا کہ مذکورہ بالا تمام راجہ اور نواب انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ لیکن ان کے پاس اتنی فوجی طاقت اور ہمت نہ تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع کریں۔ اس لئے وہ تمام اس امید میں بیٹھے تھے کہ روس اور ایران کی فوجیں ہندوستان کی سرحد پر آجائیں تو پھر وہ علم بغاوت بلند کردیں گے اور نواب مبارز الدولہ کو بھی اس کا انتظار تھا۔

(۱۵) مولوی شجاع الدین وہ بہت ہی قابل اعتماد افراد میں سے ایک تھے۔ کرنول کے نواب کے بڑے مداح تھے۔ پھر وہ مبارز الدولہ کے ساتھ ہو گئے۔ کمیشن کے سامنے اپنے بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ بہت سے لوگ بظاہر انگریزوں کے طرف دار معلوم ہوتے ہیں لیکن اندرونی طور پر ان کے سخت خلاف ہیں۔ ایسے لوگوں میں شاہ شجاع بھی تھے جن کی مبارز الدولہ سے مراسلت تھی۔ ان کے علاوہ نواب عظیم الدین سراج الدولہ (منیر الملک کے فرزند) کچھ امراء بھی ان ہی کے خیالات کے حامی تھے۔

(۱۶) رحمان بیگ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں ملازم تھے لیکن انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور نظام کے دربار میں

ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے بیان کے مطابق رنجیت سنگھ نے چھ مہینے کی مدت میں ایک ہزار فوج مبارز الدولہ کے لئے روانہ کی تھی جو روزانہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں شہر میں داخل ہوتے تھے۔ مبارز الدولہ کے پاس جتنی افواج تھیں انکی تفصیلات انہوں نے یہ بتلائی تھیں۔

ایک ہزار عرب، ۴ ہزار سواروں کا دستہ اور اتنی ہی پیادہ فوج۔ الوال میں مقیم انگریز فوجوں کی آٹھویں رجمنٹ مبارز الدولہ کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھی۔ بھدر اچلم اور پالونچہ کے زمیندار بھی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھے۔ اس فوجی تیاری کی بنا پر مبارز الدولہ انگریزوں پر فوجی حملہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مصلحتاً کچھ دن اور انتظار کرنا چاہتے تھے۔

(۱۷) غلام احمد ولد سلطان بخش وہ پامر اینڈ کمپنی میں ملازم تھے بعد میں انہوں نے مبارز الدولہ کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ انہیں کرناٹک روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہاں وہ خفیہ طور پر عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ وہ اسی مقصد سے بمبئی، جودھپور، گوالیار، بھوپال، کلکتہ، مدراس اور کرنول بھی گئے تھے جہاں انہوں نے اہم مقامی اصحاب سے ملاقات کی اور انہیں اپنا ہم خیال بنایا۔ آخرکار انہیں نیلور میں گرفتار کر لیا گیا۔

(۱۸) خان عالم اودگیر کے نواب تھے۔ وہ چنا پٹنم کے حکمراں، ٹونک کے نواب اور کرنول کے نواب کے رشتہ دار تھے۔ مبارز الدولہ سے گہری دوستی تھی اور ان دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔

(۱۹) عباس علی خاں اودگیر کے زمیندار تھے۔ اودگیر کرناٹک کا ایک دور دراز اور غیر معروف علاقہ تھا۔ یہاں کا قلعہ بہت مضبوط، بڑے محفوظ مقام پر اور فوجی نقطۂ نظر سے بہت موزوں اور اہم تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ طے کیا گیا تھا کہ اس قلعہ کو فوجی بغاوت کا مرکز بنایا جائے۔ چنانچہ یہاں گولہ بارود اور اناج کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ عباس علی خاں اس قلعہ کے نگراں کار تھے اس جرم میں ان کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور انہیں کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

(۲۰) رحمت اللہ خاں وہ اودگیر کے زمیندار عباس علی خاں کے دوست

اور خود بھی ایک جاگیر دار تھے۔ ان کی مبارز الدولہ سے مراسلت ہوا کرتی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق پہلے مرحلہ کے طور پر فوجیں کرنول میں جمع ہوں گی۔ جس کی کمان خود مبارز الدولہ کریں گے۔ بغاوت کی جو اسکیم بنائی گئی تھی اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اور انکا صلاح و مشورہ بھی شامل تھا۔

کرنول کے نواب کی بغاوت ۱۸۳۹ء[1]

جنوبی ہند میں کرنول کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں وہابی تحریک کے زیر اثر شروع کی گئی بغاوتوں کا وہ ایک اہم مرکز رہا۔ کرنول کے نواب غلام رسول خاں، ریاست حیدرآباد کے شاہی باغی مبارز الدولہ کے قریبی اور قابل اعتماد رفیق کار تھے۔ کرنول کی تاریخ میں کئی اتار چڑھاؤ آئے اور وہ کئی ریاستوں اور حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ دور قدیم میں یہ راجگان ورنگل کی عملداری میں تھا۔ ۱۴ ویں صدی عیسوی میں بیجانگر کا حصہ بن گیا۔ ۱۵۶۵ء میں بیجاپور کے سلاطین نے اس پر قبضہ کر لیا اور عادل شاہی سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا گیا

اورنگ زیب کے ایک سربرآوردہ عہدیدار غیاث الدین خاں نے کرنول پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام بدل کر قمر نگر رکھا۔ ۱۷ ویں صدی کے آخری برسوں میں کرنول کو بحیثیت ایک جاگیر داود خاں کو، جو ایک نامور پٹھان جنرل تھے۔ عطا کی گئی۔ ۱۷۴۴ء میں مبارز خاں اور ابراہیم خاں اور آصف جاہ اول کے درمیان جنگ ہوئی جس میں کرنول کے نواب کے دونوں بھائی مارے گئے۔ ۱۷۹۲ء میں الف خاں کو کرنول کا نواب بنایا گیا اور ٹیپو سلطان نے انہیں خلعت عطا کی۔ سری رنگا پٹنم کی فتح (۱۷۹۹ء) کے بعد انگریزوں نے کرنول کو نظام کے حوالے کر دیا۔ لیکن ایک ہی سال بعد نظام نے سب سیڈیری فوج کے اخراجات کی پابجائی کے لئے کرنول کو دوبارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو واپس کر دیا۔

الف خاں ثانی (۱۷۹۱ء) کے بعد مظفر خاں (۱۸۲۳ء) کرنول کے نواب تھے اور پھر ان کے چھوٹے بھائی غلام رسول خاں کو کرنول کا نواب (Nawab) بنایا گیا۔ یہ وہ

---

1. The Hydrabad state committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol I (1800 - 1857) P/26.

زمانہ تھا جب جنوبی ہند کے اکثر علاقوں میں انگریز دشمن وہابی تحریک کا زور تھا۔ اور جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ نواب غلام رسول خاں بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار کے خاتمہ کے لئے سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ انہوں نے کرنول میں توپ سازی کا کارخانہ قائم کیا جس میں سمجھا جاتا ہے کہ ایک ہزار توپ تیار کی گئی تھیں۔ توپوں کے لئے ایک لاکھ روپے کی بارود داود گیر اور مدراس سے خریدی گئی تھی۔ توپ سازی پر اس لئے زور دیا گیا تھا کہ اس زمانہ میں توپ ایک بہت موثر اور طاقتور ہتھیار سمجھی جاتی تھی۔

اُس اثنار میں بغاوت کی تیاریوں کے سلسلے میں مبارز الدولہ کی کرنول کے نواب اور دوسرے رجواڑوں سے جو خط و کتابت جاری تھی اس کا پتہ حیدر آباد کے رزیڈنٹ کو ہو گیا۔ اس بنار پر کرنول کے نواب کو حکومت سے علیحدہ کر کے نظر بند کرنے کی کارروائی شروع کی گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد انگریز فوجوں نے کرنول کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور غلام رسول خاں کو مجبور کیا گیا کہ وہ قلعہ خالی کر دیں اور اپنی جمعیت کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔ ان کے پاس اس کے سوائے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا کیونکہ انگریز فوج نہ صرف تعداد میں زیادہ تھی بلکہ وہ جدید قسم کے ہتھیاروں سے بھی لیس تھی۔ انگریزوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ نواب صاحب کو قلعہ خالی کر کے چلے جانے کا موقع دیں گے لیکن انہوں نے وعدہ خلافی کی اور ان کی فوجوں کا تعاقب کیا اور ان کے سپاہیوں کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور نواب غلام رسول خاں کو گرفتار کر کے مدراس روانہ کیا گیا۔ راستہ میں انگریزوں کے ایجنٹ نے انہیں قتل کر دیا۔ انکی پوری جائداد اور جواہرات وغیرہ ضبط کر لئے گئے اور کرنول کو ۱۸۳۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقے میں شامل کر لیا گیا۔

کرنول کے عوام اس بغاوت کے بعد بھی جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسوں میں ابتداء ہی سے شریک ہوا کرتے تھے اور کانگریس کا جو اجلاس ۱۸۸۹ء میں بمبئی میں ہوا تھا اس میں کرنول کے ۲۲ اصحاب نے شرکت کی تھی۔

مقامی بغاوتیں

۱۸۱۸ء ـــــ ۱۸۴۱ء

مبارز الدولہ اور کرنول کے نواب کی بغاوتیں لگ بھگ اسی زمانہ میں ہوئیں جو راجہ چندر لعل کی پیش کاری اور دیوانی کا دور تھا جس کا اختتام ۱۸۴۳ء کو ہوا۔ اپنے اس ۲۵ سالہ دور میں انہوں نے ایک ایسا حیدر آباد چھوڑا جس کا روہیلوں، عربوں اور پامر اینڈ کمپنی کے کثیر قرضوں کی وجہ سے دیوالیہ نکل چکا تھا۔ آصف جاہی حکمرانوں کی حیثیت کمپنی سرکار کے باجداروں کی سی ہوگئی تھی اور نظم و نسق کے نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔

ان افسوسناک حالات میں ریاست کے مختلف حصوں میں مقامی بغاوتوں کا پھوٹ پڑنا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۱ء کی درمیانی مدت میں مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ کے اکثر اضلاع میں مقامی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کا تاریخ وار ذکر آئندہ صفحات پر پیش کیا جائے گا۔

اورنگ آباد میں بغاوتیں

اورنگ آباد کئی حیثیتوں سے اس علاقہ کا ایک اہم تاریخی مرکز رہا ہے۔ اسی ضلع میں ایلورہ اور اجنتا کے مشہور عالم غار ہیں، اورنگ زیب جب دکن کے وائسرائے بنائے گئے (۱۶۳۵ء) تو انہوں نے اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا۔ آصف جاہ اول نے ۱۷۲۴ء میں آصف جاہی سلطنت کی بنیاد یہیں رکھی اور ۱۷۶۱ء تک آصف جاہی بادشاہوں کا دارالسلطنت رہا۔ اور ریاست حیدر آباد میں صرف اورنگ آباد ہی کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ یہاں انگریزوں کے خلاف وقفہ وقفہ سے تین بغاوتیں ہوئیں۔ غرض یہ کہ اورنگ آباد سابق ریاست حیدر آباد کے مرہٹواڑہ علاقہ کا سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی مرکز رہا۔

اسی علاقہ کا ایک شہر پٹن (Paithan) تو قبل مسیح زمانہ میں ایک اہم تہذیبی مرکز رہا۔ جو بعد میں آندھرا راجہ پلوماجی (دوم) (Pullumaji)

(۱۲۸ — ۱۷۰ A.D.) کا دارالسلطنت بھی رہا۔ پھر یہ ضلع چالوکیہ، راشٹراکوٹا اور یادو راجوں کے زیر نگرانی بھی رہا۔[1]

بھیلما (Bhillama) اول پہلا راجہ تھا جس نے ۱۱۸۷ء میں دولت آباد اور ناسک کے درمیانی علاقے میں پہلی آزاد ریاست قائم کی جس کا صدر مقام دیوگیری تھا۔ ۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی دکن پر حملہ آور ہوا اور یادو راجہ رام چندر کو شکست دی اور ۱۳۰۷ء میں ملک عنبر کے حملہ کے بعد یادو راجوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۳۴۷ء میں یہ ضلع بہمنی سلطنت اور ۱۴۹۹ء میں احمد نگر ریاست کا حصہ رہا۔ ۱۶۰۰ء میں مغل شہزادہ دانیال نے احمد نگر کو فتح کر لیا۔ لیکن احمد نگر کے وزیر ملک عنبر نے مغلوں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں اور ۱۶۱۰ء میں موضع کھارکی (Kharki) کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام فتح نگر رکھا۔ جب اورنگ زیب کو دکن کا وائسرائے بنایا گیا تو اس نے کھارکی کا نام بدل کر اورنگ آباد کر دیا۔[2]

۱۸۱۸ء اور ۱۸۱۹ء کے دوران بیڑ، ناندیڑ اور اورنگ آباد کے اضلاع میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پہلے ہم ضلع اورنگ آباد میں بھیل (Bhil) بغاوت کا ذکر کریں گے۔ اور پھر بیڑ اور ناندیڑ کی بغاوتوں کا۔

ضلع اورنگ آباد میں پہلی بھیل بغاوت ۱۸۱۹ء[3]

ہٹ کرناٹک قبیلہ کی بغاوت ۱۷۹۸ء سے ناندیڑ میں شروع ہو چکی تھی اور لگ بھگ اسی زمانہ میں حیدرآباد کے مشرقی علاقوں یعنی سرونچہ (Sironcha) اور مہادیوپور میں کوناراؤ کی قیادت میں چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا کوناراؤ ایک بڑے علاقے کے اہم زمیندار اور سردیسائی تھے جنہوں نے ۳۰ سال سے

---

[1] Imperial Gazetteer of India (Provincal Services) Hydrabad state, 1909.

[2] The Nizams Govt; A Gazetteers of Aurangabad, 1884.

[3] The Hydrabad state committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol I (1800-1857) PP 97-100

علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ آخر کار ۱۸۱۹ء کے اوائل میں میجر پٹ من (Pit man) نے اس بغاوت کو کچل دیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کونا راؤ نے یہ محسوس کیا کہ نظام کی فوجوں کا مقابلہ کرنا اب ان کے بس کی بات نہیں اس لئے انہوں نے متعلقہ ریاستی وزیر سے راست بات چیت کے ذریعہ اس مسئلہ کی یکسوئی کر لی۔ اور وہ ایک راہب بن کر حیدر آباد شہر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ جن لوگوں نے اس بغاوت میں حصہ لیا تھا انہیں کونا راؤ نے ۳۰ روپے دیئے۔ جو اس زمانے کے لحاظ سے بیلوں کی ایک جوڑی، ہل اور تخم خریدنے کے لئے کافی تھے۔ تاکہ لوگ کھیتی باڑی شروع کر کے اپنی زندگی بسر کریں۔

اس سال بھیل قبیلے کے ایک اور سردار چل نائک (Chil Naik) کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ۱۸۱۹ء میں اجنتا کی پہاڑیوں میں فوج بھیجی گئی۔ پتیل واڑی کا قلعہ اور بغاوت کے دوسرے اہم مرکزوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ چل نائک کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن اس قبیلے کے لوگ اتنی آسانی سے اپنی ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ اس قبیلے کے دو اور سردار جنڈھولہ (Jandhula) اور جاکرہ نے میدان سنبھال لیا۔ انہوں نے چل نائک کا بدلہ لینے کے لئے سارے میدانی علاقے میں تباہی مچا دی۔ ان حملوں کو کچلنے کے لئے اجنتا کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک سو میل کا طویل فوجی گھیرا ڈالا گیا۔ اور جنڈولہ اور جاکرہ کے علاوہ ان کے بارہ سو ساتھیوں کو ہتھیار ڈال دینے اور اپنے کو فوج کے حوالے کر دینے پر مجبور کیا گیا (۱۸۲۱ء)۔[1]

ضلع اورنگ آباد میں دوسری بھیل بغاوت ۱۸۲۲ء

مرہٹہ جنگ (۱۸۱۸ء) کے بعد اورنگ آباد کے دو تعلقے کنڑھ اور وینرا پور مرہٹوں کے کنٹرول سے نکال کر حیدر آباد کے تحت کر دیئے گئے۔ یہ تعلقے اور اجنتا کی پہاڑیوں میں واقع بھوکر دھن اور سکڑہ کے تعلقے بھیل قبیلوں کے مضبوط گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ اس جنگجو قبیلے نے ۳۵ سال تک (۱۸۲۲ء - ۱۸۵۷ء) نظام سرکار کے خلاف اپنی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کنٹنجنٹ فوج کو جو اورنگ آباد اور کنڑھ میں رکھی گئی تھی۔ کو بھیل

---

[1] H. H. The Nizam's Govt; A Gazetteer of Aurangabad. 1884.

بغاوتوں کو کچلنے کے لئے بروقت استعمال کیا جاتا رہا۔

اس سے پہلے ہم نے ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۱ء کی بھیل بغاوتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ چند مہینوں کے عارضی امن کے بعد پھر ہیرا نامی ایک بھیل سردار کی رہنمائی میں ایک اور بغاوت ۱۸۲۲ء میں ہوئی۔ چنانچہ ان باغیوں کا پیچھا کرنے ۸ فروری ۱۸۲۲ء کو کیپٹن کلارک کا ایک رسالہ بھیجا گیا اور پھر مئی اور جولائی میں "اورنگ آباد ڈویژن" روانہ کی گئی۔

بھیل قبیلوں کی ان مسلسل بغاوتوں کی روک تھام کرنے اور انہیں بغاوتوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے انگریزوں نے ایک چال چلی اور یہ تجویز رکھی کہ وہ میدانی علاقوں میں آباد ہو کر کھیتی باڑی شروع کر دیں اور اس اسکیم کو کامیاب بنانے کیلئے ۴۰ گاؤں کے قریب اجنتا کے بھیلوں کی ایک ایجنسی بھی بنائی گئی۔ لیکن ان کی یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ چنانچہ ۱۸۳۰ء میں کنڑہ اور گوئلا پہاڑیوں میں لوٹ مار اور سرکشی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ کئی برسوں تک کنڑہ کے قریب انگریز فوج رکھی گئی اور ایک انگریز افسر کو ایجنٹ کی حیثیت سے وہاں مقرر کیا گیا۔ آخر کار ۱۸۴۰ء میں ان علاقوں سے انگریز فوجوں کو ہٹا لیا گیا اور کچھ برسوں بعد بھیل ایجنسی بھی برخاست کر دی گئی۔

کنٹنجنٹ فوج میں بے چینی اور ذوالفقار علی بیگ کا مقدمہ ۱۸۵۱ء

اورنگ آباد میں مقیم کنٹنجنٹ فوج میں ۱۸۵۱ء میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ اس بے چینی کے پیچھے وہاں مقیم گھوڑ سوار فوج کے صفوں میں درجہ بندی کے مسئلہ پر اختلافات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ گھوڑ سواروں کے دو درجے تھے۔ سلحدار اور بارگیر۔ سلحدار اپنے گھوڑوں کا مالک سمجھا جاتا تھا جس کو وراثت میں ملنے اور جن کو وہ فروخت بھی کر سکتے تھے۔ اسی بناء پر سماج میں ان کا ایک خاص مرتبہ تھا اور انہیں با اثر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے انہیں اشراف کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف

---

1. The Hydrabad State committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol I (1900 – 1957) PP 198-202

بارگیر (Bargheer) تھے جو گھوڑ سوار تو کہلاتے تھے لیکن وہ ان گھوڑوں کے مالک تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ مگر گھوڑ سواروں کے ان دو درجوں میں سماجی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ عام طور پر ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے اور بارگیر ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتے کہ وہ بھی گھوڑا خرید سکیں اور آبائی ملکیت بنانے کے قابل بن سکیں۔

اورنگ آباد کمانڈنگ آفیسر کیپٹن یاٹس (Yeats) نے یہ حکم دیا کہ انکی رجمنٹ کے ادنیٰ درجے کے مسلمانوں کی فہرست تیار کی جائے، انہوں نے یہ حکم اس بناء پر دیا تھا کہ انکا یہ خیال تھا کہ بارگیر درجے کے کچھ گھوڑ سوار اعلےٰ درجے میں شامل ہوگئے ہیں جو ان کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ آئندہ اس قسم کی غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔

اس حکم کے تعلق سے سلحدار میر ذوالفقار علی بیگ نے جو خود (۲۷) گھوڑوں کے مالک تھے۔ یہ اعتراض کیا کہ اس طرح کی امتیازی فہرست کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ لیکن انکے اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

اس حکم کے خلاف رجمنٹ میں بھی بے چینی پھیل گئی کیونکہ سپاہیوں کی اکثریت ایسی فہرست بنانے کے سخت خلاف تھی۔ کیپٹن یاٹس نے یہ سمجھا کہ اس بے چینی کے پیچھے اور اس کو پھیلانے کے ذمہ دار ذوالفقار علی بیگ ہیں۔ چنانچہ انہیں گرفتار کرلیا گیا' جیل میں قید کردیا گیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم صادر کردیا گیا۔ اس رجمنٹ کے کافی انگریز آفیسر بیگ صاحب کی تائید میں تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر مقدمہ اورنگ آباد میں چلایا جائے تو بیگ صاحب کو انصاف نہیں مل سکے گا۔ اس لئے انہوں نے نمائندگی کی کہ یہ مقدمہ کسی یوروپین آفیسر کی نگرانی میں بلارم فوجی چھاؤنی میں چلایا جائے۔ آخرکار یہ مقدمہ اپریل ۱۸۵۲ء میں اختتام کو پہنچا اور ذوالفقار علی بیگ کو باعزت طور پر رہا کردیا گیا۔

اورنگ آباد میں
۱۸۵۷ء کی بغاوت

اورنگ آباد میں فوجی بغاوت جون ۱۸۵۷ء

The Hydrabad State committee, the freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800 - 1857) PP 198 - 202

سے ۴ سال پہلے ایک اور واقعہ پیش آیا۔ دیول گاؤں کے راجہ مان سنگھ راؤ کی ملازمت میں جو عرب تھے انہوں نے اپنے راجہ کو حراست میں لے لیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ان کی تنخواہوں کا بقایا فوراً ادا کیا جائے ورنہ راجہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ عربوں نے اورنگ آباد شہر کے روشن دروازہ کے باہر جسونت پورہ میں مورچہ سنبھال لیا۔ برگیڈیر مے نی (Mayne) کی سرکردگی میں اورنگ آباد کی فوج باغیوں کی سرزنش کے لئے ۲۲ ستمبر ۱۸۵۳ء کو بھیجی گئی۔ عرب باغیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بڑی مشکل سے اورنگ آباد میں مقیم عربوں کو باغیوں کا ساتھ دینے سے روکا گیا۔ عربوں نے دیواروں کے پیچھے سے شدید گولہ باری کی، جسکی وجہ طرفین کو کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ لیکن اس کا علم نہ ہو سکا کہ ان غریب عربوں کا کیا حشر ہوا۔

اورنگ آباد میں ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت ریاست حیدرآباد کی پہلی اہم اور سنگین نوعیت کی بغاوت سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس بغاوت میں حصہ لینے والے کئی باغی سپاہیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ درجنوں کو گولی مار دی گئی اور توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا گیا اور سیکڑوں کو مختلف مدت کے لئے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

اس اہم بغاوت کے چند مہینے پہلے حیدرآباد شہر میں سیاسی تناؤ انتہائی عروج پر تھا۔ سکندرآباد اور بلارم میں مقیم کنٹنجنٹ فوج کو بغاوت کے لئے ورغلایا جا رہا تھا۔ یہ خبریں اورنگ آباد کے فوجی حلقوں میں پھیل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ شمالی ہند میں بغاوت کی ابتدائی کامیابیوں کی ہمت افزا خبریں بھی آ رہی تھیں۔ ان تمام خبروں کا ردعمل اس لئے بھی شدید ہوا کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج میں اودھ اور شاہجہاں پور کے سپاہی کافی تعداد میں تھے جن میں پہلے ہی سے انگریز دشمن جذبات پائے جاتے تھے۔

ان حالات اور محرکات کے پس منظر میں اورنگ آباد میں ۱۲ جون ۱۸۵۷ء کو گھوڑ سوار فوج میں بغاوت ہو گئی۔ ان باغی سپاہیوں کا یہ کہنا تھا کہ انہیں دکن کے علاقہ کی فوجی خدمات کے لئے بھرتی کیا گیا ہے۔ اس لئے گھوڑ سوار فوج کے ہندو اور مسلم سپاہیوں نے یہ عہد کیا کہ "وہ دکن کے باہر نہیں جائیں گے اور اپنے بادشاہ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔" ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ شمالی ہند کے باغیوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ بغاوت کی یہ لہر تیزی سے گھوڑ سوار فوجوں کے مختلف رجمنٹوں میں پھیل گئی اور جب انہیں "بارک" سے نکل کر آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے

صاف انکار کر دیا۔ جب جنرل وڈ برن نے پریڈ کے موقع پر رسالدار کو حکم دیا کہ وہ ان سپاہیوں کے نام سنائیں جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا اور اس فہرست میں جمعدار امیر خاں کا نام بھی تھا۔ اس پر امیر خاں برافروختہ ہوئے اور کہا کہ "یہ بہت ہی نامناسب بات ہے اور سب جھوٹ کا پلندا ہے" اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنی بندوق کے ساتھ تیار ہو جائیں۔

اسی طرح جب کیپٹن ایبٹ (Abbott) نے ایک رسالدار کو باغی سپاہیوں کے نام سنانے کو کہا تھا تو میر فدا علی نامی دفعدار اپنی قطار سے باہر آیا اور اپنے پستول سے ایبٹ پر گولی چلا دی لیکن نشانہ خطا ہوا۔ اس دفعدار کو فوراً گرفتار کر لیا گیا اور رات میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد رسالداروں، جمعداروں اور کئی سپاہیوں کے ہتھیار چھین لئے گئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مومن آباد میں ایک دفعدار اور ۶ سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

گرفتار شدہ سپاہیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا گیا اور جو غیر انسانی طریقہ اختیار کیا گیا اس کا اظہار انگریز افسروں نے فخریہ انداز میں اس طرح کیا "دوسرے دن صبح جنرل وڈ برن کے سپاہیوں کی پریڈ ہوئی تو قیدی سپاہیوں کو باہر لایا گیا۔ فوجی طبل بجا کر ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ کچھ کو رسیوں کی مدد سے توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا گیا کئی سپاہیوں کو پھانسی کے تختوں پر لٹکا دیا گیا اور ان کے سامنے سے گھوڑ سواروں کو مارچ کرایا گیا۔ یہ سارا شرمناک "تماشہ" ایک کثیر مجمع کے سامنے کیا گیا، جو اس موقع کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا تاکہ وہ خوف زدہ ہوں اور عبرت حاصل کریں۔

جن باغی سپاہیوں پر مقدمہ (چند دنوں کے لئے) چلایا گیا اور جس طرح کی انہیں سزائیں دی گئیں وہ بھی ایک دردناک داستان ہے جس کو ایک فوجی افسر اس طرح بیان کرتا ہے "بغاوت کے ابتدائی مرحلہ میں ۹۴ سپاہیوں کو قید کر لیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر مقدمات کا فیصلہ کر دیا گیا۔ ایک کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چار کو گولی مار دی گئی اور ایک کو توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔ جو ایک ہولناک منظر تھا۔ اس کا سر ۲۰ گز ہوا میں اچھل گیا۔ اس کے ہاتھ دونوں طرف ۸ گز دور جا گرے۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ انہوں نے کس خاموشی اور استقلال سے یہ خبر سنی کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" جس سپاہی کو توپ سے اڑا دیا گیا اس نے صرف اتنا کہا کہ "اس کے خلاف جس نے

گواہی دی اس کو دوسری دنیا میں جواب دینا ہوگا۔" اور جس سپاہی کو سولی پر لٹکانے کی سزا سنائی گئی تھی اس نے کہا "میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھوکر اپنے تمام گناہوں کو بھی دھو رہا ہوں۔ اب جتنی جلد جنت میں پہنچوں اتنا ہی اچھا۔" یہ تھا آہنی عزم، یقین محکم اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے قربانی پیش کرنے کا متبرک جذبہ ہمارے مجاہدین آزادی کا!

اورنگ آباد کی بغاوت کا سب سے اہم رہنما جمعدار چیتا خان تھے جو کسی طرح انگریز افسروں کی چنگل سے بچ نکلا اور شہر حیدرآباد پہنچ گیا جہاں اس کی گرفتاری کے لئے ہزاروں روپیوں کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اس کو گرفتار کر لیا گیا اور یہی گرفتاری برٹش رزیڈنسی پر حملہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اورنگ آباد کی بغاوتوں میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست[1]

(چونکہ ان کے حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا اس لئے انہیں جو سزا دی گئی اس کا ذکر کیا گیا ہے)

(۱) جمعدار چیتا خاں

(۲) جمعدار امیر خاں

(۳) دفعدار میر فدا علی۔ — انہوں نے اپنے پستول سے گھوڑ سوار فوج کے کیپٹن ایبٹ پر فائر کر دیا۔ نشانہ خطا ہو گیا۔ انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور پھانسی کی سزا دی گئی۔

(۴) مودی خاں۔ — گھوڑ سوار فوج کے باغی۔ ان تمام اصحاب کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں گولی مار دی گئی۔

---

[1] The Hydrabad state committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol. II (1857 – 1885) PP. 22, 43.

(۵) جاں باز خاں۔	گھوڑسوار فوج کے بارگیر۔ ان تمام اصحاب کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں گولی مار دی گئی
(۶) شیخ رحیم	〃 〃 〃 〃 〃
(۷) محمد میر خاں اوّل	〃 〃 〃 〃 〃
(۸) محمد میر خاں دوم	گھوڑسوار کے بارگیر 〃 〃 〃
(۹) شیخ فتح محمد	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۰) محمد رضا	گھوڑسوار کے ترمچی 〃 〃 〃
(۱۱) دلاور خاں	گھوڑسوار کے بارگیر 〃 〃
(۱۲) شیخ حسین	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۳) مرزا عظیم بیگ	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۴) حسین خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۵) شیخ ملک	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۶) احمد خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۷) میر مظہر علی	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۸) نور خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۱۹) میر امام علی	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۰) میر بدر علی	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۱) میر عابد علی	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۲) قاسم علی خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۳) فیض محمد خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۴) عبداللہ خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۵) محمد عمر خاں	گھوڑسوار فوج کے سوار 〃 〃 〃
(۲۶) سوائی خاں	〃 〃 〃 〃 〃
(۲۷) یٰسین خاں	〃 〃 〃 〃 〃

(۲۸) گل محمد خاں — گھوڑسوار فوج کے سوار۔ ان تمام اصحاب کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں گولی مار دی گئی۔

(۲۹) راز دار خاں
(۳۰) کرم خاں
(۳۱) گل محمد خاں دوم
(۳۲) عباس علی خاں
(۳۳) نبی خاں
(۳۴) غوث داد خاں
(۳۵) سلیم خاں
(۳۶) احمد خاں
(۳۷) سید جعفر
(۳۸) سید حنیف
(۳۹) میر عثمان علی
(۴۰) کرم خاں دوم
(۴۱) دلدار خاں
(۴۲) ہوش دار خاں
(۴۳) عطاء اللہ خاں
(۴۴) امیر خاں
(۴۵) ابراہیم خاں
(۴۶) شیخ چاند
(۴۷) غلام محمد
(۴۸) مرزا ابراہیم بیگ

مذکورہ بالا بارگیروں اور سواروں کے علاوہ رزیڈنسی ریکارڈ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۳ اور گھوڑسواروں کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا اور قرین قیاس ہے کہ انہیں بھی گولی

ماردی گئی یا پھانسی کی سزادی گئی۔ اس طرح جملہ ۶۱ سے زائد سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتاردیا گیا۔ یہ اعداد وشمار سرکاری ریکارڈ سے حاصل کئے گئے ہیں۔ نہیں معلوم کتنے اور سپاہیوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا ہوگا۔

بیڑ میں بغاوت ۱۸۱۸ء[1]

اورنگ آباد کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ ریاست حیدرآباد کے مرہٹواڑہ علاقہ میں اکثر مقامات پر انگریزوں اور نظام سرکار کے خلاف بغاوتوں کا کئی برسوں تک سلسلہ جاری رہا۔ یوں تو ساری ریاست میں انگریز سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں اور جاگیرداری لوٹ کھسوٹ کے خلاف باغیانہ جذبات ابھر رہے تھے لیکن مرہٹواڑہ کے اضلاع میں ان جذبات نے اس لئے شدت اختیار کرلی تھی کہ ان کے پڑوسی علاقے مہاراشٹر میں تاتیا توپے اور ناناصاحب وغیرہ کی قیادت میں انگریز دشمن انقلابی تحریکیں زور پکڑتی جارہی تھیں۔ انکے گہرے اثرات یہاں پڑنا ایک فطری بات تھی۔ چنانچہ ان ہی حالات اور محرکات نے بیڑ میں ۱۸۱۸ء کی بغاوت کے لئے راہ ہموار کی۔ مرہٹواڑہ کے علاقے میں بیڑ کو یہ امتیازی مقام حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلے بغاوت کی شمع روشن ہوئی جس کی روشنی دوسرے اضلاع میں پھیلتی گئی۔ اس کے علاوہ بیڑ ایک قدیم اور تاریخی مقام بھی رہا ہے۔

کورو اور پانڈوں کے زمانے میں یہ شہر درگاوتی کہلاتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ مقام متبرک سمجھا جانے لگا اور برہمن یہاں بڑی تعداد میں آباد ہوگئے اور پھر مرہٹوں نے بھی یہاں توطن اختیار کیا۔ اس طرح اس کی آبادی میں روزافزوں اضافہ ہوا اور یہ شہر تیزی سے تاریخی منازل طے کرتا گیا۔ اسی زمانے میں اس کا نام بالنی (Balni) ہوا۔ بکرمادیت (۵۷ ۳عیسوی) کی بہن چمپاوتی خود مختار رانی بننے کے بعد اس شہر کا نام چمپاوتی نگر رکھا گیا۔ اس کے بعد اس شہر کی تاریخ کے تعلق سے کوئی مصدقہ حالات کا علم نہ ہوسکا۔ لیکن اسکا قوی امکان ہے کہ یہ شہر چالوکیہ (۵۵۰ - ۱۰۷۰) راشٹراکوٹا (۷۶۸ - ۹۸۲) اور دیوگری کے یادوؤں کے زیرنگین رہا ہو۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان آندھرا ریاستوں کے زمانے میں یہ شہر فن موسیقی کا اہم مرکز بنا اور یہاں کے مغنیوں اور رقاصوں کو کافی شہرت

---

[1] ابو برکات محمد قطب تاریخ بیڑ ۱۳۱۷ھ

حاصل ہوئی۔

دور وسطیٰ میں محمد بن تغلق (۱۳۲۶ء) نے اس شہر کا موجودہ نام بیدر رکھا۔ اسی زمانہ میں سلطان کے شاہی معمار ظہیر الدین نے بیدر کی قدیم آبادی سے کچھ دور مسطح اور وسیع میدان میں قلعہ بنوایا اور اس کے اطراف کئی باؤلیاں بنوائیں اور اس مناسبت سے اس کا نام بیدر رکھا۔

بہمنی خاندان (۱۴۸۹ء - ۱۵۲۶ء) کی حکومت میں شامل رہا۔ مغلوں نے (۱۶۵۳ء) میں بیدر کو فتح کیا اور اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا اور جب آصف جاہی خاندان کی بنیاد رکھی (۱۷۲۴ء) گئی تو اس کو ریاست حیدرآباد میں شامل کر دیا گیا۔ بیدر کے مشہور انقلابی لیڈر دھرماجی پرتاپ راؤ نظام کی حکومت کو کئی برسوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۱۸ء کو لفٹننٹ جان سدر لینڈ (Suther. land) کے زیر کمان رسالہ دار نواب مرتضیٰ یار جنگ کو بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ۳۰ جولائی کو انگریز فوج قلعہ (جس کی مضبوطی مشہور تھی) کے قریب جمع ہو گئی اور پھر محاصرہ کر لیا۔ کچھ فوجی دستوں کو اس پاس کی پہاڑیوں پر متعین کیا گیا تاکہ وہ پہاڑی کی اونچائی سے راست حملہ کر سکیں۔ ان سب تیاریوں کے بعد ۳۱ جولائی کو قلعہ پر ایک ساتھ اور طاقتور حملہ کیا گیا۔ لفٹننٹ قلعہ کے گیٹ پر زخمی ہو گیا اور پیش قدمی نہ کر سکا۔ پھر دوسری رجمنٹوں کی مدد سے ایک اور حملہ کیا گیا۔ اس مرتبہ دھرماجی کا سامنا ہوا۔ کچھ دیر لڑائی کے بعد انہیں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ دھرماجی اور ان کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس لڑائی میں انگریز فوجوں کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

بیدر میں دوسری بغاوت ۱۸۵۹ء

پہلی بغاوت کے ۴۰ سال بعد بیدر میں ایک اور بغاوت

Hydrabad state committee, The freedom struggle in Hydrabad. Vol II (1857-1885) 1956 PP 189 — 191.

ہوئی جس کے روح رواں ستارا کے راجہ صاحب تھے۔ اس بغاوت کے پس منظر سے واقف ہونے کے لئے کچھ پچھلے واقعات کا جائزہ لینا ہوگا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ستارا کے چھترپتی تھے جنہیں ۱۸۳۹ء میں معزول کر کے بنارس بھیج دیا گیا تھا۔ ان کے بھائی آپا صاحب کو ستارا کا راجہ بنایا گیا جن کا نو سال بعد انتقال ہو گیا اور ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اور قانون کے مطابق ستارا اسٹیٹ کو برطانوی ہند میں ضم کر دیا گیا۔ اس ریاست کے دوسرے ورثا نے انتقامی جذبہ کے تحت دکن کے مختلف حصوں میں تقریباً نو سال تک (۱۸۵۸ء - ۱۸۶۷ء) انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان ہی بغاوتوں کی ایک کڑی بیڑ کی بغاوت بھی تھی۔ اس بغاوت میں راجہ صاحب کے علاوہ دیو راؤ کشن، وامن راؤ کشن، بیڑ کے دیس مکھ وٹھل راؤ عرف اباجی، سری نواس شنکر راؤ دیش پانڈے اور بیڑ کے کلکٹر حافظ غلام مصطفٰے خاں کے فرزند پاپا میاں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس مقدمہ میں دیئے گئے ایک بیان کے مطابق بالا صاحب نامی ایک شخص کچھ دنوں کے لئے بیڑ میں مقیم تھا اور کہا جاتا ہے کہ باغیوں کو ورغلانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ نارائن راؤ نامی ایک مخبر کی اطلاع پر ہری جے رام جالود (Jaeeo) شنکر بھاؤ (Shankar Bhau) چھوٹو (Chatoo) پاپا میاں اور ڈھونڈی (Dhondi) کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ کے دوران دیئے گئے ایک دوسرے بیان کے مطابق تاتیا مدگل (Mudgal) نامی ایک شخص۔ جو بالا صاحب کا پیرو تھا۔ سپاہیوں کو بھرتی کرانے اور روپے جمع کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا تاکہ کھاردا (Kharda) کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد ستارا پر حملہ کیا جاتے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے (مدگل) اپنا گھر دو ہزار روپے میں فروخت کر دیا تاکہ رسول خاں، باجوری (Bajdhi) ایک راجپوت کیپٹن اور روہیلوں کو سپاہیوں کی بھرتی کے لئے معقول رقم دی جاتے۔ اس طرح سپاہیوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کر کے کھاڈلہ (Khadla) کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی سازش رچانے کے الزام میں باغیوں پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو عدالت کے فیصلہ کے مطابق (۱) شنکر آتما رام، داجی کھنڈال والا اور سید چاند کو ۷ سال کی قید باشقت کی سزا دی گئی۔ وامن راؤ وٹھل، لال سنگھ اور چھوٹو (Chhatoo) کو دو سال کی سزا باشقت

اور غلام نبی عرف پاپا میاں کو صرف ایک سال کی سزا بلا مشقت دی گئی۔ بیڑ کی اس دوسری بغاوت کا یہ دردناک انجام ہوا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ کئی چھوٹی چھوٹی بغاوتیں اس علاقہ میں ہوتی رہیں اور انہیں کچل دیا جاتا رہا۔

امبڑ میں بغاوت ۱۸۱۸ء مرہٹواڑہ کے اس چھوٹے سے گاؤں کی بغاوت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے کہ یہاں بھیجی گئی گھوڑ سوار فوج نے اپنے کیپٹن کا باغیوں کے خلاف لڑائی میں ساتھ نہیں دیا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ جب کیپٹن ولسن کی گھوڑ سوار فوج نے بغاوت کو فرو کرنے کیلئے امبڑ کے گاؤں پر ۱۱ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو پہلا حملہ کیا تو انہیں کامیابی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑ سوار فوج کے سپاہی اور جمعدار اپنے کیپٹن کے ساتھ پیش قدمی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب کیپٹن نے گاؤں کے دروازوں پر قبضہ کر لیا تو انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ انکی جمعیت باغیوں سے نہیں لڑ رہی ہے۔ نتیجتاً کیپٹن ولسن (Wilson) بری طرح زخمی ہوا اور اپنی جمعیت کے اس رویہ اور اس کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کا اپنے افسروں سے مطالبہ کیا۔

بیڑ کی پہلی اور دوسری بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست

(۱) دھرماجی پرتاپ راؤ	بیڑ کی پہلی بغاوت کے لیڈر تھے کئی برسوں تک انہوں نے نظام کی فوجوں کو پریشان کر رکھا تھا۔	انہیں اور انکے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔
(۲) دیوراؤ کشن	بیڑ کی دوسری بغاوت میں راجہ صاحب کے ساتھ سرگرم حصہ لیا تھا۔	

---

۱ The Hydrabad state committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol. I (1800–1857) PP 88, 89.

(۳) وامن راؤ کشن	بیڑ کی دوسری بغاوت میں راجہ صاحب کے ساتھ سرگرم حصہ لیا تھا۔	
(۴) وٹھل راؤ عرف رمباجی	بغاوت میں سرگرم حصہ لیا وہ بیڑ کے دیس مکھ تھے	
(۵) سری نواس شنکر راؤ دیش پانڈے	بغاوت میں حصہ لیا	
(۶) ڈھونڈی	بغاوت میں حصہ لیا	
(۷) تاتیا مدگل	انہیں سپاہیوں کی بھرتی کرانے اور روپے جمع کرنے کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔	
(۸) رسول خاں باجوری	وہ ایک راجپوت کیپٹن تھے انہیں بھی سپاہی بھرتی کرنے کا کام دیا گیا تھا	
(۹) واجی کھنڈال والا	بغاوت میں سرگرم حصہ لیا	۷ سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی
(۱۰) سید چاند	بغاوت میں سرگرم حصہ لیا	〃 〃 〃
(۱۱) شنکر راؤ بھاؤ	بغاوت میں حصہ لیا	〃 〃 〃

ناندیڑ میں بغاوت ۱۸۱۹ء

ناندیڑ اس وقت ریاست مہاراشٹرا کا ایک حصہ ہے۔ لیکن ۱۹۵۶ء سے پہلے وہ غیر منقسم ریاست حیدر آباد کے علاقہ مرہٹواڑہ کا ایک ضلع تھا۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں سکھوں کے دسویں گرو گرو گوبند سنگھ کا مشہور گردوارہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس علاقہ کا تجارتی مرکز بھی ہے۔[1] ایک قدیم روایت یہ ہے کہ گوداوری کے کنارے

[1] ... Maharashtra State Gazetteer Nanded District, 1971.

بھگوان شیو کی سواری کا بیل یہاں تپسیا کر رہا تھا اس مناسبت سے وہ نندتا (Nandita) کہلایا اور اس کی تبدیل شدہ شکل ناندیڑ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گوداوری کے کنارے نو رشیوں نے اس مقام پر تپسیا کی تھی اس لئے اس کا نام نندتات (Nand-tat) پڑ گیا جو بعد میں ناندیڑ کہلایا۔ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ مگدھ سلطنت کے نو نندا حکمرانوں کا یہ علاقہ سرحد یا تاٹ (Tat) تھی اسی بناء پر ناندیڑ کہا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ علاقہ نندی (Nandi) ندی کے دونوں طرف بسا ہوا ہے۔ بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ کاکتیہ خاندان (۱۳۲۶ - ۱۰۰۰) کے ابتدائی دور میں نانا گیری (Nanagiri) نام کا یہاں ایک قلعہ تھا اور اسی بناء پر یہ علاقہ ناندیڑ کے نام سے موسوم ہوا۔[1]

سمراٹ اشوک (قبل مسیح ۲۷۵ - ۲۳۲) جب دکن پر حملہ آور ہوا تو ناندیڑ بھی اس کے زیر نگیں آگیا۔ پہلی صدی عیسوی میں ساتا کارنی (اول) (Sata karni I.) کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس خاندان کا ایک مشہور راجہ ہالا (Hala) تھا۔ اس کے بعد یہ علاقہ دور قدیم کے مختلف حکمرانوں اور سلطنتوں میں شامل رہا۔ جن میں قابل ذکر ہیں' موریہ' ستاواہانا (Satava-hana)- بادامی کے چالوکیہ' راشٹراکوٹا (Rastra Kota) آخری چالوکیہ اور دیوگیری کے یادوا۔

دور وسطیٰ میں علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۴ میں رام چندرا (یا رام دیو راؤ) کی سلطنت پر حملہ آور ہوا اور دیوگیری کے قلعے کے سامنے آدھمکا۔ پھر یہ علاقہ بہمنی (۱۳۵۷ء - ۱۵۲۶ء) اور قطب شاہی سلطنت (۱۵۱۲ء - ۱۶۸۷ء) میں شامل رہا۔ جب اورنگ زیب نے دکن پر حملہ کیا (۱۶۸ - ۸۷) تو ناندیڑ بھی مغلیہ سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ مغلیہ سلطنت کا جب زوال شروع ہوا تو آصف جاہی خاندان کی بنیاد ۱۷۲۴ء میں رکھی گئی تو ناندیڑ بھی اس ریاست کا حصہ ہو گیا اور ۱۹۵۶ء تک اسی سے منسلک رہا۔

---

1. Maharashtra State Gazetteer — Nander District 1971.

ہٹ کر قبیلہ کی بغاوت[1]

سکندر جاہ آصف جاہ سوم کے دور میں
(۱۸۰۳ء - ۱۸۲۹ء) ناندیڑ میں ہٹ کر

(Hat kars) قبیلے کی بغاوت کی ابتداء ہوئی۔ یہ لڑاکو قبیلہ ناندیڑ، پربھنی اور پین گنگا (Pain Ganga) کے علاقوں میں پھیلا ہوا تھا اور ۲۰ سال سے زائد عرصہ سے کمپنی سرکار اور آصف جاہی سلطنت کے خلاف اپنی بغاوت جاری رکھے ہوئے تھا اور سچ پوچھئے تو اس قبیلے نے حکمرانوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ اس بغاوت کے بہادر اور نامور رہنما نوساجی نائک (Nowasaji Naik) تھے۔ باغیوں نے ناندیڑ اور برابر کے اکثر مقامات پر اپنے گڑھ بنالئے تھے۔

یہاں یہ مناسب ہوگا کہ اگر ہم نوساجی کے تعلق سے ایک دلچسپ قصہ کا ذکر کریں جس سے ان کی پچھلی زندگی اور شخصیت سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں ایک بہت ہی بوسیدہ گڑھی تھی جس کو کاچر (Kachar) قبیلے کے ایک شخص نے تعمیر کی تھی۔ اس گڑھی کو محفوظ اور مضبوط بنانے میں اس نے اس کے اطراف خندق بھی کھدوائی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس شخص نے اس دوران کافی دولت بھی جمع کرلی۔ ظاہر ہے کہ اطراف کے بااثر اشخاص کی ہوس کی نگاہیں اس کی دولت پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ نے تو فوج کشی بھی کی، لیکن چھپی ہوئی یہ دولت انہیں ہاتھ نہ لگی لیکن اس کی شہرت ہوگئی کہ اس مقام پر خزانہ دفن کیا ہوا ہے۔ اتفاق سے اسی گڑھی کے قریب شمال میں نوساجی کا گاؤں تھا۔ اسی دوران نظام سرکار کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص بھی اس خزانے کو برآمد کرے گا اس کو یہ علاقہ بطور جاگیر عطا کردیا جائے گا۔ نوساجی اور پنساجی، دونوں بھائیوں نے قسمت آزمائی کی اور وہ اس خزانے کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ انہیں اس علاقہ کا جاگیردار بنادیا گیا۔ (اس قصہ کی تصدیق تانبے کی اس تختی سے ہوتی ہے جو حیدرآباد میں دستیاب ہوئی) دونوں بھائی مشترکہ طور پر اس جاگیر کے مالک بن گئے اور انہوں نے

---

[1] The Hydrabad ... committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol I (1800 - 1857), 1956 PP 89 - 98.

اپنے علاقہ کو وسعت دینے اور گڑھی کو مضبوط بنانا شروع کیا اور اسی مقصد سے انہوں نے چار سو عربوں کو ملازم رکھا۔ اب ان کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کی مدد سے آس پاس کے گاؤں' وردھا اور ناگپور پر بھی چھاپے مارنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان حملوں اور اپنی بہادری کی وجہ سے سارے علاقہ میں مشہور ہو گئے اور نظام کی حکومت کے لئے ایک خطرہ بن گئے۔ وہ رفتہ رفتہ اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ نظام سرکار کو بھی انہیں قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کے خلاف فوجی کارروائی شروع کی جائے۔ اس فوجی کارروائی میں تاخیر اس لئے ہو رہی تھی کہ نظام سرکار مرہٹوں کے خلاف تین سال تک (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۱۹ء) جنگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ جب ان جنگوں سے فرصت ملی تو باغیوں کے خلاف ہیجر پٹ من (Pit man) کی سرکردگی میں رسل بریگیڈ' برار انفنٹری اور ریفارمڈ ہارس (Reformed Horse) پر مشتمل بڑی فوج روانہ کی گئی۔ یہ فوج ۱۸۱۸ء کے اواخر میں عمر کھیڑ اور حد گاؤں جیسے اہم باغی اڈوں کے قریب جمع ہونا شروع ہوئی اور ۸ جنوری ۱۸۱۹ء کو نوھ (Nowah) کے قلعہ پر حملہ آور ہوئی اور اسکا محاصرہ کر لیا۔ نائک کے سپاہیوں نے' جن میں ۵۰۰ عرب بھی شامل تھے نظام اور کمپنی سرکار کی فوجوں کا بے مثال بہادری سے مقابلہ کیا۔ سرکاری فوج بڑی تعداد اور جدید ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود قلعہ پر' جو بہت مضبوط تھا' آسانی سے قبضہ نہ کر سکی بلکہ اسے ۲۴ دنوں (۸ تا ۳۱ جنوری ۱۸۱۹ء) تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھنا پڑا۔ آخر کار مسلسل اور بھاری گولہ باری' جدید ہتھیاروں کے استعمال اور فوجوں کی عددی برتری کی وجہ سے سرکاری فوج قلعہ کی دیواروں میں چند رخنے ڈالنے میں کامیاب ہوئی۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ایک مخبر کو خرید لیا گیا۔ اس نے فصیل کے ایسے مقام کی نشاندہی کی جہاں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ چنانچہ سرکاری فوج نے فصیل کی دیوار کو اندر ہی اندر کھود کر ایک خفیہ راستہ تیار کیا اور مخبر کے بتائے ہوئے مقام پر بارود کی سرنگ لگا کر قلعہ کے ایک حصّہ کو منہدم کر دیا۔ یہ خبر ملتے ہی نوساجی نے ایک خاص اور طاقتور توپ' جس کا نام بھیرو راد (Bhirva) تھا۔ داغنے کا حکم دیا جس کے نتیجہ کے طور پر نظام کی فوج حملوں کو کامیابی سے روکا گیا اور برٹش فوجوں کو

پسپا ہونا پڑا۔ ان حملوں میں نواساجی کے بھائی ہنساجی (Hansaji) کو مار ڈالا گیا۔ اس کے باوجود نواساجی نے اپنے سپاہیوں کو لڑائی جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود نظام سے ملنے حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن نظام نے انہیں پہچاننے میں تامل کیا۔ اس لئے نواساجی وہاں سے نکل پڑے۔ جب نظام کو ان کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا تو فوج کو ان کا پیچھا کرنے روانہ کیا گیا۔ نواساجی کو راستے میں پنڈاریوں کا ایک کیمپ ملا۔ جب انہیں نواساجی کے صحیح حالات کا علم ہوا تو انہوں نے نواساجی کو اپنے پاس پناہ دی۔ لیکن نظام کی فوجیں انکا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئیں اور پنڈاریوں کو مجبور ہو کر نواساجی کو فوج کے حوالے کر دینا پڑا۔ فوج نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا اور عزت و احترام کے ساتھ انہیں حیدرآباد لایا گیا۔ جہاں انہیں نظر بند رکھا گیا۔ اس نظر بندی کے دوران ہیضہ کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔

بغاوت کے اختتام کے بعد ناٹڈیڑی عدالت میں باغیوں پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں مختلف مدت کی سزائیں سنائی گئیں۔

ناٹڈیڑی کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست

(۱) نوساجی نائک	وہ ہٹ کر قبیلے کے سردار اور انکی بغاوت کے لیڈر تھے	گرفتار کر لیا گیا اور نظر بندی کے دوران بعارضہ ہیضہ ان کا انتقال ہوا۔
(۲) ہنساجی نائک	باغی لیڈر کے چھوٹے بھائی تھے	لڑائی کے دوران انہیں قتل کر دیا گیا اور انکی بیوی نے خودکشی کر لی
(۳) غلام نبی	بغاوت میں اہم حصہ ادا کیا	ایک سال قید کی سزا
(۴) ناگویا	بغاوت میں اہم حصہ ادا کیا	ایک سال قید کی سزا

(۵) راجہ بی	موضع عمری کی رہنے والی تھی	ایک سال قید کی سزا
(۶) کائن داس	جولہ گاؤں کا رہنے والا تھا	〃 〃 〃 〃
(۷) لازمن		

کپل میں پہلی بغاوت ۱۸۱۹ء

کپل ایک اہم تاریخی شہر رہا ہے جس کی قدامت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ذکر پہلی مرتبہ مہابھارت میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۷ ویں صدی عیسوی میں مشہور چینی سیاح ہیونسیانگ یہاں آیا تھا۔ کیونکہ یہ علاقہ بدھ مت اور جین مت کا مرکز بھی تھا پھر وہ آندھرا مہاراجوں، بہمنی اور عادل شاہی بادشاہوں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زیر نگین رہا۔ ۱۷۹۹ء میں آصف جاہی سلطنت کا حصہ بنا اور ۱۸۶۱ء میں نواب سالار جنگ بہادر کو جاگیر کی حیثیت سے عطا کیا گیا جو ۱۹۴۹ء تک اس خاندان کی جاگیر رہا۔ آصف جاہی دور حکومت میں ۱۸۱۹ء میں انگریزوں اور نظام کے خلاف ویرپا کی قیادت میں ایک اہم بغاوت کا مرکز بنا۔

اس مقام کے نام۔ کپل۔ کے بارے میں بہت ہی مختلف اور متضاد روایتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کنڑی زبان کا لفظ ہے جو ماخذ ہے "کو پلو" سے جس کے لغوی معنی "نو آباد قریہ یا درختوں کا جھنڈ" ہے۔ سنسکرت زبان میں بھی یہی معنی بتلائے گئے ہیں۔

کپل زمانہ قدیم سے دور جدید تک جن مہاراجوں اور بادشاہوں کے عہد سے گزرا۔ انہوں نے پرانا نام بدل کر نیا نام رکھا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

چنانچہ ہرش وردھنا کے دور (۶۰۶ - ۶۴۷) میں کن کینا پور (Kankunapura) نام کا ذکر آتا ہے۔ شاید اس سے مراد کپل ہو، کیونکہ دور قدیم میں اس کو کوپناد (Kopana) اور کوپنیا" کے ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔ تاریخ کرناٹک میں کپل کو کونپ نگر لکھا گیا ہے۔ اور کپل درگ کے نام سے بھی مشہور تھا۔

Gazetteer of India — Mysore State — Raichur District 1970, Muthanna I. M. History of Karnataka, 1962

گیارہویں[۱] صدی عیسوی میں چولا اور مغربی چالوکیہ راجوں کے درمیان جنگ اسی مقام پر ہوئی اور جنگ کپل کہلائی۔ ۱۶۷۷ء میں سیواجی نے کپل پر جو اس وقت عادل شاہی حکومت کا ایک حصہ تھا، حملہ کیا۔ عادل شاہی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور قلعہ کپل فتح کر لیا گیا۔ یہ ضلع راچگان اناگندی کے زیر حکومت بھی رہا۔ اسی سرزمین پر بیجاپور کے حکمرانوں اور مغل فوجوں کے درمیان سخت لڑائی ہوئی جس کی قیادت اورنگ زیب کے لڑکے نے کی تھی۔ وہ اس لڑائی میں زخمی بھی ہوا۔ کپل کا قلعہ اور اس سے کچھ ہی فاصلہ پر بہادر بنڈہ کا قلعہ اپنی نوعیت کا، بناوٹ اور مضبوطی کے لحاظ سے بہت مشہور ہے جس کا شمار ایک فرانسیسی انجنیئر کے مطابق ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا علم نہ ہو سکا کہ ان قلعوں کو کس نے تعمیر کرایا۔ البتہ ٹیپو سلطان نے ۱۷۸۶ء میں اس قلعہ کی مرمت کرائی اور اس کو اور زیادہ مضبوط بنایا اور اس کا نام سلطان گڑھ رکھا۔

کپل تاریخی حیثیت سے اہم ہونے کے علاوہ پرانی تہذیب، قدیم کتبوں اور جین مذہب کے اہم تیرتھ یاترا کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

ہم پہلے ہی یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۸۱۹ء میں اس علاقہ کے ایک اہم زمیندار ویرپّا نے انگریزوں اور نظام سرکار کے خلاف بغاوت کی اور کپل اور بہادر بنڈہ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت کی اطلاع ملتے ہی سکندرآباد سے میجر ڈوویٹن (Doveton) کی سرکردگی میں ایک کثیر فوج۔ مدراس انفنٹری اور ۹۰۰ گھوڑ سوار فوج کا ایک دستہ مل کر بریگیڈیر جنرل پریٹزلر (Pritzler) کی قیادت میں قلعہ کپل پر حملہ آور ہوئے۔ ویرپّا نے اپنے پانچ سو (۵۰۰) مجاہدین کے ساتھ قلعہ کے اوپری حصہ پر اپنا مورچہ سنبھال لیا اور انگریز فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۵ روز کے محاصرہ کے بعد انگریز فوج قلعہ پر قبضہ کر سکی۔ ویرپّا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس لڑائی میں کئی انگریز فوجی افسر مارے گئے اور درجنوں زخمی ہوئے۔

---

۱ رضوی، میر احمد علی (تعلقدار ہیں) حالات کپل (قلمی)

کپل میں دوسری بغاوت ۱۸۵۸ء

حیدر آباد میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے فوری

بعد شمالی کرناٹک کے مختلف علاقوں۔ رائچور، گلبرگہ اور دوسرے مقامات پر ایک مشترکہ بغاوت کی اسکیم تیار کی گئی تھی۔ اس اسکیم کی ایک اہم کڑی کپل کی دوسری بغاوت تھی۔ کپل کی یہ بغاوت مئی ۱۸۵۸ء میں شروع ہوئی، جس کی قیادت مہندر گی (ضلع دھارواڑ) کے دیسی مکھ بھیم راؤ نند اگوڑ اور رہامگی کے دیسائی نے کی بھیم راؤ دیس مکھ ہونے کے علاوہ بلاری کے تحصیلدار بھی تھے اور ان پر غلط الزامات لگا کر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔[1]

۱۸۵۸ء کی بغاوت سے پہلے انہوں نے ہمامگی کے کنجن گوڑا، سورتور کے دیسائی، دھبال کے دیسائی اور گوکوب کے سرنند اگوڑا سے دوستی بڑھائی اور اننا گندی مستھان اور نارگنڈہ کے راجوں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا۔ ان میں آپس میں ربط اور مراسلت بھی تھی۔ اس لئے ان تمام پر حکومت کی سخت نظر تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے کثیر فوج اور بڑی مقدار میں ہتھیار اور گولہ بارود جمع کر لی۔ اس بغاوت کی فوری وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ اس وقت ایک ایکٹ کے ذریعے ہتھیار رکھنے پر پابندی لگائی گئی تھی۔ چونکہ حالات بگڑتے جا رہے تھے اس لئے اس ایکٹ پر ہمامگی (Hummagee) اور منارگی (Munargee) میں سختی سے عمل آوری شروع ہوئی اور پولیس نے ان دونوں مقامات پر دھاوے شروع کر دیئے۔ بھیم راؤ کے گھر میں ہتھیار برآمد نہیں ہوئے لیکن ہمامگی (Hummagee) کے گھر میں ہتھیار ملے۔ جوں ہی ہتھیار ضبط ہونے کی خبر پھیلی تو ان دو مقامات کے عوام نے بغاوت شروع کر دی۔ ان کے ساتھ گدگ اور ڈمبل (Dumbal) کے عوام بھی شریک ہو گئے۔ ان مقامات کے عوام کا قافلہ کپل کی طرف کوچ کیا اور پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ جیسے ہی اس بغاوت کی خبر پھیلی تو دھارواڑ، بلاری اور دوسرے مقامات سے انگریزی فوجیں کپل کی طرف روانہ ہونا شروع ہو گئیں۔ فوج کے میجر نے بھیم راؤ کو تین دن کی مہلت دی اور اس دوران

---

[1] رضوی، میر احمد علی (حالات کپل (قلمی))

ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا لیکن بھیم راؤ نے اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنے چار سو جانبازوں کے ساتھ قلعہ میں مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ ۳۱ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریز میجر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور دوسرے دن صبح قلعہ پر زبردست حملہ کیا گیا جس کا مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ قلعہ کی دیوار کا ایک حصہ توڑنے کے بعد ہی برٹش فوج اندر داخل ہو سکی۔ جہاں نندا گوڑا (Nanda Guda) اور کنچن گوڑا (Kenchan Guda) نے آخر دم تک ان کا مقابلہ کیا اور قلعہ کی سیڑھیوں پر مارے گئے۔ ان کے دو سو باغی سپاہی بھی مارے گئے۔ ۱۵۰ کو قیدی بنا لیا گیا۔ اور ان میں سے ۷۵ کو توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔

اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔ نارگنڈ (Nargund) کے زمیندار بھاسکر راؤ بھاوے نے اس علاقہ کے کلکٹر اور ان کے محافظ دستہ کو مار ڈالا۔ زمیندار اور ان کے ہزاروں ساتھیوں نے بہادری سے نارگنڈ کی مدافعت کی پوری کوشش کی۔ لیکن طاقتور انگریز فوج کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور بغاوت کے تمام لیڈروں کی زمین اور جائداد ضبط کر لی گئی۔

اس طرح کپل کے اور نارگنڈہ کے زمیندار کی بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔ اس علاقہ میں بغاوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ دھارواڑ کے قریب نارگنڈہ (Nargund) جسکا پہلے ذکر آچکا ہے' نامی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کے حکمراں شنکر راؤ بابا صاحب تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک اور بغاوت کر دی۔ بابا صاحب کا شوراپور کے راجہ سے گہرا ربط تھا۔ جب شوراپور کی بغاوت کچل دی گئی تو وہ خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اور ان کی بیوی نے یہ عہد کیا کہ جب تک فرنگیوں (انگریزوں) کا خاتمہ نہ ہو وہ چین کی سانس نہ لیں گے۔ ان کی بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ انہیں کمپنی سرکار نے اپنی جائداد کی وراثت کے لئے متبنیٰ لینے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسی بناء پر انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کے خلاف میسن (Mason) کی سرکردگی میں فوج بھیجی گئی۔ بابا صاحب کے سپاہیوں نے ان فوجوں کو نارگنڈ کے جنگلوں میں کافی پریشان کیا۔ ان سنگین جھڑپوں میں میسن مارا گیا۔ اس کے سر کو ایک جلوس کی شکل میں نارگنڈہ لایا گیا اور

قلعہ کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن بابا صاحب کے سوتیلے بھائی نے غداری کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا اور برٹش آفیسر کیپٹن مالکم نے بابا صاحب کو شکست دے دی۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۲ جون ۱۸۵۸ء میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ بابا صاحب کی بہادر بیوی اور ان کی ماں اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکیں اور خودکشی کر لی۔

کپل کی پہلی بغاوت (۱۸۱۹) اور دوسری بغاوت (۱۸۵۸) میں حصّہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست

(۱) ویرپا

اس علاقہ کے اہم زمیندار تھے۔ جنہوں نے ۱۸۱۹ء میں کمپنی سرکار اور نظام کے خلاف بغاوت کی اور کپل و بہادر بنڈہ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ویرپا اور ان کے پانچ سو (۵۰۰) ساتھیوں نے پانچ روز تک نظام کی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بغاوت کی پاداش میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

(۲) مندرگی بھیم راؤ ولد رنگ راؤ

وہ مندرگی کے دیس مکھ اور ضلع دھارواڑ کے باشندے تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ بلاری کے تحصیلدار بھی رہے۔ کپل اور رائچور کے عوام میں انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور ان کا شمار کرناٹک کے اہم انقلابیوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انکی بغاوت اور انگریز فوجوں کے خلاف ان کی لڑائی اور بے مثال بہادری کے بارے میں ایک رزمیہ گیت کنڑ زبان میں لکھا گیا جو اس زمانہ میں زبان زد خاص و عام تھا۔ ان کی بیوی اور بچوں کو بھی گرفتار کر لیا۔

بھیم راؤ کو پھانسی دے دی گئی۔ انکی لاش کو ایک کھلے مقام پر لٹکا دیا گیا ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔

(۳) سری نواس ونکٹادری — ڈمبل کے دیسائی اور بھیم راؤ کے ساتھی تھے اور بغاوت میں شریک تھے۔ — ان کی زمینات و جائداد ضبط کرلی گئیں۔

(۴) کنچن گوڑا سرنا گوڑا — گون کوپ کے دیس مکھ تھے۔ انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ — انہیں گرفتار کیا گیا اور زمینات ضبط کرلی گئیں

(۵) بھاسکر راؤ بھاوے — انہیں نارگنڈ کے باباصاحب بھی کہا جاتا تھا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انکی نانا صاحب پیشوا سے مراسلت تھی۔ — انہیں گرفتار کیا گیا اور زمینات ضبط کرلی گئیں

(۶) کنچن گوڑا — ہمبیگی کے دیس مکھ تھے۔ پولیس نے جب ان کے گھر پر دھاوا کیا تو وہاں ہتھیار برآمد ہوئے۔ بھیم راؤ کے قریبی ساتھی تھے۔ — لڑائی کے دوران وہ مارے گئے اور زمینات ضبط کرلی گئیں۔

(۷) سورتور کے دیسائی — ان کے نام کا بھی علم نہ ہوسکا۔ انہوں نے اپنے تعلقہ میں بغاوت کے لئے ہتھیار جمع کئے۔ بھیم راؤ کے قریبی دوست تھے۔

(۸) اننا گندی سمستان کے راجہ

ان کے نام کا بھی علم نہ ہوسکا۔ بھیم راؤ اکثر ان کے گھر پر قیام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے جمعدار سے یہ پیغام بھیجا تھا کہ جب کپل میں بغاوت ہوگی تو وہ ضرور شریک ہوں گے۔

(۹) تھورگل کے راجہ

انہوں نے بھیم راؤ کے ساتھ بغاوت میں حصہ لینے کا وعدہ کیا تھا جس کو انہوں نے پورا کیا۔

(۱۱) شیوا پور کے کنچیا مڈی

اپنے علاقہ میں بغاوت کیلئے لوگوں کو جمع کرنے کی ذمہ داری ان پر تھی

(۱۱) بھیم راؤ — وہ بھیم راؤ کے گماشتہ تھے — اس لئے انہیں گرفتار کر لیا گیا

(۱۲) باوا صائب — ریاست میسور کے رہنے والے تھے۔ بھیم راؤ اور کنچن گوڑنے کپل میں جو بغاوت ۱۸۵۸ میں کی تھی اس میں شریک تھے۔ — گرفتاری کے بعد توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا

(۱۳) داؤد صائب — ایضاً ایضاً — ایضاً

(۱۴) الہ صائب — ریاست میسور کے رہنے والے تھے — ایضاً

(۱۵) ریحان صائب — ایضاً ایضاً — ایضاً

(۱۶) فقیر صائب — ایضاً ایضاً — ایضاً

(۱۷) سید بڈن — بنکاپور (ضلع رائچور) کے رہنے والے تھے۔ بھیم راؤ اور کنچن گوڑنے کپل میں جو بغاوت ۱۸۵۸ میں کی تھی اس میں شریک تھے۔ — گرفتاری کے بعد توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا

(۱۸) شنکر راؤ بابا صاحب — نارگنڈ نامی چھوٹی سی ریاست کے حکمراں تھے۔ راجہ صاحب شوراپور کے قریبی ساتھی تھے۔ ۱۸۵۸ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ — ۱۲ جون ۱۸۵۸ء کو انہیں پھانسی دیدی گئی۔ انکی بیوی اور ماں صدمہ کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لی۔

ادھ گیر کے دیس مکھ کی بغاوت ۱۸۲۰ میں

ادھ گیر کے دیس مکھ کی بغاوت ۱۸۲۰ء

ہوئی جس کے تین اہم لیڈر شیو النگپا' ترمل راؤ اور میگھشم (Meghashm) تھے.
ریاست حیدرآباد کے ضلع بیدر کا ادھ گیر ایک تعلقہ تھا۔ لیکن ادھ گیر ایک قدیم بستی اور بارونق شہر تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس مقام پر زمانہ قدیم میں ایک برہمن فقیر جس کا نام" اودی گیر سوامی" تھا چھوٹی سی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ایک مشہور اور تاریخی شہر بن گیا۔ جہاں ایک قدیم مندر بھی تھا۔ تاریخی شہادتوں کی بنار پر کہا جا سکتا ہے کہ ادھ گیر کے قلعہ۔ جو اپنی مضبوطی کی وجہ سے بہت مشہور تھا، کی ابتدا بہمنی سلطنت کے زمانہ (۱۳۴۷ - ۱۵۲۶) میں ہوئی اور محمود شاہ بہمنی نے اس قلعہ کو قاسم برید (۱۴۹۲ - ۱۵۰۹) کو بطور جاگیر عطا کیا' جس نے اس قلعہ کو مکمل کیا اور مضبوط بنایا۔[1]

۱۹ویں صدی کے دوسرے دہے میں ادھ گیر اور آس پاس کے علاقوں میں انگریزوں اور خاص طور پر نظام سرکار کے اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف برہمی اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ان ہی حالات کے پیش نظر لفٹننٹ سدرلینڈ (Sutherland) کے فوجی دستوں کو اس علاقہ میں متعین کیا گیا تھا۔ ۲۲ر دسمبر ۱۸۲۰ء کو جب یہ خبر ملی کہ مقامی دیس مکھ نے ادھ گیر قلعہ سے تعلقدار کو بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے تو لفٹننٹ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ فوراً فوجی کارروائی شروع کریں.
سب سے پہلے لفٹننٹ نے شیو لنگپا دیس مکھ کو یہ پیغام بھیجا کہ ان کی سرکوبی کے لئے فوجی دستہ تیار کھڑا ہے۔ لیکن انکی پچھلی باغی سرگرمیوں کی بنار پر انہیں سزا نہیں دی جائے گی اور نظام حکومت کے مقامی عہدیداروں نے اگر ان کے حقوق سلب کئے ہیں تو اس کا تدارک کیا جائے گا بشرطیکہ گڑھی (قلعہ) جہاں وہ پناہ گزیں ہیں، کو تعلقدار

---

[1] فرامرز جنگ بہادر، نواب۔ تاریخ قلعہ ادھ گیر ۱۳۱۵ھ

[2] The Hyderabad State Committee, "The Freedom Struggles in Hyderabad Vol. I. P. 108, 109

کے قبضہ میں دے دیا جائے اور ان کے سپاہی اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن اس دھمکی آمیز پیش کش کو دلیس مکھ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

چونکہ لفٹننٹ کے پاس کافی تعداد میں فوج نہیں تھی اس لئے اس نے اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دیا کہ وہ باغی فوجوں کے حملوں کا فوری جواب نہ دیں۔ وہ چھپتے چھپاتے قلعہ کے قریب پہنچ گیا اور اپنے سپاہیوں کو موزوں اور اہم مقامات پر متعین کرنے کے بعد باغی سپاہیوں کے چھوٹے اور معمولی حملوں کو بے اثر کر دیا گیا۔ قلعہ کے اندر جو سپاہی تھے وہ وہیں پھنس گئے۔ انگریز سپاہی گڑھی (قلعہ) کی دیوار تک آہستہ آہستہ پہنچ گئے اور اپنے پستول سے ایک ایک کر کے کافی باغی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس گولی باری میں مالیجی کولی مارا گیا۔

چونکہ انگریز لفٹننٹ کے پاس کافی فوج نہ تھی اس لئے وہ قلعہ پر کوئی راست طاقتور حملہ نہ کر سکا۔ لیکن قلعہ کو گھیر لیا گیا تھا اس لئے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اکثر باغی بچ نکلے اور خود دتیولنگپا نے بھی قلعہ کو چھوڑ دیا اور میگشم کے یہاں پناہ لی۔

لفٹننٹ سدرلینڈ ادگیر کا معرکہ سر کرنے کے بعد بیدر کی طرف روانہ ہوا۔ اس دوران بلارم اور دوسرے مقامات سے اسکی مدد کے لئے کافی فوج بھیج دی گئی تھی۔ اب وہ ایک طاقتور فوج لے کر ۲۰ جنوری ۱۸۲۱ء کو بیدر سے نکل کر کرشنا پور کی طرف روانہ ہوا جہاں ترمل راؤ دلیس مکھ نے کئی برسوں سے ہل چل مچا رکھی تھی اور نظام حکومت کو واجب الادا لگان بھی نہیں ادا کیا تھا۔ سدرلینڈ نے فوجی کارروائی کرنے سے پہلے دلیس مکھ سے راست بات چیت کی اور انہیں اطمینان دلایا کہ اگر وہ حکومت کا لگان ادا کریں تو ان کی تمام مشکلات کو ختم کیا جائے گا اور نظام حکومت ان کی حفاظت کی ذمہ داری لے گی۔ لیکن دلیس مکھ صاحب نے نظام حکومت کے عہدیداروں کے وعدوں پر اعتبار کرنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ بتلایا کہ ایک سابق تعلقدار کے ظلم اور ایذا رسانی سے تنگ آکر انہوں نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور ان عہدیداروں کو ایک لاکھ روپے کی رشوت دینے کے بعد بھی حالات بہتر نہیں ہوئے۔ ان شرمناک حالات کے پیش نظر انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے جائیں تاکہ انہیں تعلقدار کے مظالم سے تو چھٹکارہ مل جائے۔ اس واقعہ کے بعد انگریز فوج لکشمن ریڈی دیسائی کی سرکوبی کے لئے بھوانی پیٹھ روانہ ہوئی۔ لیکن دیسائی

اور ان کے ساتھیوں نے انگریز فوجوں سے معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر انگریز فوجوں سے کوئی قابل ذکر مقابلہ نہیں ہوا اور لفٹننٹ سدرلینڈ بلارم واپس ہوگئے۔ ضلع بیدر میں ۱۸۵۲ء میں ایک اور بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس کے رہنما لنگیا تھے۔ انہوں نے ضلع کے اکثر مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لئے کنٹنجنٹ فوج روانہ کی گئی۔ چھ (۶) دن تک (۱۹ تا ۲۴ مارچ) باغیوں سے لڑائی ہوئی اور آخر کار اس بغاوت کو بھی کچل دیا گیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس علاقہ کے چھوٹے بڑے سات قلعوں پر قبضہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا گیا۔

بیدر میں بغاوت ۱۸۲۱ء

ریاست کرناٹک کا ضلع بیدر ایک قدیم شہر ہے جو تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کا ایک اہم مرکز اور برید شاہی بادشاہوں (۱۴۹۲ء – ۱۶۰۹ء) کا دارالسلطنت رہا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں شرنا (Sharana) اصلاح پسندوں نے سماج سدھار کی بڑی انقلابی تحریک چلائی تھی جس کے اثرات دور دور تک پھیلے تھے۔ یہ محمود گاواں کا شہر ہے جہاں ان کا مدرسہ اور کئی دوسرے آثار قدیمہ ہیں جو دکن کی عظمت رفتہ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔[1]

دکن کے دوسرے مقامات کی طرح بیدر کی وجہ تسمیہ کی بھی مختلف روایات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بیدر کا ماخذ "بیدارو" ہے جس کے معنی بمبو (Bamboo) ہیں۔ کیونکہ یہاں زمانہ قدیم میں بمبوؤں کا ایک گھنا جنگل تھا۔ اس کے علاوہ اسے بینداورو (Bindaroomu) بھی کہا جاتا تھا جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ بیدرا (Bidara) اور دوسرا حصہ اورو (Ooroo) یعنی گاؤں (تلگو میں بھی یہ گاؤں کہا جاتا ہے) ان دونوں حصوں کو ملا دیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا بمبوؤں کا گاؤں جو امتداد زمانہ سے بیدر کہلایا جانے لگا۔ کنڑ زبان میں بھی کئی زمانے تک اسے بیدر کہا جاتا تھا۔

۱؎ Karnataka State Gazetteer – Bidra District 1977.

ایک قدیم روایت کے مطابق اس مقام کا ذکر مہابھارت میں بھی ملتا ہے جہاں اس کا نام ویدور نگر (Vidura Nagar) کہا گیا ہے یعنی ویدور اد (Vidura) کا شہر اور مہابھارت میں ویدور لفظ کا استعمال عقلمند اور صاحب سمجھ افراد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "ویدورا" کثرت استعمال سے مختصر ہو کر بیدر کہلایا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ زمانہ قدیم کے ایک شہزادے ویدوراد (Vidura) نے اپنے نام سے اس شہر کو بسایا تھا جو بعد میں بیدر کہلایا۔ "نل دمینتی" کے مشہور قصہ سے بھی اس مقام کو وابستہ کیا جاتا ہے۔

دور قدیم میں بیدر چالوکیہ سلطنت (۹۷۳ - ۱۱۹۰) میں شامل تھا جسکی راجدھانی کمیانی تھی جو بیدر سے صرف ۳۶ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ بعد میں دیوگیری کی یادو حکومت کا حصہ بنا اور ۱۳۲۲ میں کاکتیہ خاندان کے راجاؤں نے بیدر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۴۲۹ میں بہمنی حکمرانوں نے اپنا دارالخلافہ بیدر کو بنایا اور یہاں کے قلعہ کی ازسرنو تعمیر کی۔ بہمنی خاندان کے خاتمہ ۱۵۲۷ کے بعد بریدشاہوں نے بیدر کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ کچھ عرصہ تک بیدر عادل شاہی حکمرانوں کے بھی زیرنگین رہا اور جب اورنگ زیب نے دکن پر حملہ کیا (۱۶۲۶) تو بیدر کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنا کر اس کا نام ظفرآباد رکھا۔ آصف جاہی سلطنت کے قیام (۱۷۲۴) کے بعد بیدر بھی اس سلطنت کا ایک حصہ بن گیا اور ۱۹۴۹ء تک اسی سے منسلک رہا۔

بیدر جو ایک زمانہ میں کئی بزرگ ہستیوں کا مسکن رہا اور غالباً اسی مناسبت سے بیدر شریف کہلایا۔ وہی بیدر ۱۹ویں صدی کے دوسرے دھے میں (۱۸۲۱) کمپنی سرکار کے خلاف بغاوت کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ادگیر کی بغاوت (جسکا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) کے کچھ ہی عرصہ بعد بیدر میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی اور جس فوجی افسر لفٹننٹ سدرلینڈ نے ادگیر کی بغاوت کو فرو کیا تھا اسی کو حکم دیا گیا کہ وہ بیدر کی طرف کوچ کرے[1]

---

[1] The Hyderabad State committee, The freedom Is struggle in Hydrabad Vol I (1800-1859) 1956, P 110.

ادگیر کی فوجی مہم کے دوران لفٹننٹ سدرلینڈ (Sutherland) نے فوجوں کی کمی شدت سے محسوس کی تھی اور اسی بناء پر وہ ادگیر کے قلعہ پر راست حملہ نہ کر سکا تھا۔ اس لئے اس نے مزید فوجیں طلب کیں اور پھر ۱۰ جنوری ۱۸۲۱ء کو بیدر کا رخ کیا۔ یہاں بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ کرشنا پور کا دیس مکھ ترمل راؤ نے اس علاقہ میں زبردست ہلچل مچا رکھی تھی اور حکومت کو تیس سال سے محصول ادا نہیں کر رہا تھا۔

۱۲ جنوری کی صبح سدرلینڈ کرشنا پور پہنچ گیا اور قلعہ کی دیوار پر پہنچ کر دیس مکھ سے کہا کہ اگر وہ پورا محصول ادا کر دے تو حکومت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو پھر فوج حملہ کے لئے تیار کھڑی ہے۔ لیکن دیس مکھ کو حکومت کے عہدیداروں کے وعدوں پر بالکل بھروسہ نہ تھا اس لئے اس نے ضلع کے تعلقدار (جس کے خلاف دیس مکھ کو کئی شکایتیں تھیں) کے تحت رہنے کی بجائے رات کے اندھیرے میں وہاں سے چلے جانے کو ترجیح دی۔

وہاں سے سدرلینڈ کی فوج بھوانی پیٹھ پہنچی جہاں اسے ایک اور باغی لکشمن ریڈی دیسائی کی سرکوبی کرنی تھی۔ لیکن ریڈی نے اطاعت قبول کر لی اور اس کے ساتھیوں نے کچھ دیر تک فوجوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور قلعہ خالی کر دیا۔ ان بغاوتوں کو کچلنے کے بعد سدرلینڈ کی فوج بلارم واپس ہوگئی۔

بیدر میں ایک اور بغاوت (۱۸۵۲) میں ہوئی جس کا رہنما لنگوا یا تھا۔ باغیوں نے ضلع کے اکثر مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے کنٹنجنٹ فوج کو روانہ کیا گیا۔ سرکاری فوجوں اور باغیوں کے درمیان چھ دن (۱۹ مارچ سے ۲۴ مارچ) تک زبردست لڑائی ہوتی۔ آخر کار باغیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور فوج کے سات مقامی قلعوں پر قبضہ کر کے انہیں تباہ کر دیا گیا۔

عادل آباد میں بغاوت ۱۸۲۲ء

ریاست آندھرا پردیش کا یہ ضلع پہاڑی علاقہ ہے جو مختلف قبائل کا مسکن رہا ہے اور مرہٹواڑہ کے اضلاع سے متصل ہونے کی وجہ سے یہاں نہ صرف مرہٹی زبان کا اثر رہا بلکہ یہاں کی سیاست پر بھی مرہٹہ پیشواؤں اور بھونسلہ کے راجوں کی گہری چھاپ تھی۔ لیکن اس ضلع کا نام بیجاپور کے عادل شاہی حکمراں علی عادل شاہ

(۱۵۵۷ - ۱۵۷۹) کی مناسبت سے عادل آباد کہلایا۔[1]

دورِ قدیم کے آندھرا راجاؤں کی اس ضلع پر حکمرانی کے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتے۔ ہاں یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ کئی برسوں تک بھوجاد (Bhuja) راجوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اس ضلع کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ پورا ضلع کبھی کسی ایک حکمران یا ریاست کے تحت نہیں رہا بلکہ اس ضلع کے مختلف حصے (یا تعلقے) مختلف زمانوں میں، مختلف حکمرانوں کے تحت رہے۔ چنانچہ دورِ وسطیٰ (بارہویں صدی عیسوی) میں بودھن، اٹنور، عادل آباد، راجورہ اور کنوٹ کے تعلقوں میں دیوگیری کے یادو کی حکومت تھی اور بارہویں صدی کے آخری دہوں میں سریور، آصف آباد، چنور، نرمل اور لکشٹی پیٹھ کے تعلقے کاکتیہ راجوں کے تحت تھے۔

لگ بھگ اسی زمانہ میں (۱۲۴۰ - ۱۷۵۰) ان علاقوں پر گونڈ راجوں کی حکمرانی تھی۔ ان راجوں کی حیثیت قبائل کے سرداروں کی جیسی تھی۔ اور انہوں نے اپنے زیرِ نگیں علاقوں کو گونڈوانا (Gondwana) کا نام دیا تھا جس میں اس ضلع کے تعلقے سریور، آصف آباد، اٹنور اور چنور کے کچھ علاقے شامل تھے۔ گونڈ سرداروں میں سب سے زیادہ مشہور سردار کول بھیل (Kol Bhil) تھا جو اپنی عقلمندی اور بہادری کے لئے مشہور تھا۔ محمد بن تغلق (۱۳۲۵ - ۱۳۵۱) جب دکن پر حملہ آور ہوا تو اس نے ملک مقبول کو اس علاقے کا گورنر مقرر کیا جس کا صدر مقام ورنگل تھا۔

۱۸ویں صدی کے ابتدائی دہوں میں عادل آباد کے علاقہ میں گونڈ راجاؤں کی عمل داری تھی۔ لیکن ۱۷۵۱ میں گونڈ اسٹیٹ (Estate) کو بھونسلہ سلطنت میں ضم کر دیا گیا اور ان کے راجہ نیل کانت شاہ (Nil Kanth shah) کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۷۷۳ میں نظام علی خاں آصف جاہ دوم (۱۷۶۲ - ۱۸۰۳) اور مدھوجی بھونسلے (Madhuji Bhonsle) کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے بموجب یہ طے پایا کہ مانک گڑھ (Manik Garh) اور پین گنگا (Pen Ganga) کے جنوبی علاقہ کو نظام کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے بدلے برار میں واقع

---

[1] The Govt; of Andhra Pradesh, District Gazetteer Adilabad, 1976.

گاول گڑھ (Gawil garh) اور نارنالہ (Nar Nala) کے قلعوں کو بھونسلے کے راجہ کو دے دیئے جائیں۔ ان سرحدی علاقوں میں نظام کی حکومت برائے نام تھی اس لئے یہاں مسلسل لڑائیاں اور جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ وہاں کے ایک زمیندار نے نظام کے علاقہ چنور پرگنہ کو پیٹہ پر دے دیا اور ۱۷۸۸ء میں نظام کے خلاف بغاوت بھی کردی۔ نظام نے زمیندار کی سرکوبی کے لئے بڑی تعداد میں فوج بھیجی لیکن زمیندار کو گرفتار نہیں کیا جاسکا۔ اس ناکامی سے جھنجھلا کر نظام اور اس کے حلقہ بگوش آسامیوں نے سارے علاقہ میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار اور غارت گری مچادی۔ اس لڑائی کا سلسلہ چار سال تک جاری رہا اور آخر کار سرکش زمیندار کے ایک ساتھی نے غداری کی اور اس کو قتل کردیا گیا اور اس کے علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا۔ لیکن اس طویل اور تباہ کن جنگ کے دور رس اثرات سے گونڈ قبائل کے لوگ پوری طرح متاثر ہوئے۔ نتیجتاً یہ لوگ جنگل کے اندرونی حصوں میں منتقل ہوگئے۔ جب ۱۷۹۵ء میں نظام اور مرہٹوں کے درمیان جنگ ہوئی تو ان سرحدی علاقوں کے گونڈوں کو بھی اس لڑائی میں شریک ہونا پڑا۔

گونڈ قبیلے کے ایک سردار جوکٹ راؤ (Jukut Rao) کو بھونسلا خاندان کے راجہ نے مرہٹواڑہ کے متصل کچھ علاقہ انہیں جاگیر کے طور پر عطا کیا اور پانچ سو گھوڑ سواروں کا سردار بنا کر اپنی ملازمت سے منسلک کرلیا۔ اس سردار نے نظام سرکار میں شامل عادل آباد اور نرمل کے علاقوں پر حملہ کردیا۔ اس لڑائی میں اٹور کے گونڈوں نے مرہٹوں کے خلاف نرمل کے سردار کا ساتھ دیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں اور رگھوجی بھونسلا دوم (Raghuji Bhonsle II) کے درمیان جو لڑائی ہوئی اس کے نتیجہ کے طور پر بھونسلا راجہ کو برار کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا اور انہوں نے اپنے پرانے معاہدہ کے پیش نظر یہ علاقہ نظام سرکار کے حوالے کردیا۔ اس طرح سریور جو گونڈ سرداروں کا ایک اہم اور قدیم مرکز تھا آصف جاہی سلطنت کے تحت آگیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک عادل آباد کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔ البتہ کوئی ۱۹ سال بعد باغیوں نے فروری ۱۸۲۲ء کو عادل آباد کے ایک اہم قلعہ ماہور (Mahur) پر قبضہ کرلیا۔ بغاوت کو فرو کرنے کنٹنجنٹ فوج روانہ کی گئی جس نے اس قلعہ کو دوبارہ فتح کرلیا۔

عادل آباد کے ایک تعلقہ نرمل میں تین دہوں کے بعد (۱۸۵۸) میں گونڈوں

اور روہیلوں کی ایک اور بغاوت ہوئی جس کا تفصیلی ذکر روہیلوں کی بغاوتوں کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

مومن آباد میں فوجی بغاوت ۱۸۲۷ء

ریاست مہاراشٹر کے علاقہ مرہٹواڑہ کا مومن آباد ایک ضلع ہے جو دریائے جیونتی کے دونوں کنارے پر بسا ہوا ہے۔ یہاں جوگئی کا ایک بہت ہی قدیم مندر تھا اور شاید اسی تناسب سے مومن آباد کا قدیم نام امباجوگئی تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ مومن آباد راجہ جیت پال کا پائے تخت تھا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق جاتی بالا کلیان کے راجاؤں کے ایک باج گذار راجہ تھا جس نے امباجوگئی کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ امباجوگئی کے مختلف راجاؤں نے کئی لڑائیاں لڑیں اور ۱۶۳۹ء میں زبردست لڑائی ہوئی جس کی وجہ سے اس کو کافی نقصان پہنچا اور بہت سے قدیم مندر برباد ہو گئے۔ جوگئی مندر کے قرب و جوار میں پہاڑوں کا سلسلہ تھا جنہیں کاٹ کر جین اور برہمن مذہب کے پیروؤں نے کئی مندر بنائے۔ ایک مندر کے صحن میں ہاتھی کا ایک مجسمہ ہے جو سنگ تراشی کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ پرانے شہر کی فصیل کے ایک برج پر ۱۳ ویں صدی عیسوی کا بنایا ہوا ایک مندر ہے (جو ۱۸۷۶ میں دریافت ہوا تھا) جس کے ایک کتبہ پر سن ۱۶۶۲ء کندہ ہے۔ جوسنگھانا یا سمبھا کے دور کا سمجھا جاتا ہے۔ یہ غالباً دیوگری کے تیسرے یادو راجہ کا زمانہ تھا۔ مومن آباد کے مغربی حصہ میں شیوا کی ایک بڑی مورتی بھی ہے۔

ایک طرف تو مومن آباد جینیوں اور برہمنوں کے قدیم مندروں کا مرکز ہے تو دوسری طرف وہ حضرت سید راجے کا بھی وطن ہے جنہوں نے یہاں اسلام کی اشاعت کی تھی اس کے علاوہ یہ شہر مسعود کرمانی، خواجہ مخدوم محمود شاہ صدیق انصاری جیسے نامور بزرگان دین کا مسکن بھی رہا ہے۔

جب یہاں مسلمان حکمرانوں کا دور شروع ہوا تو اسکا نام مومن آباد رکھا گیا۔

حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج کی تشکیل کے چند سال بعد (۱۸۱۷) مومن آباد کو اس فوج کا ایک اہم مرکز بنا دیا گیا جو ۱۹۰۳ء تک چھاؤنی کی حیثیت سے باقی رہا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ مرہٹہ پیشواؤں کی رہنمائی میں جو بغاوتیں مرہٹواڑہ کے علاقوں میں پھیل رہی تھیں

انہیں سرعت سے کچلا جا سکے۔[1]

مومن آباد میں فوجی بغاوت (۱۸۲۷ء) سے پہلے ریاست کے مختلف مقامات پر بے چینی اور ہلچل پھیلی ہوئی تھی۔ عادل آباد میں مہور (Mahur) کا قلعہ فتح کر لیا گیا تھا سرونچہ (Sironcha) اور مہادیو پور کے زمینداروں نے بغاوت کر دی تھی اور ان بغاوتوں کو حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج نے بڑی بے دردی سے کچل دیا تھا' حکومت کے نظم و نسق میں بھی مایوسی اور زوال کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ ان حالات میں مومن آباد میں مقیم حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج میں ۱۸۲۷ء میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سپاہیوں میں اس قدر غیض و غضب پھیل گیا تھا کہ تیسری انفنٹری کے ایک سپاہی نے لفٹننٹ کرنل ایون ڈیوس (Evan Davies) کو قتل کر دیا۔ اس اشتعال کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ مقامی فوج کے لباس میں بالکل اچانک اور نئی تبدیلیاں کی گئیں اس کے علاوہ کچھ اور اقدامات کئے گئے جو سپاہیوں کی مرضی کے بالکل خلاف تھے۔ ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک جونیئر افسر نے دو سپاہیوں کی زبردستی حجامت کرا دی۔ ان واقعات کے بعد ۵ مئی ۱۸۲۷ء کو پریڈ گراؤنڈ پر جب سپاہی جمع ہوئے تو انہوں نے اپنا جھنڈا گاڑ دیا اور اپنی بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ کرنل ڈیوس فوراً اس مقام پر پہنچ کر ناراض سپاہیوں کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک سپاہی نے ان پر گولیاں چلا دیں اور دوسرے سپاہیوں نے کرنل کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے پھر کیا تھا آپس میں گولیاں چلنے لگیں۔ کئی باغی سپاہی وہیں ڈھیر ہو گئے اور جو بچ گئے تھے ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سخت سزائیں دی گئیں جس افسر کی غلط اور نازیبا حرکت کی وجہ سے یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا اس کو اپنی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

رائچور میں بغاوت ۱۸۴۱ء[2]

اس ضلع کا شاندار اور بہت ہی قدیم ماضی رہا ہے جسکی ابتداء سمجھا جاتا ہے

---

[1] The Hydrabad State committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol I (1800 - 1857) 1957, P 115.

[2] Gazetteer of India, Mysore state, Raichur, 1970

کہ موریہ خاندان کے راجہ اشوک سے ہوئی۔ پھر یہ ضلع ستواہناد ( )،
بادامی چالوکیہ، پلاوا اور راشٹراکوٹا کی ریاستوں کا حصہ رہا۔ دورِ وسطیٰ میں ورنگل کے
وجے نگر راجوں (۱۳ ویں صدی عیسوی) کے زیرِ نگین آیا اور اس زمانہ میں رائچور کی
شہرت اپنی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے بعد بہمنی (۱۳۴۷ - ۱۵۲۶) اور عادل شاہی
(۱۴۸۹ - ۱۶۸۶) سلطنتوں میں شامل رہا۔ جب اورنگ زیب نے عادل شاہی حکومت
کو شکست دی تو یہ ضلع بھی مغلیہ سلطنت سے منسلک ہو گیا۔ یہاں رائچور کے قلعہ، جس کا
اس علاقہ کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار ہوتا تھا، کا بھی ذکر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کہا
جاتا ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر گورے گنگیا ریڈی (Gore Gangayya Reddy) نے
(۱۲۹۴) میں کی جو کاکتیہ (Kakatiya) خاندان کی مشہور رانی ردراما دیوی
(Rudhramma Devi) کا جنرل تھا۔

کمپنی سرکار نے ۱۸۵۳ میں نظام سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی رو سے رائچور کو کمپنی
سرکار کے حوالے کر دیا گیا تھا اور سات سال بعد ایک اور معاہدہ (۱۸۶۰) کے بموجب
رائچور کو دوبارہ نظام سرکار کے علاقہ میں شامل کر دیا گیا جو ۱۹۴۸ تک آصف جاہی
حکومت کے کرناٹک علاقہ کا ایک حصہ بنا رہا۔ اس سے تقریباً ایک سو سال پہلے یعنی
(۱۸۴۱) میں یہی رائچور نظام اور کمپنی سرکار کے خلاف ایک اہم بغاوت کا مرکز بن گیا
جس کو بادامی کی شورش کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ضلع رائچور کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ جاننا بھی باعث دلچسپی ہوگا
کہ آخر اس کا نام رائچور کیوں اور کیسے ہوا اور وہ کن کن تبدیلیوں سے گزرا۔ کنڑ زبان میں
اس کو رائے چورو (Raya choorу) کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح اس طرح کی جاتی
ہے کہ رائی (Rai) تلگو زبان میں پتھر کو کہتے ہیں اور اوُرو (Ooru)
کے معنی ہیں گاؤں یعنی "پتھروں کا گاؤں" (Town of stones) کیونکہ یہ علاقہ
پتھریلا ہے اور یہاں پہاڑوں کی کثرت ہے۔ اس کو راچا اوُرو (Racha Uoor)
بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ راچا (Racha) اخذ کیا گیا ہے
راجہ سے اور اوُرو کے معنی مقام کے ہیں ان دونوں کو ملا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ
"راجاؤں کا گاؤں"۔ البتہ بہمنی سلاطین کے زمانہ میں اس کو فیروز نگر کے نام سے پکارا جاتا

تھا۔ اب آگے ذکر چھیڑیں رائچور کی بغاوت کا!

حیدرآباد کے رزیڈنٹ جنرل فریزر (General J. S. Fraser) (۱۸۴۸ - ۱۸۵۲) کو مسلسل یہ رپورٹیں مل رہی تھیں کہ ضلع رائچور کے ایک مقام دیودرگ (Deo Durg) میں ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت باغی بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ ان باغیوں کی قیادت ایک برہمن نرسنگ راؤ اور دوسرا عرب (چاوس) جمعدار کھرن (Khoram) کر رہے ہیں۔ یہ بھی گمان کیا جا رہا تھا کہ شاید اس بغاوت کے پیچھے ستارا کے راجہ کا ہاتھ بھی ہو۔ غرض یہ کہ ان باغی رہنماؤں نے ایک طاقتور عرب فوجی دستے کی مدد سے بادامی کے قلعہ پر حملہ بول دیا تاکہ اس قلعہ سے انگریز فوجوں کو نکال باہر کیا جائے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے نظام سرکار نے پہلے اپنی فوج روانہ کی لیکن یہ فوج باغیوں سے لڑنے کی بجائے ان کے ساتھ مل گئی۔ اسکے بعد رزیڈنٹ نے مداخلت کی اور مکتفل، بلارم اور مومن آباد میں مقیم فوجوں کو بادامی کے قلعہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ ان کے علاوہ جنوبی مہاراشٹرا (کمپنی سرکار کے علاقہ) سے بھی فوجوں کو روانہ کیا گیا۔

انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کے حوصلے کافی بلند ہیں۔ انکے پاس روپیوں اور سپاہیوں کی کمی نہیں ہے۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ بغاوت کے ابھرتے ہوئے یہ جذبات کہیں عام مسلمانوں میں نہ پھیل جائیں۔ ان کے اس اندیشے کی بنیاد یہ تھی کہ باغیوں کے بڑی تعداد عربوں کی تھی۔ انہیں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ شہر حیدرآباد سے چھ سو (۶۰۰) کے قریب عرب اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے بادامی روانہ ہو گئے ہیں اور انہیں اس کا بھی علم تھا کہ ریاست حیدرآباد کے مختلف حصوں میں تقریباً ۵ ہزار عرب مقیم اور صرف شہر حیدرآباد میں ۳ ہزار عرب آباد ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر انہوں نے بوکھلاہٹ میں یہ حکم دے دیا کہ شہر حیدرآباد سے کوئی بھی عرب باغیوں کی مدد کے لئے جا رہا ہو تو اسے گولی مار دی جائے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رزیڈنٹ نے کمپنی سرکار کے اعلیٰ عہدیداروں کو یہ مشورہ

---

1 The Hydrabad state committee, The freedom Struggle in Hydrabad Vol. II. (1800-1857) 1956. PP. 181-186.

بھی دیا کہ اس نوعیت کے خطروں سے ہر وقت کے لئے نجات پانے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ عربوں اور دوسرے بیرونی عناصر کو ہندوستان سے نکال دینے پر غور کیا جائے۔ کمپنی سرکار نے اس تجویز پر آئندہ غور کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ان تمام وجوہات کے پیش نظر انگریز یہ چاہتے تھے کہ اس بغاوت کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔ چنانچہ مختلف فوجی چھاؤنیوں سے اکٹھا کی ہوئی کثیر فوج نے بادامی کے قلعہ، جو بہت ہی مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر ایک زبردست حملہ کیا اور آخرکار ان فوجوں نے ۱۶ر جون ۱۸۴۱ء کو اس قلعہ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی جس میں کنٹنجنٹ فوج کا بہت نمایاں حصہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سو عربوں کو گرفتار کر لیا گیا اور جو باغی سپاہی بچ نکلے تھے ان کا تعاقب کرنے کیلئے فوجی دستے روانہ کئے گئے اور یہ مہم دسمبر ۱۸۴۱ء میں اختتام کو پہنچی۔ اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد رزیڈنٹ نے کمپنی سرکار کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ انہیں اس کی اجازت دی جائے کہ وہ نظام کی حکومت سے یہ درخواست کرے کہ ان کی ریاست میں پہاڑوں پر بنائے ہوئے قلعوں کو توڑ دیا جائے تاکہ آئندہ بغاوتوں کا سدباب ہو سکے۔ لیکن کمپنی سرکار نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

رائچور کی بغاوت (۱۸۴۱ء) میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست

نرسنگ راؤ
کھران چاؤس

یہ دونوں بغاوت کے لیڈر تھے۔ انہیں کیا سزا دی گئی اس کا علم نہ ہو سکا۔

تیسرا دور ۱۸۵۷ء — ۱۸۸۰ء

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کا پس منظر اور برٹش رزیڈنسی پر باغیوں کا حملہ

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد کا پس منظر

اس شہرہ آفاق جدوجہد کی ابتدا ۲۳ جنوری ۱۸۵۷ء سے ہوئی جب ڈم ڈم (کلکتہ) کے سپاہیوں نے نئے جاری کئے گئے کارتوس استعمال کرنے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ خبر برک پور چھاؤنی پہنچی تو منگل پانڈے نے جو ایک برہمن سپاہی تھا دو انگریز فوجی افسروں کو مار ڈالا، کیونکہ ان افسروں نے منگل پانڈے کو نئے کارتوس استعمال کرنے پر مجبور کیا تھا اسی بناء پر منگل پانڈے کو ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

بات اصل یہ تھی کہ کمپنی سرکار نے اپنی فوجوں کے لئے ۱۸۵۷ء میں ایک نئی ان فیلڈ رائفل استعمال کرنا شروع کی اور اس رائفل میں جو کارتوس استعمال کئے جاتے تھے ان پر سور اور گائے کی چربی لگائی جاتی تھی اور ان کارتوسوں کو رائفل میں داغنے سے پہلے چربی کے کور کو دانتوں سے نکالنا پڑتا تھا اسی لئے ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بغاوت کا یہ شعلہ ۱۰ مئی کو میرٹھ کی چھاؤنی میں پہنچا اور پھر یہ آگ دیکھتے ہی دیکھتے اودھ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ، کانپور، جھانسی، گوالیار فیض آباد، بنگال اور بہار کے کچھ حصوں اور دہلی وغیرہ میں پھیل گئی۔

لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اتنی عظیم بغاوت صرف کارتوسوں میں سور اور گائے کی چربی استعمال کئے جانے کی بناء پر شروع ہوئی۔ اس بغاوت کے پیچھے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان میں کمپنی سرکار کے سیاسی طور پر استحکام اور اپنے ایک سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ اور

جبر و استبداد کی جو معاشی، سیاسی، فوجی اور مذہبی پالیسیاں اختیار کیں۔ ہندوستان کی دست کار صنعتوں کو تباہ کیا گیا تاکہ انگلستان میں صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کیا جائے، یہاں کے قدیم زرعی نظام میں تبدیلی لاکر ہندوستانی کسانوں کو کنگال بنا دیا اور اپنے خزانوں کو مالا مال کر لیا۔ ڈلہوزی (۱۸۴۸ - ۱۸۵۶) کی جاگیروں اور چھوٹی ریاستوں کے انضمام کی پالیسی نے سیکڑوں جاگیرداروں، رجواڑوں اور تعلقداروں کو بے سہارا کر دیا، ان جاگیروں میں ملازم مولویوں، ملاؤں اور ہزاروں سپاہیوں کو بے روزگار بنا دیا انگریز مشنریوں کے ذریعہ مسیحی مذہب کا بڑے پیمانے پر پرچار شروع کر دیا۔ ۱۸۵۰ء کے ۲۱ ویں ایکٹ کی رو سے کمپنی سرکار نے ان ہندوستانیوں کو جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا انہیں اپنی آبائی جائداد کی وراثت کا حق دے دیا۔ اس طرح ہندو اور مسلم مذہب کے پیروؤں پر ایک کاری ضرب لگائی اور کمپنی سرکار کی فوجی چھاؤنیوں میں کام کرنے والے ہندوستانی سپاہیوں کو گورے فوجیوں کے مقابلے میں کم تنخواہیں اور انکے ساتھ حقارت آمیز سلوک۔ یہ وہ اسباب تھے جس کی وجہ سے اندر ہی اندر ہندوستانی عوام میں کمپنی سرکار کے خلاف بددلی، بے چینی اور نفرت کے جذبات بھڑک رہے تھے اور کارتوس کی ایک چنگاری نے بغاوت کی اس آگ کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا اور ہندوستانی سماج کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو کمپنی سرکار کی عوام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح متاثر نہ ہوا ہو۔ ان اہم اسباب کے علاوہ ۱۹ ویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہوں میں ہندوستان اور آس پاس کے علاقوں میں انگریز فوجوں کو پہلی افغان جنگ (۱۸۳۸ - ۱۸۴۲) پنجاب کی جنگ (۱۸۴۸ - ۱۸۴۹) اور کریمیا جنگ (۱۸۵۵ - ۱۸۵۶) میں افسوسناک شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریز فوجوں کی ان ناکامیوں نے ہندوستانی عوام میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ ایشیائی ممالک کی فوجیں بھی اس قابل ہو گئی ہیں کہ وہ انگریز فوجوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتی ہیں اور اسی بنا پر یہ احساس بھی اجاگر ہوا کہ اب ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کے تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ اسی لئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عدیم المثال جدوجہد میں جہاں ایک طرف ہندوستان کے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، ناناصاحب، مرہٹہ جنرل تانتیا ٹوپے اور ان کے ساتھی عظیم اللہ خاں اور اودھ کی حضرت محل تھیں تو دوسری طرف

ہزاروں فوجی، مذہبی پیشوا، وہابی تحریک کے سرگرم کارکن، کسان اور غریب عوام، ہندو مسلم سب ہی شریک تھے۔

یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ اس بغاوت (۱۸۵۷ء) کے اہم مراکز دیسی ریاستیں اور ان کے صدر مقام رہے ہیں اور ان بغاوتوں کے رہنماؤں میں ان ریاستوں کے کئی نوابوں، مہاراجوں اور مہارانیوں کے کئی نام گنوائے جاسکتے ہیں اور جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ ہندوستان کی تاریخ (دور جدید) کا یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں دیسی ریاستوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ انہیں اپنا ساجھے دار بنا کر اپنے معاشی اور سیاسی موقف کو مستحکم بنایا اور وسعت دی، عوام کو خوب لوٹا اور انکی تحریکوں اور بغاوتوں کو بے دردی سے کچل دیا۔ لیکن جب ان سامراجیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ دیسی ریاستوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کہیں خود ان کے لئے خطرہ نہ بن جائے تو انہوں نے ان ریاستوں کو کمزور کرنے کے لئے ان میں پھوٹ ڈالنے اور آپس میں لڑانے کی پالیسی اختیار کی۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لارڈ ڈلہوزی کے دور میں (۱۸۴۸-۱۸۵۶ء) میں ایک ایسا ضابطہ (The Doctrine of Lapse) بنایا گیا جس کی رو سے اگر کوئی بادشاہ یا راجہ لاولد مرجائے تو اس کی ریاست کو برطانوی ہند کے علاقے میں ضم کردیا جاتا۔ راجہ کے متبنیٰ لڑکے کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اور یہ ایک اتفاق کی بات تھی کہ ڈلہوزی کے دور میں ایسے کئی راجوں کا انتقال ہوا جن کی کوئی مرد اولاد نرینہ نہ تھی چنانچہ مذکورہ بالا ضابطہ کی رو سے جھانسی، ناگپور، ستارا، جے پور، سمبھل پور اور بھگت، اڑیسہ کی ریاستوں کو انگریزوں نے ہڑپ لیا۔ پیشوا کے متبنیٰ لڑکے نانا صاحب کو وظیفہ سے محروم کردیا گیا۔ حالانکہ ہندو روایات کے مطابق متبنیٰ لئے ہوئے لڑکے کو تمام حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اسی طرح کرناٹک کے نواب کے منتخبہ وارث کو بھی وظیفہ نہیں دیا گیا اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ پر من گھڑت الزامات لگا کر علیحدہ کردیا گیا اور ان کی سلطنت کو برطانوی ہند کے علاقہ میں ضم کردیا گیا۔ غرض یہ کہ اس ضابطہ کے خلاف سارے ہندوستان میں کمپنی سرکار کے خلاف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور ۱۸۵۷ء کے فوجی بغاوت کے فوری اسباب

میں یہ بھی ایک اہم وجہ تھی۔

مذکورہ بالا سطور میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اسباب اور اس کے پھیلاؤ اور وسعت کے بارے میں صرف چند اشارے کئے گئے ہیں اس لئے کہ اس موضوع پر اب تک درجنوں کتابیں، سیکڑوں کتابچے اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اس لئے یہاں مزید تفصیلات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ان امور کا ذکر صرف ایک پس منظر کے طور پر کیا گیا ہے۔

اس تعلق سے پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی مشہور کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" (تلاشِ ہند) میں اس کو ایک عظیم بغاوت سے تعبیر کیا اور لکھا ہے کہ "اس کو صرف ایک غدر (فوجی) نہیں کہا جا سکتا" وہ بہت تیزی سے پھیلا اور ایک عوامی بغاوت اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا روپ اختیار کر لیا۔"

شمالی ہند کے اکثر علاقوں میں اس انقلابی بغاوت کے پھیلاؤ اور عوام کے جوش و خروش کی خبریں تیزی سے حیدر آباد میں گشت کرنا شروع ہوئیں اور انگریز فوجوں کی ابتدائی شکستوں نے حیدر آبادی مجاہدین کے حوصلوں کو اور بلند کیا۔ چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو حیدر آباد شہر کے ہزاروں عوام نے مولوی علاؤ الدین اور طرّہ باز خاں کی رہنمائی میں برٹش رزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ اس معرکہ میں سیکڑوں مجاہدین آزادی نے اپنے جان و مال کی قربانیاں دیں۔

رزیڈنسی پر حملہ کا پس منظر

برٹش رزیڈنسی پر ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو مجاہدین آزادی کے حملہ کو موقتی اچانک اور صرف جذباتی نوعیت کا نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اس کے پیچھے (۳) زمانے کے کئی سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کارفرما تھے۔ اس لئے یہاں ان حالات کا مختصراً جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ہم اس عظیم حملہ کی نوعیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔

۱۹ ویں صدی کے ابتدائی برسوں میں سیکڑوں عربوں کو ریاستی ملازمت میں شامل کیا گیا، ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں سے جنگ جو روہیلے اور افغان دکن میں

بس گئے، راجہ چندو لعل نے پنجاب سے سکھوں کو یہاں لاکر بسایا۔ اس طرح شہر حیدرآباد ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مہاجرین کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ شمالی ہند کے یہ مہاجرین نہ صرف یہاں آباد ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے انگریز دشمن جذبات و خیالات کا بیج بھی دکن کی سرزمین میں بو دیا۔ صورت حال یہ تھی کہ شہر کی آبادی میں روہیلوں، سکھوں افریقیوں اور مغلوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نئے حالات ریاستی حکومت کے لئے بہت ہی تشویشناک تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند میں جب وہابی تحریک (جس کا مرکز حیدرآباد تھا) زور پکڑتی گئی تو انگریزوں کے خلاف "جہاد" کا نعرہ بلند ہونا شروع ہوا۔

ان دھماکو حالات میں مئی ۱۸۵۳ء میں ڈلہوزی کے زمانہ میں کمپنی سرکار اور نظام کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رو سے کنٹنجنٹ فوج کے علاوہ ایک معاون فوج (Auxiliary Force) کا بھی قیام عمل میں آیا، جس کے تمام اخراجات نظام سرکار کو برداشت کرنے تھے۔ اس کے لئے برار، عثمان آباد اور رائچور کے اضلاع کمپنی سرکار کے حوالے کر دیئے گئے۔ برار کی حوالگی نے ریاست کے تمام طبقات میں انگریزوں کے خلاف غصہ و نفرت کی لہر دوڑا دی۔

مختصر یہ کہ اس ۵۵ سالہ دور (۱۸۰۰ - ۱۸۵۷ء) میں نور الامراء اور راجہ راؤ رمبا کی شخصی بغاوتوں کے بعد سے ریاست کے مختلف مقامات پر بغاوتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ ۱۸۱۲ء میں کیپٹن گارڈن کے خلاف نظام کی فوجوں نے بغاوت کی۔ اسی سال نظام آباد میں بھی بغاوت ہوئی، ۱۸۲۷ء میں مومن آباد میں لفٹننٹ کرنل ڈیوس کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں سکندرآباد میں متعین سب سی ڈری فوج نے بھتہ کے بغیر تنخواہ لینے سے انکار کر دیا، ۱۸۵۱ء میں اورنگ آباد میں مقیم کنٹنجنٹ فوج میں بے چینی پھیل گئی اور ذوالفقار علی بیگ پر مقدمہ چلایا گیا، اور ۱۸۵۵ء میں بلدم کی فوج کی بغاوت ہوئی اور بریگیڈیر Brigadier پر حملہ کیا گیا۔

اس پس منظر میں شمالی ہند میں پھیلتی ہوئی فوجی بغاوت اور ابتدائی زمانے میں باغیوں کی کامیابیوں کی خبریں بڑی تیزی سے حیدرآباد میں پھیل گئیں اور ریذیڈنسی پر حملہ سے پہلے سارے شہر میں انگریز دشمن جذبات بھڑک اٹھے۔ پوشیدہ طور پر جلسے منعقد کئے گئے، مساجد میں ولولہ انگیز تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ شہر کی دیواروں پر پوسٹرس

اور پلے کارڈس (اردو اور فارسی میں) چسپاں کئے جا رہے تھے۔ ان پوسٹروں میں اللہ اور اسلام کے نام پر عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ "کافروں" (انگریزوں) کے خلاف علم بغاوت بلند کریں۔ ایک پوسٹر میں تو یہ بھی لکھا تھا کہ "خداوند تعالےٰ اور رسول اللہ صلعم کی مدد افضل الدولہ بہادر کے ساتھ ہے اس لئے انہیں ڈرنا یا خائف ہونا نہیں چاہیئے۔ اگر انہیں ڈر ہے تو پھر انہیں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جانا چاہیئے۔" یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اگر کسی شخص نے ان پوسٹروں کو نکالنے کی کوشش کی تو اس پر خداوند تعالےٰ اور اسکے رسول صلعم کا قہر نازل ہوگا۔"

اس اشتعال انگیز ماحول میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو رزیڈنسی پر حملہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اورنگ آباد اور مرہٹواڑہ کے دوسرے علاقوں کے جن فوجیوں نے اپنی ملازمت چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی تھی انکا ایک جتھا چیتا خان کی رہنمائی میں (جنکی گرفتاری کے لئے تین ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا) شہر حیدرآباد پہنچا۔ انہیں فوراً سر سالار جنگ نے گرفتار کر لیا اور اسکی اطلاع رزیڈنٹ کو بھی دے دی گئی۔ ان گرفتاریوں نے شہر کے عوام کو مشتعل کر دیا۔ مکہ مسجد میں ان گرفتاریوں کے خلاف ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو زبردست جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں شریک ہونے والے سربرآوردہ اصحاب رشید الدین اقتدار الملک، عظمت جنگ، لشکر جنگ، محمد یار خاں اور حکیم ابراہیم تھے۔ یہاں یہ طے پایا کہ چار مولویوں کا ایک وفد نظام سے ملے اور چیتا خاں اور ان کے ساتھیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کرے اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر رزیڈنسی پر حملہ کر دیا جائے۔ جیسے ہی یہ خبر سالار جنگ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے عربوں کا ایک طاقتور دستہ روانہ کیا اور مکہ مسجد میں جمع شدہ مجمع کو عارضی طور پر منتشر کر دیا۔ لیکن شام میں ۶ بجے مکہ مسجد میں پھر لوگ جمع ہونا شروع ہوئے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد ۵۰۰ مجاہدین کا ایک جتھا مولوی علاؤ الدین کی رہنمائی میں روانہ ہوا، چار مینار کے قریب جہانگیر خاں اور ان کے ساتھی جلوس میں شریک ہو گئے۔ جب یہ جلوس بیگم بازار (جو شہر کے مضافات کا حصہ تھا) پہنچا تو روہیلوں کے لیڈر طرہ باز خاں اور ان کے ساتھی شامل ہو گئے اور یہ جتھا رزیڈنسی کی طرف بڑھتا گیا۔ راستہ میں ہزاروں عوام اس میں شریک ہوتے گئے اور رزیڈنسی کے قریب پہنچنے تک انسانوں کا ایک سمندر تھا جو پورے غیض و غضب اور

جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اسی دوران رزیڈنٹ کے حکم کے بموجب رزیڈنسی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ جن مقامات سے باغیوں کے داخل ہونے کا امکان تھا وہاں خطرناک سنگین لگا دی گئیں۔ رزیڈنسی کے سامنے دو قدیم مکان تھے۔ ایک مکان ابن صاحب (نواب فیاض یار جنگ) کا جس میں کئی برسوں تک عدالت خفیہ تھی اور دوسرا مکان گوپال داس کا باغ۔ رزیڈنسی پر حملہ سے پہلے مجاہدین کے دو گروہوں نے ان مکانوں کی چھت پر اپنا فوجی دستہ (مورچہ) قائم کر دیا تاکہ وہاں سے رزیڈنسی کے اندرونی حصوں اور فوجی اہمیت کے حامل مقامات پر آسانی سے حملہ کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے دلکھ باغ پر قبضہ کر لیا اور ان مکانوں کی چھت سے ۶، ۷ بجے شام سے صبح ۴ بجے تک دونوں طرف سے مسلسل گولہ باری جاری رہی۔ صبح ہونے سے پہلے مجاہدین مکانوں کے پچھلے حصوں میں سوراخ کر کے باہر نکل آئے اور شہر میں پناہ لی۔ حالانکہ سالار جنگ نے عربوں کے ایک طاقتور دستے کو وہاں مقرر کیا تھا تاکہ باغی باہر نکلنے نہ پائیں۔ لیکن عرب دستہ کی چشم پوشی سے فائدہ اٹھا کر مجاہدین بڑی ہوشیاری سے بچ نکلے۔

باغیوں نے ایک اور طاقتور حملہ رزیڈنسی کے اس گیٹ پر کیا تھا جو بتلی باؤلی کی طرف تھا اور دروازہ کے قلابوں کو بھی توڑ دیا تھا۔

غرض یہ کہ رات تمام گولی باری کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کی صبح تک لڑائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ مدراس کی گھوڑ سوار فوج کی توپوں کی گولہ باری سے ۳۰ تا ۴۰ مجاہدین شہید ہوئے۔ کتنے فرنگی سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے اسکا پتہ نہ چل سکا۔ سر سالار جنگ نے خط کے ذریعہ رزیڈنٹ کو یہ اطلاع دی کہ شہر سے بارہ میل (۱۲) کے فاصلہ پر طرہ باز خاں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مولوی علاؤالدین کئی دنوں تک روپوش رہے اور بالآخر شہر کے قریب منگل پلی گاؤں (ابراہیم پٹن تعلقہ) میں گرفتار ہو گئے۔ ان دونوں مجاہدین پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں حبس دوام کی سزا دی گئی۔ انکی جائدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ طرہ باز خاں نے حراست سے فرار ہونے کی کوشش کی انہیں دوبارہ گرفتار کرتے وقت گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ مولوی علاؤالدین مختلف مقامات پر پندرہ، سولہ مہینے روپوش رہے۔ ایک مخبر کی اطلاع پر انہیں گرفتار کیا گیا اور

حبس دوام کی سزا دی گئی۔ اور جزیرہ انڈمان میں جلاوطن کردیا گیا۔ جہاں وہ ۶۷ سال کی عمر تک مقید رہے۔ کمپنی سرکار نے اعلےٰ معیار کے ہتھیاروں اور تربیت یافتہ اور منظم فوج کے بل بوتے پر مجاہدین جن کے پاس صرف لاٹھی، برچھے اور دیسی بندوقیں تھیں، کی بغاوت کو کچل تو دیا لیکن بغاوت کی یہ چنگاری بجھی نہیں بلکہ اندر ہی اندر دھیمے دھیمے سلگتی رہی اور وقفہ وقفہ سے وہ شعلوں میں تبدیل ہوتی رہی۔

حیدرآباد کے عوام کی اس عظیم بغاوت کو کچل دینے اور انگریزوں سے وفاداری کا ثبوت دینے کے صلہ میں پانچویں آصف جاہ افضل الدولہ کو دس ہزار پونڈ اور میر تراب علی خاں سرسالار جنگ کو تین ہزار پونڈ کے تحائف دیئے گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شوراپور کی جاگیر جس کی آمدنی تین لاکھ ۲۰ ہزار سالانہ تھی نظام کے شاہی اختیارات کے تحت کردی گئی۔ کیونکہ شوراپور کے راجہ انگریزوں کے خلاف ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ کنٹنجنٹ فوج کے اخراجات کے سلسلہ میں (۵۰) پچاس لاکھ کا جو قرضہ واجب الادا تھا وہ معاف کردیا گیا۔ اور رائچور اور عثمان آباد کے اضلاع نظام کو سونپ دیئے گئے۔ نظام اور سالارجنگ نے حیدرآباد میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچل کر ہندوستان میں کمپنی سرکار کے راج کو باقی رکھنے کا جو "اہم کارنامہ" انجام دیا اس کا اندازہ بمبئی کے گورنر کے اس جملہ سے ہوتا ہے جو اس نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ "اگر نظام ریاست حیدرآباد بڑھ گیا تو سب کچھ چلا گیا"۔ سوغات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء میں افضل الدولہ کو سند عطا کی گئی اور ملکہ وکٹوریہ نے انہیں جی۔ سی۔ ایس۔ آئی اور اسٹار آف انڈیا کا خطاب دیا اور ریاست حیدرآباد کو نئے سکہ (حالی سکہ) کے چلن کی اجازت بھی مل گئی۔ لیکن سالارجنگ کو یہ سوغات شاید راس نہ آئے کیونکہ جب وہ اور رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نظام کے دربار کے ایک کمرہ کے قریب ہاتھ میں ہاتھ ملائے چہل قدمی کررہے تھے کہ جہانگیر خاں۔ روہیل کھنڈ کا ایک پٹھان نے ان دونوں پر گولی چلائی۔ جب نشانہ خطا ہوا تو اس بہادر نے ان پر تلوار سے وار کیا لیکن سالارجنگ کے مصاحبوں نے ان دونوں کو بچالیا اور جہانگیر خاں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس "وفادار" دیوان پر ایک اور ناکام قاتلانہ حملہ ۱۸۶۸ء میں کیا گیا۔ سالارجنگ کا انتقال ۸ فروری ۱۸۸۳ء کو ہوا۔

ان تمام تحفے اور تحائف کے باوجود رزیڈنسی پر حملہ کے بائیس (۲۲) سال بعد بھی ریاست حیدرآباد میں حالات پُرامن نہیں ہوئے۔ بلکہ ریاست کے مختلف حصّوں میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۹ء تک بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے پیچھے تانتیا ٹوپے کے پیروؤں اور ستارا کے راجہ کے کارندوں کا ہاتھ تھا جو ریاست کے مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ چنانچہ شورا پور (۱۸۵۸ء)، مل کھیڑ اور کیل (۱۸۵۸ء)، روہیلوں کی بغاوت (۱۸۵۹ء)، اورنگ آباد (۱۸۵۹ء)، بھالکی (۱۸۶۷ء)، واسدیو بلونت پھڈکے کی بغاوت (۱۸۷۹ء) اور رام اپا کی بغاوت (۱۸۷۹ء) قابل ذکر ہیں۔

برٹش رزیڈنسی پر حملہ کی قیادت کرنے والے رہنماؤں کے حالات زندگی کا اجمالاً ذکر

مولوی علاؤالدین:- ۱۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو حیدرآباد میں برٹش رزیڈنسی پر مجاہدین آزادی کا جو شہرہ آفاق حملہ ہوا تھا اس کے نامور رہنما مولوی علاؤالدین اور ان کے ساتھی طرّہ باز خان تھے۔

مولوی صاحب کا حیدرآباد کے ایک مشہور اور اعلیٰ خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ مولوی حافظ شجاع الدین تھے جو نہ صرف اپنی علمی قابلیت، بلکہ روحانی تقدس اور صوفی مشرب ہونے کے لحاظ سے ایک ذی مرتبہ شخصیت تصور کیے جاتے تھے۔ مولوی صاحب اقتدار الدولہ جو شمس الامراء امیر پائیگاہ کے بیٹے اور ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے داماد تھے۔ کے یہاں ملازم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اقتدار الدولہ کو اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔ مکہ مسجد کے جلسوں میں جہاں وہابی تحریک کے رہنماؤں کی تقاریر ہوا کرتی تھیں وہ عام طور پر شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ ان کی ہمت افزائی اور ایما پر مولوی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نمایاں حصّہ لیا ہو۔ مولوی صاحب نے کمیشن کے سامنے جو اُن پر مقدمہ چلانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا اپنے بیان میں کہا کہ رزیڈنسی پر حملہ کے چند روز پہلے انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ ارباب حکومت کے پاس ایسے چار اشخاص کے نام درج ہیں جو رزیڈنسی پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ تین اصحاب مولوی صاحب کے علاوہ مولوی ابراہیم، مولوی عبداللہ اور مردہ محمد چاند تھے۔

جمعہ کے دن جب وہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے تو جہانگیر خاں نامی ایک پٹھان چند سپاہیوں کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر واقع مغل پورہ آیا اور بندوق سر کی بندوق سر

۱؎ The Hyderabad State Committee, The Freedom Struggle in Hyderabad VOL - II

ہونا ہی تھا کہ آس پاس کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ مولوی صاحب کو یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ لوگ ہر طرح سے لس ہوکر بغاوت برپا کرنے کے ارادہ سے آئے ہیں۔ مولوی صاحب اس مجمع میں تشریف لے گئے جو جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر چارمینار سے نکلا تو راستہ میں جہانگیر خاں اور طرہ باز خاں کے ساتھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ ہزاروں کا یہ لشکر ان دو انقلابیوں کی رہنمائی میں رزیڈنسی پر حملہ آور ہوا۔ لیکن انگریزوں کی بہتر منظم اور مسلح فوج کے مقابلہ میں ان مجاہدین کو پسپا ہونا پڑا۔ ۱۸ر جولائی کی صبح کو طرہ باز خاں گھوڑے پر سوار ہوکر چلے گئے لیکن مولوی صاحب پیدل نکل پڑے اور رازدار خاں پیٹھ سے ہوتے ہوئے قریب کی ایک پہاڑی (غالباً دتاتریہ کا پہاڑ) میں پورا دن گزارا۔ اس دوران انھوں نے خنجر سے اپنے سر کے بال اور داڑھی کو چھوٹا کرکے اپنا حلیہ بدل ڈالا۔ اس کے بعد دھول پیٹھ سے گزر کر فتح دروازہ پہنچے اور پھر شمس آباد کا رخ کیا۔ وہاں سے موضع "کوچل" گئے۔ یہاں کچھ دیر آرام لینے کے بعد فرخ نگر کے لیے روانہ ہوگئے۔ جہاں انھوں نے ہفتہ عشرہ قیام کیا۔ وہ کسی زیادہ محفوظ مقام پر رہنا چاہتے تھے اس لیے وہ اپنے چچا کے مقطعہ موضع آرپلہ میں رہے جہاں ان کی ملاقات سید بھکو سے ہوئی جو موضع بنگلور (معظم جنگ کی جاگیر کا ایک حصہ تھا) کے محصول دار تھا ان کے توسط سے وہ موضع بنگلور کے حولدار علی محمد سے ملے جنھوں نے پیر محمد کے مکان واقع منگل بلی میں ان کے قیام کا انتظام کیا، جہاں وہ ۱۵، ۱۶ مہینے روپوش رہے پھر انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے لیے (۵) ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ حیدرآباد کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام کی سزا سنائی گئی اور ۲۸ر جون ۱۸۵۹ء کو انڈومان بھیج دیا گیا جہاں ۱۸۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

طرہ باز خاں جمعدار :-

طرہ باز خان کا نام مجاہدین آزادی کے صفِ اول کے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں برٹش رزیڈنسی پر بہادرانہ حملہ کیا تھا۔ طرہ باز خاں کے والد کا نام رستم خاں تھا۔ وہ سرکاری ملازم نہ تھے بلکہ وہ ایک بہادر پٹھان، ذی عزت اور پروقار شخصیت کے حامل تھے جمعدار ان کے نام کا حصہ نہ تھا بلکہ ایک قسم کا اعزاز (جیسے جاگیردار) تھا جو عام طور پر فوجی خدمات کے صلہ میں عطا کیا جاتا تھا۔

وہ بُدھن خان (جو کمال خاں کے اجداد میں تھے) کے رشتہ دار تھے جن کی ڈیوڑھی بیگم بازار میں تھی۔ جو اس زمانہ میں باغیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کئی رہیلے اور پٹھان ان کے پاس ملازم تھے۔

انھوں نے تحقیقاتی کمیشن کو جو بیان دیا اس میں اپنا پیشہ بے روزگاری بتلایا ہے۔ اسی بیان سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ کمیشن کے سامنے انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ برٹش رزیڈنسی پر حملہ میں وہ شریک تھے۔ اور انھوں نے نمایاں حصّہ لیا تھا اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ اقدام انھوں نے کسی کے حکم، ایما اور ورغلانے پر نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے اس جدوجہد میں شریک ہوئے تھے۔ طرہ باز خاں نے فجر کی نماز ابن صاحب کے گھر پر ادا کی اور پھر اپنے گھر آگئے اور احتیاطی قدم کے طور پر بُدھن خاں کے گھر پر قیام کیا۔

انگریز فوجیوں کا ایک دستہ انھیں گرفتار کرنے آیا۔ اس دستہ کے افسر غلام یٰسین خاں نے طرہ باز خاں کو گرفتار کرکے لے جانے کے ارادہ سے بیانہ، بستر اور قرآن مجید کا ایک نسخہ بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ طرہ باز خاں پھرتی سے بیانہ سے نکل پڑے اور گھوڑے پر سوار ہوکر فرار ہوگئے۔ طرہ باز خاں کوتوال گڑھ سے ہوتے ہوئے مغل گڑھ گئے۔ وہاں سے وہ ست کارواں (Sat Karvan) پہنچے اور جنگل میں ایک عاشورخانہ کے قریب کھانے کے لیے اُترے۔ وہاں کے زمیندار کے سپاہیوں نے ان پر گولی چلادی، جس سے ان کی ران اور گھٹنے پر گولیاں لگیں اور ان کے کچھ ساتھی بھی زخمی ہوئے۔ زخمی ہونے کے باوجود گھوڑے پر سوار ہوکر جنگل میں نکل جانے کی کوشش لیکن انگریز فوج کے گھوڑسواروں نے ان کا تعاقب کیا ان کے گھوڑے کو گولی ماردی اور انھیں گرفتار کرکے حیدرآباد لایا گیا چوں کہ وہ شدید زخمی ہوگئے تھے اس لیے انھیں رزیڈنسی کے دواخانے میں علاج کے لیے شریک کردیا گیا۔ جب وہ روبہ صحت ہوئے تو ان پر مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام کی سزا سنائی گئی۔ انھیں انڈمان لے جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ وہ نگرانی کار سپاہیوں کی مدد سے ۱۸ جنوری ۱۸۵۹ء کو جیل سے فرار ہوگئے۔ دوسرے ہی دن ان کی گرفتاری کے لیے (۵) ہزار روپیوں کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ ہفتہ عشرہ کے اندر ہی قربان علی تعلقدار تو پران نے ان کے رہنے کے مقام کا پتہ لگایا۔ جب

پولیس افسر انھیں گرفتار کرنا چاہتے تھے تو طرہ باز خاں اور ان کے ساتھیوں نے تلواروں سے پولیس پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے گولیاں چلانا شروع کر دیں اور اس لڑائی میں طرہ باز خان اور ان کا ایک ساتھی مارا گیا۔ ان کی لاش کو حیدرآباد لایا گیا اور ایک شاہ راہ پر ان کی لاش لٹکا دی گئی۔ اس طرح یہ بہادر مجاہد آزادی نے آخری دم تک لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

رزیڈنسی پر حملہ ۱۸۵۶ء - ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے والے یا مدد کرنے والے کچھ اور اصحاب کی فہرست

پیر محمد ولد احمد علی :- رزیڈنسی پر حملہ (۱۸۵۷ء) کے بعد مولوی علاؤالدین نے روپوش ہو کر شہر حیدرآباد کو چھوڑ دیا اور اطراف کے چند دیہاتوں میں مختصر قیام کے بعد منگل پلی پہنچے اور وہاں پیر محمد کے گھر میں تقریباً دو سال تک روپوش رہے۔ منگل پلی، راجہ نریندر پرشاد کی جاگیر کا ایک حصہ تھا جو تعلقہ ابراہیم پٹن میں شامل تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تعلق سے جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کے سامنے بیان دینے والوں میں سب سے اہم شخص پیر محمد تھے۔ پیر محمد کے بیان کے مطابق ان کے بھتیجے محمد علی (جو بنگلور کے حوالدار تھے) ان کے گھر آئے اور یہ اطلاع دی کہ مولوی علاؤالدین رزیڈنسی پر حملہ کرنے والے ایک رہنما ان کے یہاں روپوش ہیں۔ دوسرے دن پیر محمد، مولوی صاحب سے ملے اور اپنے گھر میں ان کے رہنے کا معقول بندوبست کر کے انھیں اپنے گھر منتقل کیا۔ پیر محمد کا کہنا تھا کہ مولوی صاحب سے یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے وہ مولوی صاحب سے واقف نہ تھے اور انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے گھر میں پناہ کسی ذاتی منفعت یا روپیوں کی لالچ میں نہیں دی تھی بلکہ وہ ایک مذہبی عالم اور مقامی شخصیت کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

پیر محمد نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ جب مولوی صاحب ان کے گھر آئے تو ان کے پاس کچھ روپے اور کپڑے تھے، ہتھیاروں میں بندوق، پستول، خنجر اور ایک تھیلی میں بارود بھی تھی۔ مولوی صاحب روپوشی کے زمانے میں اپنے خورد و نوش کے اخراجات خود

برداشت کرتے تھے۔ جو نقد رقم وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ ختم ہونے کے بعد سید بھکو ولد سید علی، ان کے اخراجات کے لیے کچھ رقم دے جاتے تھے۔ سید بھکو کے علاوہ ان سے ملنے والوں میں سید لعل موضع بنگلور (جو معظم جنگ بہادر کی جاگیر کا ایک حصہ تھا) کے محصول دار اور اسی موضع کے حولدار محمد علی تھے۔

(۲) رفعت علی:- ان مجاہدین میں شامل تھے جنھوں نے برٹش رزیڈنسی پر حملے میں حصہ لیا تھا۔ وہ علاؤالدین کے قدیم رفیق کار تھے۔ وہ تمام رات لڑائی میں معروف رہے اور دوسرے روز صبح تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخرکار انھیں روپوش ہونا پڑا۔ وہ مغل پورہ کے رہنے والے تھے۔

(۳) عبدالوہاب:

(۴) جہانگیر خاں:- جس تاریخ یعنی ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو رزیڈنسی پر حملہ کیا گیا، اسی روز (جمعہ) صبح جہانگیر خاں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ مولوی علاؤالدین کے مکان پر پہنچا جو اس وقت فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ اس نے دو مرتبہ اپنی بندوق سر کی۔ جس کی وجہ لوگ بڑی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے۔ مجمع کے طور طریق دیکھ کر مولوی صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بغاوت برپا کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجمع کی قیادت سنبھال لی اور مکہ مسجد روانہ ہوئے اور وہاں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد وہ چارمینار کی طرف روانہ ہوئے جہاں جہانگیر خاں (پٹھان) اپنے ساتھیوں کے ساتھ مجاہدین کے اس جلوس میں شامل ہو گیا۔

یہ وہی جہانگیر خاں تھا جس نے نظام کی دیوڑھی میں مختار الملک اور رزیڈنٹ وقت پر گولی چلائی تھی اور جب گولی کا نشانہ خطا ہوا تو اس جیالے پٹھان نے تلوار سے حملہ کیا لیکن اس دوران دیوڑھی کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا اور فوراً انھیں ختم کر دیا گیا۔

(۵) عظمت جنگ:- عظمت جنگ، روشن الدولہ کے بھائی تھے اور بہت با اثر اعلا عہدہ پر فائز اور اہم شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے نظام کو یہ باور کرایا تھا کہ انگریز ان کے بھائی روشن الدولہ سے مل کر نظام کے خلاف ایک ناپاک سازش رچا رہے ہیں۔ اس لیے انگریزوں کے خلاف کارروائی کرنے کا یہی

موزوں وقت ہے۔ انھوں نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ اس مقصد کے پیش نظر وہ اپنے سپاہیوں میں ہتھیار بھی تقسیم کر رہے ہیں اور انھیں بغاوت کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔ مولوی علاؤ الدین کی رہنمائی میں رزیڈنسی پر حملہ سے قبل مجاہدین کا جلوس مکہ مسجد پہنچا تو وہاں ایک احتجاجی جلسہ کے انعقاد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور ان ہی مصروفیات کی بنا پر انھیں گرفتار کر کے شہر بدر کر دیا گیا۔

(۶) مردہا محمد چاند :- نظام کے محل کے چوکیداروں کی ایک ٹکڑی کے انچارج تھے۔ اس لیے وہ نظام کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے اور نظام کے منظور نظر سمجھے جاتے تھے، اسی قربت کے باعث وہ نظام کے خیالات کو متاثر کر سکتے تھے۔ برٹش رزیڈنسی پر حملہ (جولائی ۱۸۵۷ء) میں وہ شریک تھے۔ بلارم چھاؤنی کے جن باغیوں نے بریگیڈیر میکنزی پر حملہ کیا تھا اس میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ جہانگیر خاں (جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) کے گہرے دوست اور مربی تھے۔

(۷) بازخاں :- رزیڈنسی کی ایک دیوار کے سامنے والے مکان میں وہ رہتے تھے۔ اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہاں باغی آسانی سے پناہ لے سکتے تھے اور وہاں سے رزیڈنسی پر اچانک حملہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ ان کا نام ان مجاہدین میں شامل تھا جنھوں نے رزیڈنسی پر حملہ میں حصہ لیا تھا۔ اسی بنا پر انھیں کچھ دنوں تک نظر بند رکھا گیا اور پھر شہر بدر کر دیا گیا۔

(۸) مولوی ابراہیم :- وہ بہت ہی جوشیلے اور کٹر سنی مذہب کے پیرو تھے۔ وہ انگریزوں اور شیعوں سے یکساں طور پر نفرت کرتے تھے (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مختار الملک۔ جو انگریزوں کے ہم نوا تھے۔ اور ان کے خاندان کا تعلق شیعہ مذہب سے تھا۔) چنانچہ سراج الملک کے دور حکومت (۱۸۴۶-۱۸۴۸ء) میں ان کی سرکردگی میں تقریباً ایک درجن شیعوں کو مکہ مسجد میں قتل کر دیا گیا تھا لیکن وہ اتنی ہی شدت سے انگریزوں کے خلاف باغیانہ خیالات کا کھلے عام اظہار کیا کرتے تھے۔

برٹش سرکار یہ چاہتی تھی کہ عظمت جنگ، مردہا محمد چاند، بازخاں اور مولوی ابراہیم کو نظام کے دربار اور ریاست کے حدود سے باہر نکال دیا جائے۔ مولوی ابراہیم اور بازخاں کے بارے میں یہ طے پایا کہ وہ شہر چھوڑ کر اپنی جاگیر میں سکونت اختیار کریں

لیکن مولوی ابراہیم کو آئندہ جمعہ تک مکہ مسجد کے سوا کسی دوسری مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اسی دوران شہر میں بغاوت شروع ہو گئی۔ دوسرے دو مجاہدین کسی نہ کسی بہانہ شہر میں اپنے قیام کو ٹالتے رہے۔ لیکن آخر کار انھیں شہر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔

(۹) عبدالرزاق عرف حاجی صاحب نائب :- مولوی صاحب پائیگاہ کی جاگیرات کے تعلقدار تھے۔ پائیگاہ کے بعض امراء۔ خاص طور پر اقتدار الملک کے بارے میں یہ گمان تھا کہ ۱۸۵۷ کی بغاوت کے تعلق سے ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ اس بنا پر شائد تعلقدار صاحب نے بغاوت میں شریک ہونے کی جرأت کی لیکن انھیں ملازمت سے علاحدہ کر دیا گیا اور سزا بھی دی گئی۔

(۱۰) عبدالشکور جمعدار :- وہ پائیگاہ کے امیر شمس الامراء سے متوسل تھے۔ انھیں آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے الزام میں جمعداری کی خدمت سے علاحدہ کر دیا گیا۔ ان کے نام سے موسوم ایک مسجد اب بھی فتح دروازہ کے قریب موجود ہے۔

(۱۱) محمد قطب خاں :- ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ رزیڈنسی پر حملہ کے وقت شریک تھے اور اسی بنا پر انھیں (۵) سال کی سزا دی گئی۔

(۱۲) اقتدار الملک :- اقتدار الملک رشید الدین خاں، شمس الامراء امیر کبیر فخر الدین کے فرزند تھے اور ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے داماد۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ انھیں سیاسی مسائل سے بہت دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے شاید وہ وہابی تحریک کی طرف راغب ہوئے۔ کیوں کہ مولوی علاؤالدین ان کے یہاں ملازم اور مصاحب بھی تھے۔ رزیڈنسی پر حملہ سے پہلے مکہ مسجد میں جو احتجاجی جلسہ ہوا تھا اس میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ شریک ہوئے تھے اور انھوں نے پس پردہ علاؤالدین اور ان کے ساتھیوں کی ہمت افزائی کی تھی۔ ان کی انگریز دشمنی کی ایک اور واقعہ سے تصدیق ہوتی ہے۔ میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم (۱۸۶۹-۱۹۱۱ء)

کی تخت نشینی کے وقت وہ بہت کم سن تھے اس لیے سلطنت کے کاروبار چلانے کے لیے ایجنسی مقرر کی گئی تھی اس کے ایک رکن عمدۃ الملک رفیع الدین خاں کے انتقال کے بعد جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ ان کے بھائی اقتدار الملک کو رکن بنایا جائے تو ان کی اسی وجہ سے مخالفت کی گئی کہ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے۔

(۱۳) سید بھکو ولد سید لعل :- مولوی علاؤالدین رزیڈنسی پر حملہ کے بعد کافی عرصہ تک روپوش ہو گئے تھے۔ اس دوران ان کی ملاقات سید بھکو سے ہوئی جو موضع بنگلور کے محصول دار تھے۔ مولوی صاحب نے بھکو سے یہ خواہش کی کہ وہ ان کے لیے ایک موزوں مکان تلاش کریں۔ بھکو نے انھیں موضع بنگلور لانے اور اس کے مکان میں رہنے کی خواہش کی۔ چوں کہ یہ مکان گورنمنٹ کا تھا اس لیے مولوی صاحب نے اس مکان میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ بالآخر سید بھکو، محمد علی کے توسط سے پیر محمد کے مکان واقع منگل پلی (تعلقہ ابراہیم پٹن) میں رہنا طے پایا۔

(۱۴) محمد علی حوالدار :- یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مولوی علاؤالدین کے بھتیجے یا بھانجے تھے اور بنگلور کے حوالدار تھے۔ ان کے توسط سے مولوی صاحب کا منگل پلی میں پیر محمد کے مکان میں قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

(۱۵) حسن خاں روہیلا:- رزیڈنسی پر حملہ کے بعد غلام یٰسین خاں نے بارہ روہیلوں کو گرفتار کیا تھا۔ مقدمہ کے دوران طرہ باز خاں کے سامنے جب ان روہیلوں کو شناخت کے لیے پیش کیا گیا تو انھوں نے صرف ایک روہیلے حسن خاں کی شناخت کی اور کہا کہ وہ ان کے گھر میں رہتا تھا۔

(۱۶) نواب فیاض جنگ بہادر عرف ابن صاحب:- رزیڈنسی پر حملہ (۱۸۵۷ء) کے دوران جن تین اصحاب کا ذکر بار بار آتا ہے ان میں ابن صاحب، جسے گوپال داس اور اعظم علی خاں ہیں ان اصحاب کے مکانات رزیڈنسی کے قریب تھے۔ اس لیے رزیڈنسی پر حملے کے وقت مجاہدین نے ان مکانوں کا استعمال کیا تھا۔ جب مولوی علاؤالدین اور طرہ باز خان اپنے رفیقوں کے ساتھ حملے کے ارادہ سے رزیڈنسی پہنچے تو انھوں نے حملے کا پلان، کچھ اس طرح بنایا کہ ایک گروپ نے ابن صاحب کے مکان کو اپنا مرکز (مورچہ) بنایا اور دوسرا

گروہ جسے گوپال داس کے گھر پر مورچہ سنبھال لیا۔ اور پھر رزیڈنسی پر حملہ شروع کیا گیا۔ تمام رات لڑائی کے بعد ان مجاہدین نے حملہ روک دینے کا فیصلہ کیا اور واپسی سے پہلے ان دونوں رہنماؤں اور ان کے کچھ ساتھیوں نے ابن صاحب، جسے گوپال داس اور اعظم علی خاں کے گھروں میں پناہ لی اور پھر اپنے اپنے مقامات پر چلے گئے۔

یہاں ابن صاحب کے تعلق سے اجمالاً ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ان کا تعلق حیدرآباد کے ایک بڑے جاگیردار خاندان سے تھا ان کے جد اعلیٰ کی دیوڑھی پرانے شہر میں چوک مرغاں کے قریب تھی اور ابن صاحب کی دیوڑھی کے نام ہی سے مشہور تھی۔ لیکن جسے گوپال داس اور اعظم علی خاں کے بارے میں تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

(۱۷) **مولوی سید احمد:-** مولوی علاؤالدین نے کمیشن کے سامنے اپنے بیان میں کہا کہ انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ مولوی سید احمد لڑائی کے دوران مارے گئے۔

(۱۸) **قطب خاں ابن گھانسی خاں:-** مولوی علاؤالدین کے بیان کے مطابق قطب خاں کئی بار ان کے گھر آئے اور انھیں یہ ترغیب دیتے کہ وہ انگریز دشمن جدوجہد میں شریک ہو جائیں اور اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔ لیکن مولوی صاحب یہ کہہ کر بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے کہ یہ کام ان لوگوں کو سپرد کیا جانا چاہیے جن کے پاس روپیہ اور کافی وفادار ساتھی ہوں۔ بالآخر قطب خاں نے مولوی صاحب کو اس انقلابی کام کے لیے آمادہ کر لیا۔

ریاست میں زرعی اور نظم و نسق کے اصلاحات کی شروعات

پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سر سالار جنگ نے ۱۸۵۳ء میں دیوان بنائے جانے کے بعد ریاست کی ناگفتہ بہہ معاشی حالات کو سدھارنے اور لڑکھڑاتے ہوئے نظم و نسق کو بہتر بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اور اس تعلق سے ایک جامع اسکیم بھی مرتب کی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی وجہ سے انھیں اس اسکیم کو ملتوی رکھنا پڑا۔

سالار جنگ کے مجوزہ اصلاحات کا جائزہ لینے سے پہلے اس امر پر غور کرنا مناسب

ہو گا کہ کیا ان سے پہلے ریاست کے کسی رزیڈنٹ یا دیوان نے اسی نوعیت کے اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی تھی؟[1]

سب سے پہلے سر ہنری رسل (۱۸۱۱-۱۸۲۰ء) رزیڈنٹ نے یہ تجویز پیش کی تھی ریاست کے اضلاع میں یوروپین افسر مقرر کیے جائیں جو گاؤں کے محاصل کا تخمینہ لگائیں، استحصال بالجبر کو روکیں اور عدالتی دادرسی کے مواقع فراہم کریں۔ ان کے جانشین مٹ کاف (۱۸۲۰-۱۸۲۵ء) نے بھی ریاستی نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے ایک اسکیم بنائی، جس کے بموجب ریاست کے اخراجات کو اتنا کم کیا جائے کہ وہ آمدنی سے تجاوز نہ کریں، گاؤں کو بنیاد بنا کر (۵) سال کے لیے زمین کا محاصل کا تعین کیا جائے، گاؤں میں پولیس مقرر کی جائے اور حکومت میں انگریز افسروں کو مقرر کیا جائے تاکہ مال گزاری کی وصولی پر نگرانی رکھی جا سکے اور بالجبر وصول کا انسداد کیا جا سکے۔ اس اسکیم کو گورنر جنرل نے بادل نخواستہ منظوری بھی دے دی تھی اور ۱۸۲۱ء میں اس پر عمل آوری بھی شروع ہوئی لیکن جب مسٹر مارٹن رزیڈنٹ بنے (۱۸۲۵-۱۸۳۰ء) تو انھوں نے مذکورہ بالا اسکیموں کو راجہ چندو لعل کی ایماء پر یک لخت ختم کر دیا۔

جب سراج الملک دوسری بار دیوان بنے (۱۸۴۶-۱۸۴۸ء) تو انھوں نے عرب ملازمین کو سبکدوش کرنے کی کوشش کی، فوجی جمعداروں سے زمینات واگذاشت کرانے کی سعی کی۔ تعلقداروں کو کمیشن دینے کی بجائے انھیں ماہانہ تنخواہ پر مقرر کرنے اور انھیں شہر کی بجائے اپنے اضلاع میں رہنے پر زور دیا، تعلقوں اور تحزانوں پر قابل، تجربہ کار اور ایماندار عہدہ داروں کو مقرر کرنے کی تجویز پیش کی لیکن نظام حکومت اور برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کی بناء پر اس اسکیم کو مسترد کر دیا گیا۔

"۱۸۹۳ء میں سر وقار الامراء کے دور میں نظم و نسق کے اصلاحات کی ایک اور محدود کوشش کی گئی جس کو عام طور پر "قانونچہ مبارک" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں دستوری اصلاحات کے لیے ایک ایکٹ بھی پیش کیا گیا لیکن ان اقدامات سے عوام کی خواہشات کی تکمیل نہ ہو سکی۔"

---

1. Bawa, V. K. The Nizam Between Mughals & British 1980.

سالار جنگ کے اصلاحات :-

ان مجوزہ اصلاحات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس وقت کے معاشی اور نظم ونسق کے حالات کا جائزہ لیں۔

ریاست کا بہت بڑا حصہ عربوں اور روہیلوں کے پاس رہن تھا کیوں کہ حکومت نے اپنے اخراجات کی پابجائی کے لیے ان سے قرض لے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی ساہوکاروں اور تاجروں سے بھی بھاری سود پر قرض لیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ نظام کے جواہرات بھی مکفول ہو چکے تھے۔ اس طرح واجب الادا قرضوں کی جملہ رقم دو کروڑ (۲۰) لاکھ تھی (جو اس وقت کے لحاظ سے کافی بڑی رقم تھی)۔ اس کے برخلاف ان کی آمدنی کے ذرائع بالکل محدود تھے۔ ان کثیر قرضوں کی بڑی وجہ فوج کے ناقابل برداشت اخراجات تھے اس میں کمی اس لیے ممکن نہ تھی کہ ریاست میں کمپنی سرکار کے راج اور نظام کے اقتدار کو باقی رکھنے اور عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور بغاوتوں کو کچلنے یہ ضروری تھے۔

∴ ریاست میں نظم ونسق بالکل ٹھپ پڑ چکا تھا۔

∴ نظام کے رشتہ داروں اور منصب داروں کا گزارہ اور فوجیوں کی تنخواہیں بھی ادا نہیں کی جا سکتی تھیں۔

ان حالات میں ریاست کے نظم ونسق کے ہر شعبہ میں اصلاحات نافذ کرنا ضروری تھا۔ سالار جنگ کے سامنے فوری حل طلب مسائل یہ تھے کہ حکومت کے روزمرہ کے اخراجات کی پابجائی کی جائے، بجٹ میں توازن پیدا کیا جائے اور حکومت پر قرضوں کا جو بھاری بوجھ تھا اس سے نجات حاصل کی جائے۔

(۱) سب سے پہلے انھوں نے رفتہ رفتہ روہیلوں اور عربوں کے قرضوں کو ادا کرنے کا کسی طرح انتظام کیا تاکہ رہن شدہ اضلاع کو سرکاری نظم ونسق کے تحت لایا جائے اور مالیہ کو مستحکم بنایا جائے۔

(۲) اس وقت مال گزاری وصول کرنے کا یہ طریقہ کار تھا کہ ہر سال اس ٹھیکہ دار کو

∴ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، تاریخ دکن (عہد حالیہ) ۱۹۴۴ء ص ۱۱۷ - ۲۰۰

∴

تعلقے دے دیے جاتے جو سب سے اونچی بولی پر حاصل کرتا اور دیس مکھوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ٹھیکہ داروں سے پوری طرح تعاون کریں۔ ٹھیکیدار غریب کسانوں سے جبراً زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرتا اور صرف مقررہ رقم سرکاری خزانے میں داخل کرتا اور باقی رقم خود ہڑپ کر لیتا۔ ٹھیکے دار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ تھی اور نہ وہ حکومت یا عدالت کے سامنے کسی طرح جواب دہ تھے۔ اس طرح ان کو کسانوں کو ہر طرح سے لوٹنے کی چھوٹ حاصل تھی۔ سالار جنگ نے ٹھیکے داری کے اس شرم ناک طریقے کو ختم کیا۔

(۳) ریاست کے بعض حصوں میں امانی طریقہ سے بھی مال گزاری وصول کی جاتی تھی جہاں حکومت اپنے تعلقداروں کے توسط سے کسانوں سے مال گزاری وصول کرتی تھی۔ یہ تعلقدار حکومت کے مستقل ملازم نہ تھے بلکہ قلیل مدت کے لیے انھیں مقرر کیا جاتا تھا۔ انھیں مقررہ تنخواہوں کے بجائے مال گزاری کا ۱۲½ فی صد کمیشن دیا جاتا تھا۔ اُن کے تحت پولیس بھی دے دی گئی تھی۔ اس لیے وہ من مانی طریقوں سے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کرتے اور خوب کمیشن کھاتے۔ سالار جنگ نے ایک ایک کر کے پرانے تعلقداروں کو برطرف کر دیا اور اُن کی جگہ مقررہ تنخواہوں پر مستقل تعلقداروں کا تقرر کیا۔ اور انھیں پابند کیا کہ وہ اضلاع میں قیام کریں۔

(۴) ۱۸۶۷ء میں ضلع بندی کی اسکیم نافذ کی گئی جس کے بموجب ریاست کو (۵) صوبوں (Provinces) اور سترہ (۱۷) اضلاع اور (۷۳) تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور ان کے نظم و نسق کے لیے تنخواہ یاب عہدہ دار مقرر کیے گئے۔

(۵) اس وقت ہر کھیت اور ہر کاشت کار پر لگان نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ پورے گاؤں پر مجموعی طور پر اندازے سے لگان مقرر کیا جاتا اور پٹیل اور مقدم کو یہ اختیار تھا کہ وہ اس رقم کو گاؤں کے مختلف کاشت کاروں پر اُن کی زراعت کی نوعیت کے مطابق تقسیم کرے۔ اس طریقہ کار میں اقربا نوازی اور جانب داری کی کافی گنجائش تھی۔ اس مذموم طریقۂ کار کو ختم کر دیا گیا اور اس کی بجائے ہر کاشت کار اور ہر کھیت کی جمع بندی مقرر کر کے درج رجسٹر کی گئی۔ اور یہ گشتی جاری کی گئی کہ لگان میں سرکار کی منظوری کے بغیر اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) تلنگانہ کے اضلاع میں حکومت، کاشت کار سے جنس کی شکل میں لگان وصول

کرتی تھی جس کو بٹائی کا طریقہ کہا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں لگان کی شرح مقرر نہ تھی اس لیے ملازمین سرکار کو اس کے پورے مواقع تھے کہ وہ کسانوں کو بُری طرح پریشان کریں۔ اس لیے سالار جنگ نے مال گزاری صرف نقد کی شکل میں وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا۔

(۷) مذکورہ بالا ان زرعی اصلاحات میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ۱۸۷۵ء میں (Land Revenue and settlment Department) قایم کیا گیا اور مختصر مدت میں زراعت پر محاصل عائد کرنے کے طریقہ کار پر عمل شروع کیا گیا۔

(۸) عدلیہ کے نظم ونسق کو بہتر بنایا گیا۔ پورے محکمہ عدالت کی جدید تنظیم کی گئی اور ان کے انصرام کے لیے ایک معتمدی قایم کی گئی اور ۱۸۷۵ء میں ایک مجلس قانون (لاکمیشن) قائم ہوئی تاکہ ریاست کے لیے فوجداری اور دیوانی معاملات کے تعلق سے گشتیاں جاری کرے اور اپیل کے لیے ہائی کورٹ اور مقامی عدالتیں قائم کی گئیں۔

(۹) ذرائع آمدورفت کو بہتر بنانے کے لیے ۱۸۶۰ء میں حیدرآباد۔ شولاپور ریلوے لائن بنائی گئی اور ۱۸۷۸ء میں شہر حیدرآباد کو داڑی کے ذریعہ بمبئی اور پھر مدراس کو ریل سے ملایا گیا۔

(۱۰) تعلیمی میدان میں بھی کئی مفید اقدامات کیے گئے۔ ۱۸۵۵ء میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں انگریزی اور مشرقی زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں سٹی ہائی اسکول اور ۱۸۷۲ء میں چادرگھاٹ ہائی اسکول شروع کیے گئے۔ ایک انجنیرنگ اسکول ۱۸۷۰ء میں قائم کیا گیا اس کے علاوہ مدرسہ اعزہ (۱۸۷۸ء) اور مدرسہ عالیہ (۱۸۷۳ء) اور آخر میں (۱۸۸۷ء) میں نظام کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اسی زمانہ میں انگریزی اور اردو رسائل شائع ہونا شروع ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ریاست کے ناگفتہ بہہ حالات کے پیش نظر سالارِ جنگ نے جو اصلاحات نافذ کیے وہ ایک اہم کارنامہ تھا۔ لیکن سالار جنگ نے جو اصلاحات نافذ کیے ان کے تعلق سے ذیل کی باتوں کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

انھوں نے کوئی ایسے زرعی اصلاحات شروع نہیں کیں جن سے جاگیرداری ڈھانچہ پر کسی قسم کی آنچ آئے بلکہ انھوں نے ضلع: ندی اور زمین پر محاصل عائد کرنے کا طریقہ رائج

کرکے لڑکھڑاتے ہوئے جاگیرداری سماج کو سہارا دیا۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ریاست کے نظم ونسق کو جدید بنیادوں پر قائم کرنے کی ممکنہ کوشش کی۔

انھوں نے کئی اسکول اور کالج قائم کرکے جدید تعلیم کی بنیاد رکھی۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ یہ تمام اسکول اور کالج صرف شہر حیدرآباد تک محدود تھے۔

مذکورہ تعلیمی سہولتوں سے استفادہ صرف جاگیردار، متمول طبقات اور اعلیٰ عہدہ داروں کی اولاد نے اٹھایا۔ البتہ جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۹ء) کے بعد ہی تعلیم کی روشنی متوسط طبقہ تک پہنچنا شروع ہوئی۔

مذکورہ بالا ان اصلاحات کی عمل آوری کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ یوپی، بنگال اور مدراس کے صوبوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، تجربہ کار عہدہ داروں اور دانشوروں کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی جائے اور انھیں ریاست کے اعلا عہدوں پر فائز کیا جائے۔ اس طرح سر سالار جنگ کا تیس (۳۰) سالہ دور حکومت (۱۸۸۳ء) میں اختتام کو پہنچا[1]

سالار جنگ نے نظم ونسق کے اصلاحات کو روبہ عمل لانے ریاست کے اہم عہدوں پر غیر حیدرآبادی اصحاب کو مامور کیا تھا اس کے خلاف حیدرآباد کے چھوٹے جاگیرداروں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ناراضگی اور غصہ کے جذبات ابھرنے شروع ہوئے جس کی ابتدا (۱۸۸۴ء-۱۸۸۵ء) سے ہوئی اور جس نے آگے چل کر ملکی تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔

چنانچہ نواب میر محبوب علی خاں، آصف جاہ ششم کی تخت نشینی (۱۸۶۹ء) کے بعد یہ فرمان جاری ہوا کہ سرکاری ملازمت میں حیدرآبادیوں کو ہندوستانیوں (غیر حیدرآبادی) کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے اور سالار جنگ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایک ایسا گوشوارہ تیار کریں جس سے یہ واضح ہو کہ سرکاری ملازمتوں میں حیدرآبادیوں اور غیر حیدرآبادیوں کی تعداد کتنی ہے۔ چنانچہ نومبر ۱۸۸۵ء میں انہی خطوط پر گوشوارہ تیار کیا گیا۔

اس دور کے اردو اخباروں میں بھی اس مسئلہ پر گرما گرم مباحث شروع ہوئے۔

---

[1] یوسف خان، ڈاکٹر، تاریخ دکن (عہد حالیہ)

یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ یہ تحریک وقفہ وقفہ سے اپنا سر اٹھاتی رہی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں "انجمن رعائے نظام" اور "ملکی لیگ" وجود میں آئی جو دراصل ملکی تحریک کے تنظیمی روپ تھے۔ اس تحریک کی صدائے بازگشت، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۶۹ء میں بھی سنائی دی۔

لیکن ان تحریکوں کے اغراض و مقاصد اور سیاسی مطمح نظر اور مطالبات ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد تھے۔

مقامی بغاوتیں۔ ۱۸۵۸ــــ ۱۸۸۰

شوراپور کی بغاوتیں ۱۸۴۱ تا ۱۸۸۰ :۔ حیدرآباد میں رزیڈنسی پر حملہ کے چند ہی مہینوں بعد شوراپور کے راجہ وینکٹ اپا نائک نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس وقت شوراپور کو ضلع گلبرگہ میں ایک جاگیر کی حیثیت حاصل تھی جس کی سالانہ آمدنی مشکل سے (۵۲) لاکھ تھی۔ اس اہم بغاوت نے کرناٹک کے دوسرے علاقوں کی بغاوتوں کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اس کا قدیم نام سورپور (یعنی دیوتاؤں کا شہر) تھا جو بے ڈر (Peerless) قبیلے کی پرانی ریاست تھی۔ اس قبیلے کے باشندے بہت قوی الجثہ اور بہادر تھے۔ میسور اور مہاراشٹرا کے علاقوں میں آباد تھے۔ اس خاندان کا اصل وطن میسور کا علاقہ رتناگیری (Ruthnaghurry) تھا اور یہاں کے راجاؤں کو نائک کہا جاتا تھا۔ قدیم زمانہ میں یہ ریاست سنسکرت، علم فلکیات، علم نجوم آرٹ اور ہندوستانی موسیقی کا اہم مرکز تھی [۲]

شوراپور کا ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے قیام (۱۵۱۵ء) میں ہوا۔ جس کے پہلے راجہ کلپا نائک (Kallapa Naik) تھے۔ اس قبیلہ کے لوگ کچھ عرصہ کے لیے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں میں ملازمت بھی رہے جب اورنگ زیب نے دکن کو فتح

۲۔ The Hyderabad State Committee, The freedom Struggle in Hyderabad Vol-II (1857-1885)

کرنے کی مہم شروع کی تو اس قبیلے کے لوگوں نے مرہٹوں سے مل کر اورنگ زیب کو کافی پریشان کیا اور آخر کار واکن گڑھ قلعہ میں (Wokimgarh Fort) بے ڈر کے نائک پام (Pam) اور اورنگ زیب کے درمیان مشہور لڑائی ہوئی (۱۶۹۲-۱۷۰۶) جس میں اورنگ زیب کی فتح ہوئی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس لڑائی کے بعد یہ ریاست کئی دور سے گزری اور مختلف حکمرانوں کے دست نگر رہی۔ اس کی حیثیت مرہٹوں کی ایک جاگیر کے مماثل تھی اور انیسویں صدی کے ابتدا میں کمپنی سرکار کے زیر اثر آگئی۔ کمپنی سرکار اور نظام کے درمیان معاہدۂ معاونت (۱۸۰۰ء) کے بعد شوراپور نظام پر کے اقتدار اعلیٰ کو مسلط کرنے کی انگریزوں نے ہر ممکن کوشش کی اور اس کے ساتھ شوراپور اسٹیٹ نذرانہ کی جو رقم نظام سرکار کو ادا کیا کرتا تھا اس میں بہت زیادہ اضافہ کر کے (۱۵) لاکھ کر دی گئی جس کی وجہ سے ریاست پر قرضوں کا بار بڑھتا گیا اور قبائل کے آپسی جھگڑوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر برٹش رزیڈنٹ نے مداخلت شروع کر دی اور نظام کی فوج کے ایک کیپٹن میڈوز ٹیلر کو ریاست کے حالات بہتر بنانے پر مقرر کیا گیا کیوں کہ راجہ وینکٹ اپا نائک اس وقت کم سن تھے۔ میڈوز ٹیلر (ایک مشہور انگریز مصنف تھے) کئی برسوں تک حیدرآباد کے رزیڈنٹ کی جانب سے اس ریاست کے ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے رہے اور ان ہی کی مشفق نگرانی میں کم سن راجہ وینکٹ اپا نائک پرورش پائی۔ اسی بنا پر شوراپور کے راجہ میڈوز ٹیلر کو "اپا" (یعنی والد) کہا کرتے تھے۔ میڈوز ٹیلر کو شوراپور کا ایجنٹ بنانے کے خلاف رانی ایشوراما نے آواز اٹھائی اور مطالبہ کیا کہ انھیں اپنی خدمت سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن فوج کے ذریعہ ۱۸۱۸ء میں رانی اور ان کے (۲۵) ساتھیوں کو شہر بدر کر کے معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔

شوراپور کی پہلی بغاوت۔ ۱۸۴۱ء:- یہ بغاوت راجہ صاحب کے عرب ملازمین نے (۱۸۴۱ء) میں شروع کی اس وقت تک راجہ صاحب کم سن تھے کہ انھوں نے ریاست کے کاروبار ابھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس بغاوت کی رہنمائی ہنپا نائک (Hannappa Naik) نے کی۔ باغیوں کے خلاف ۲۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو کنٹجنٹ فوج بھیجی گئی تھی جس نے اس علاقے کا ایسا گھیراڈالا کہ باغی بھیما ندی پار کر کے بچ نکلنے میں ناکام رہے اور اس طرح شوراپور کی پہلی بغاوت کو

کچل دیا گیا۔ جب راجہ سن بلوغ کو پہنچے تو ۱۸۵۳ء میں انھیں ریاست کے کاروبار سونپ دیے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۵ء سے اپنی فوج کو طاقتور بنانے کے ارادے سے عربوں، روہیلوں اور دوسرے لڑاکو قبائل کی بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی یہ صورت حال کمپنی سرکار کے لیے باعث تشویش تھی اور اس طرح راجہ صاحب کے باغیانہ ارادوں کا بھی انھیں اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی دوران نانا صاحب پیشوا اور رائچور کے زمیندار کے نمائندوں نے راجہ صاحب کے باغیانہ عزائم کی اور ہمت افزائی کی۔

اس دوران مائی پال سنگھ نامی ایک شخص بلگام میں پکڑا گیا اور اس نے جو بیان دیا اس سے ظاہر ہوا کہ وہ کمپنی سرکار کے خلاف جاسوسی کے لیے بلگام بھیجا گیا تھا اور اس واقعہ میں شوراپور کے راجہ کا ہاتھ ہونے کا شبہ ظاہر کیا گیا۔ اس الزام میں مائی پال کو قتل کر دیا گیا۔ جام کھنڈ کے راجہ کو جو ونکٹ اپا کے قریبی دوست تھے بلگام میں گرفتار کر لیا گیا اور ان کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ راجہ صاحب نے کمپنی سرکار کے خلاف بغاوت کے پلان کو کامیاب بنانے کے لیے نانا صاحب، شمالی ہند کے باغیوں اور اپنے پڑوسی طاقتور راجوں سے ربط پیدا کیا اور ان سے خفیہ طور پر خط و کتابت جاری رکھی۔ اتفاق سے شوراپور کے کلکٹر کو ان کی خفیہ مراسلت اور مصروفیات کا علم ہو گیا۔ اسی بنا پر ان کے ایک اور ساتھی دلیسمکھ بسوالنگپا اور ان کے لڑکے کو گرفتار کیا گیا۔ ضلع رائچور کے ڈپٹی کمشنر نے ۲۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو راجہ صاحب کو خط لکھا کہ حیدرآباد کے رزیڈنٹ اور بمبئی کے گورنر کی رائے میں ان کے رویہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے اور انھیں آگاہ کیا گیا کہ ان کی طرف سے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد اور صوبہ بمبئی کے امن اور امان کو خطرہ لاحق ہو

راجہ صاحب نے مائی پال کے واقعہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا اور مصلحتاً کمپنی سرکار سے اپنی وفاداری کا بھی اعادہ کیا۔ لیکن شوراپور سے برابر یہ خفیہ رپورٹیں مل رہی تھیں کہ اس پاس کے اضلاع میں بے چینی پھیل رہی ہے اور بے ڈر قبیلے کے لوگ بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر حیدرآباد رزیڈنسی کی جانب سے کیپٹن کیمپبل (Campbell)

کو حکم دیا گیا کہ وہ شوراپور جائیں اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیں، مکمل تحقیقات کریں اور راجہ صاحب سے حسب ذیل امور کے بارے میں استفسار کریں اور ان شرائط پر عمل آوری کی طمانیت حاصل کریں۔

۱۔ راجہ صاحب یہ ثابت کریں کہ مائی پال کے واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

۲۔ راجہ صاحب اس بات کا وعدہ کریں کہ وہ اپنی فوج میں مسلسل اضافہ نہیں کریں گے اور گولہ بارود جمع نہیں کریں گے۔

۳۔ راجہ صاحب ناسم کیشور نامی ایک برہمن کے توسط سے نانا صاحب سے جو ربط قائم کیے ہوئے ہیں وہ ختم کردیں گے۔

انگریز یہ چاہتے تھے کہ مذکورہ بالا شرائط پر راجہ صاحب ان سے معاہدہ کرلیں لیکن راجہ صاحب نے ایسا معاہدہ کرنے سے صاف انکار کردیا اور فروری ۱۸۵۸ء کو انگریز فوج پر حملہ کردیا۔ پہلے دن گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کئی انگریز سپاہی مارے گئے لیکن دوسرے دن انگریز فوج کے ایک طاقتور اور بڑے دستے نے چاروں طرف سے شوراپور پر ہلہ بول دیا۔ لیکن شوراپور کے قلعہ میں داخل نہ ہوسکے۔ کیوں کہ بقول میڈوز ٹیلر[1] "شوراپور کا شہر بہت مضبوط تھا۔ اس کے دیواروں اور فصیل و برجوں کو توڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔"

راجہ صاحب کی شکست کے بعد جب انگریز فوج قلعہ میں داخل ہوئی تو وہ وہاں موجود نہ تھے بلکہ قلعہ کے خفیہ راستے سے نکل کر حیدرآباد پہنچ گئے تاکہ سرسالار جنگ کی مدد حاصل کریں۔ لیکن سالار جنگ نے ان کی مدد کرنے کی بجائے انھیں گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا۔

راجہ صاحب کا اقبالی بیان لینے اور معلومات حاصل کرنے میڈروز ٹیلر کو جیل بھیجا گیا۔ جیسے ہی راجہ صاحب نے ٹیلر کو دیکھا وہ جذباتی ہوگئے اور اپا، اپا، کہہ کر ٹیلر سے لپٹ گئے اور گلوگیر ہوکر کہا کہ وہ واپس چلے جائیں۔ دوسرے دن ٹیلر نے راجہ صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ رزیڈنٹ سے ملنا چاہتے ہیں تو انھوں نے برافروختہ ہوکر کہا کہ نہیں! پھر ٹیلر سے مخاطب ہوکر کہا کہ "وہ رزیڈنٹ سے کہہ دیں کہ ان سے وہ رحم کی بھیک

---

[1] میڈوز ٹیلر" دی اسٹوری آف مائی لائف"

ہرگز نہیں مانگیں گے۔ وہ اپنے عوام کے سامنے ریاکار اور مکار بننا نہیں چاہتے۔"

جب انھیں اپنی پچھلی مصروفیات کے بارے میں بیان دینے پر بہت مجبور کیا گیا تو انھوں نے کہا:۔

"اگر مجھے ان لوگوں کے نام بتانے کو کہا جائے جنھوں نے مجھے بغاوت پر آمادہ کیا تو میں خاموشی اختیار کر لوں گا۔ کیا میں، جسے موت کا سامنا کرنا یقینی ہے، ان لوگوں سے غداری کروں جنھوں نے مجھ پر اعتماد کیا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اپا! کالا پانی جانے اور جیل میں برسوں رہنے کے بجائے میں موت کو ترجیح دوں گا۔" یہ سن کر ٹیلر نے کہا۔ "اگر تمھیں مرنا ہے تو ایک بہادر کی موت مرو۔" راجہ صاحب نے جواب دیا کہ "اگر وہ مجھے توپ سے باندھ دیں گے تو میں خوف زدہ نہیں ہوں گا۔ میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے پھانسی پر نہ لٹکائیں، کیونکہ میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا کہ مجھے ڈاکوؤں کی طرح پھانسی پر لٹکایا جائے۔ رزیڈنٹ سے میری بس یہی ایک خواہش ہے کہ عوام کو اس سے واقف کرایا جائے کہ آپ میرے ساتھ تھے اور میں نے کبھی بزدلی کا اظہار نہیں کیا۔"

راجہ وینکٹ اپا نائک پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں موت کی سزا سنائی گئی۔ رزیڈنٹ نے اس سزا کو حبس دوام میں بدل دیا اور گورنر نے سزا میں زبردست کمی کر کے جنوبی ہند کے کسی قلعہ میں چار سال قید رکھنے کا حکم صادر کیا۔ جب انھیں جنوبی ہند کے کسی علاقہ میں لے جایا جا رہا تھا تو انھوں نے اپنے پستول سے خودکشی کر لی۔ اس طرح یہ جانباز مجاہد آزادی اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا۔

شوراپور کے راجہ کی موت کے بعد کئی لوگوں کو جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا گرفتار کیا گیا۔ جن میں قابل ذکر تصدق حسین تھے جنھیں ۳ر جولائی ۱۸۵۸ء کو شوراپور کی مارکیٹ کے قریب پھانسی دی گئی۔ شوراپور کے راجہ پر جب مقدمہ چلایا گیا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ ان کا پلان یہ تھا کہ سارے جنوبی مہاراشٹرا اور شمالی کرناٹک کے علاقوں میں بغاوت کرائی جائے جس کے اہم مراکز میرج، کولہاپور، نارگنڈ، کپل اور رائچور ہوں گے۔ مقدمے اور سزاؤں کے بعد بھی شوراپور میں امن وامان، پوری طرح بحال نہیں ہوا۔ چنانچہ جولائی ۱۸۶۴ء میں ایک بار پھر نظام کی فوج دو انگریز افسروں کی نگرانی میں شوراپور بھیجی گئی تاکہ راجہ رام نائک کی سرکشی کو ختم کیا جائے

کیوں کہ انھوں نے سرکاری خزانے اور جیل پر حملہ کیا تھا۔ حالات کو قابو میں رکھنے فوج کو ۱۸۹۸ء تک شوراپور میں رکھا گیا۔

راجہ صاحب شوراپور کی بغاوت ۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء میں حصہ لینے والے یا مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست۔

(ان کے مختصر حالات زندگی دستیاب نہ ہو سکے البتہ انھیں جو سزائیں دی گئیں اس کا ذکر کیا گیا ہے:)

(۱) انجیاپتی	مار ڈالا گیا
(۲) نورمل	۱۴ سال قید
(۳) بسونی سنگھ	۱۴ سال قید
(۴) رامپا	۱۴ سال قید
(۵) غانم پاؤش	موت کی سزا
(۶) عنایت اللہ خاں	" " "
(۷) سدی نصیب	پھانسی دی گئی
(۸) عزت خاں	" " "
(۹) لچھمن سنگھ	" " "
(۱۰) نائک کمتھل	ملازمت سے علاحدہ کیا گیا
(۱۱) بسنت سنگھ	" " " "
(۱۲) سدی سلیمان	" " " "
(۱۳) میر سعادت علی	" " " "
(۱۴) دیوی سنگھ (۱۵) گلاب گیر (۱۶) ہنس گیر	ان تینوں کی سزاؤں کا علم نہ ہو سکا۔
(۱۷) ننگا گیر	پھانسی دی گئی
(۱۸) ہناپا نائک	۱۸۴۱ء کی بغاوت کے لیڈر رہے تھے۔ سزا کا علم نہ ہو سکا۔

ملکھیڑ کی بغاوت ۱۸۵۸ء:-

ملکھیڑ ضلع گلبرگہ میں ایک جاگیر تھی جو شورا پور سے صرف چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

جب شورا پور میں انگریزوں کے خلاف بے چینی کی شدت اختیار کر رہی تھی تو اس زمانہ میں مل کھیڑ کے زمینداروں نے پرچم بغاوت بلند کر دیا۔ ان دنوں رائچور، کپل اور کرناٹک کے دوسرے علاقوں میں بغاوتوں کا جو سلسلہ شروع ہو چکا تھا مل کھیڑ کی بغاوت اس کی ایک کڑی تھی۔

جب اورنگ زیب اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے مقصد سے دکن آیا تو کہا جاتا ہے کہ مل کھیڑ کے جاگیردار، حیدر علی، جاں نثار خاں بھی اس کے ساتھ دکن آئے۔ ان کی بہادری نمایاں فتوحات اور شہنشاہ سے وفاداری کے صلہ میں انھیں اعلا عہدوں پر فائز کیا گیا، افواج دکن کی سپہ سالاری سے نوازا گیا اور دکن کے قلعوں، جن کی تعداد (۵۲۱) بتائی جاتی ہے کا قلعہ دار بنایا گیا اور ان کی کچھ جنگی خدمات کے پیش نظر انھیں قلعہ مل کھیڑ۔ جسے مظفر نگر بھی کہا جاتا تھا۔ کا جاگیردار بنایا گیا۔ نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں (۱۷۶۲ - ۱۸۰۳) میں قلعہ مل کھیڑ (مظفر نگر) کو ریاست حیدرآباد میں شامل کیا گیا۔ اور مرزا برہان الدین قلندر خاں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ آخری آصف جاہ (میر عثمان علی خان) کے دور میں نواب سردار علی خاں یہاں کے جاگیردار تھے۔

نظام سرکار اور مقامی جاگیرداروں کی لوٹ اور ظلم و زیادتیوں کے خلاف وہاں کے زمین داروں نے بغاوت کر دی، جس کو فرو کرنے نظام کی فوج بھیجی گئی لیکن مل کھیڑ کے مضبوط قلعہ کو یہ فوج تسخیر نہ کر سکی اور ایک انگریز کمانڈر مارا گیا۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے زیادہ طاقت ور فوج بھیجی گئی اور اس بار نظام کی فوج فتح یاب ہوئی۔ مل کھیڑ کے زمین دار اور ان کے رشتہ داروں کو قید کر کے ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر مارچ ۱۸۵۸ء میں حیدرآباد لایا گیا۔ اس مرحلہ میں ایک چاؤش جو عرب دستہ کی قیادت کر رہا تھا مارا گیا۔

The Hyderabad State Committee. The freedom Struggle in Hyderabad Vol-II (1857-1885)

نظام آباد میں بغاوت ۱۸۵۹ء

آصف جاہی حکمرانوں نے برار کو ۱۸۵۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اس معاہدے نے ساری ریاست کی طرح نظام آباد کے عوام میں بھی بے چینی کی لہر پیدا کر دی اور پھر دو سال کے اندر ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے تو انگریز دشمن جذبات کو اور بھی بھڑکا دیا جو رفتہ رفتہ بغاوت کا روپ اختیار کر گئی۔ اس بغاوت کے اسباب سے بخوبی واقف ہونے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظام آباد کی پچھلی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

نظام آباد کا قدیم نام اندور (Indur) تھا جس کی بنیاد ۱۸۷۶ء میں رکھی گئی تھی جس کے تحت دس تعلقے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں اس ضلع کا نام بدل کر میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کے زمانہ میں نظام آباد رکھا گیا۔ اگر ہم اور پیچھے جائیں تو اس کا علم ہوتا ہے کہ دور قدیم میں اس ضلع کے مختلف حصے موریا خاندان کے دور (اے ڈی ۔۔۳ - ۲۱۰) سے بادامی راجوں کے دور تک مختلف خاندانوں کے زیر نگیں رہے۔ دور وسطی میں ویملا واڑی چالوکیہ (Chalukyas of Vemul woda) مسونوری (Musu nuri) حکمرانوں کے علاوہ مغل اور قطب شاہی بادشاہوں اور دور جدید میں آصف جاہی خاندان کی حکمرانی میں بھی رہا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے کچھ پہلے ضلع نظام آباد کے اکثر مقامات پر انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑک چکے تھے اور ہل چل شروع ہو چکی تھی چنانچہ فروری ۱۸۵۷ء میں یہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ راجہ رائے رایاں (حیدر آباد کے ایک بڑے جاگیردار) کی جاگیر کے دفتر دار سوناجی پنڈت نے موضع نارائن کھیڑ کے پٹواری رنگ راؤ کو طلب کیا اور انھیں نانا صاحب پیشوا کے نام خطوط پہنچانے کو کہا۔ رنگ راؤ نے لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں میں یہ خطوط نانا صاحب کو پہنچا دیے۔ نانا صاحب نے ان کے ذریعہ دکن کے سربرآوردہ شخصیتوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دیں جس طرح شمالی ہند کے اکثر علاقوں میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ جب وہ اس پیغام کے ساتھ واپس ہو رہے تھے تو راستہ میں انھیں سوناجی پنڈت کے انتقال کی خبر ملی۔ اس لیے انھوں نے حیدر آباد کا رخ کیا اور کولاس نامی ایک مقام

پرو ید (حکیم) کا بھیس اختیار کرکے ایک مہینہ تک مقیم رہے۔ کولاس میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے مقامی لوگوں سے تعلقات بڑھائے اور ایک فوج تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس فوج میں روہیلوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کی۔ رنگ راؤ کا منصوبہ یہ تھا کہ فوج تیار ہو جانے کے بعد دگ لور (ضلع ناندیڑ) اور مدنور (ضلع نظام آباد) پر قبضہ کیا جائے لیکن مالیہ کی کمی کی وجہ سے ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ حالانکہ کولاس کے راجہ دیپ سنگھ ولد نیل سنگھ نے رنگ راؤ کے منصوبے کی بالواسطہ طور پر مدد کی یا پھر ان کی مصروفیات سے چشم پوشی کی۔ خود کولاس کے راجہ صاحب نے اپنی فوج کو طاقتور بنایا تاکہ نظام حکومت کے خلاف اپنے علاقہ کو مضبوط اور مستحکم کریں۔

بدقسمتی سے بغاوت کے ان منصوبوں کا انکشاف ۱۸۵۹ء کے اوائل میں اس وقت ہوا جب کنٹنجنٹ فوج روہیلوں کی سرکشی کو کچلنے میں مصروف تھی۔ اس بغاوت میں مذکورہ بالا افراد کے علاوہ راجہ راؤ رمبا نمبال کر کے فرزند صفدر الدولہ، شیخ مدار، جو صفدر الدولہ کے ملازم تھے اور ایک ضلع دار یہ سب اس بغاوت میں شامل تھے۔ نظام کی حکومت نے ان تمام مجاہدین کو فوراً گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں تین، تین سال قید کی سزا دی گئی، ان کی جاگیرات ضبط کر لی گئیں۔ دوسرے مجاہدین پر بھی مقدمے چلائے گئے اور انھیں مختلف مدت کی سزائیں سنائی گئیں۔ اس طرح نانا صاحب پیشوا کی ہدایات کے مطابق رنگ راؤ اور ان کے ساتھیوں نے جو بغاوت کی تھی اس کو نظام کی حکومت نے بے دردی سے کچل دیا۔ رنگ راؤ پر مقدمہ خود رزیڈنٹ کی شخصی نگرانی میں چلایا گیا۔ ان پر ملک سے غداری کرنے اور نانا صاحب کی ہدایات کی بموجب فوجیں بھرتی کرنے اور انھیں بغاوت کے لیے آمادہ کرنے کے سنگین الزامات لگائے گئے اور اپریل ۱۸۵۹ء میں موت کی سزا سنائی گئی۔ لیکن ان کی اس سزا کو گورنر جنرل نے انڈمان میں عمر قید کی سزا میں بدل دیا۔ جہاں ان کا (۱۸۶۰) میں انتقال ہوا۔ اس بغاوت سے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ انگریز سامراجیوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات عوام میں کتنے گہرے اور پھیلے ہوئے تھے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے پٹواری نے ایک اہم بغاوت کی رہنمائی کی۔ لیکن انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء کے آخری

مہینوں میں راؤ صاحب پیشوا، جو نانا صاحب کے رشتہ کے بھائی (Cousin) اور تانیتا ٹوپے کے قریبی رفیق کار تھے دکن کے مختلف مقامات کا دورہ کیا تاکہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کے علم کو بلند رکھا جائے۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں وہ حیدرآباد آئے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں آنے سے پہلے وہ نرمل (عادل آباد)، کشٹاپور (تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد) اور دوسرے مقامات پر قیام کیا۔ حیدرآباد میں انھوں نے ہندو اور مسلم عوام کا تعاون حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش کی۔

گوسائین (Gosain) طبقہ کے لوگوں نے جو لین دین کا کاروبار کرتے تھے اور جن کا تعلق نظام آباد اور عادل آباد سے تھا راؤ صاحب کی ہر طرح مدد کی۔ ان کے علاوہ آرمور تعلقہ کے ایک مقام مرتاد (Murtad) کے زمین دار، رکما ریڈی اور کشٹاپور کے ایک برہمن جاگیردار (جن کے نام کا علم نہ ہو سکا) اس بغاوت میں شریک تھے۔ جب حیدرآباد کی پولیس کو راؤ صاحب کی آمد کی اطلاع ملی تو بڑے پیمانے پر ان کی تلاش شروع ہوئی اور اس سلسلہ میں کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ لیکن راؤ صاحب چھپ کر حیدرآباد کے باہر نکل گئے۔ بعد میں انھیں کانپور میں گرفتار کیا گیا اور ۲۰ اگست ۱۸۶۲ء کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

راجہ صاحب کولاس کی بغاوت ۱۸۵۹ء :-

نظام آباد سے کوئی ۳۰، ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک پُرشکوہ پہاڑ ہے، جس کا نام کولاس ہے جو سلسلہ بالا گھاٹ سے جا ملتا ہے۔ یہ مقام اتنا پر فضا ہے کہ اس کو کیلاش (یعنی جنت) بھی کہا جاتا تھا۔ اور شاید کثرت استعمال سے یہی کیلاش، کچھ عرصہ بعد کولاس بن گیا ہو۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ کولاس نامی ایک یوگی ان پہاڑوں میں رہا کرتا تھا اور غالباً یہ مقام اس نام سے موسوم ہو گیا ہو[1]۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی ہے، جس کے قریب مہادیو کا ایک قدیم مندر ہے۔

دور وسطیٰ میں علاؤ الدین خلجی کے دور (۱۲۹۶—۱۳۱۶) میں دیوگڑھ (دولت آباد) اور ورنگل پر حملے کیے گئے اور چودھویں صدی عیسوی کے پہلے دہے میں ورنگل کے راجہ

---

[1] محمد امیر حمزہ، منشی، تاریخ کولاس

رام دیو کو شکست ہوئی اور انھیں صلح کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس شکست کا انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ ورنگل چھوڑ کر کولاس میں سکونت پذیر ہوئے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق کولاس میں ورنگل کے راجہ کے قیام کے بعد ہی وہاں آبادی بسنا شروع ہوئی اور کولاس کا نام منظر عام پر آیا۔ علی بریدشاہ کے عہد ۹۴۹ھ میں کولاس پر تیماجی کے عمل داری تھی۔ پھر وہ قطب شاہیوں کے زیر نگیں رہا۔ جمشید قطب شاہ (۱۵۴۳-۱۵۵۰ء) نے کولاس پر قبضہ کرنے کے بعد جگ دیو راؤ نائک کے مشورے سے قلعہ تعمیر کروایا۔

نظام الملک (۱۷۶۲-۱۸۰۳ء) نے راجہ گوپال سنگھ کو کولاس کا قلعہ دار بنایا۔ کیوں کہ راجہ صاحب نے نظام الملک کو ان کے بھائی صلابت جنگ کے خلاف لڑائی میں اعانت کی تھی۔ راجہ گوپال سنگھ کے جانشینوں نے ۱۸۱۵ء تک اس قلعہ کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ چونکہ اس خاندان کے آخری راجہ درجن سنگھ لاولد ہوئے اس لیے ان کے علاقہ کو خالصہ میں ضم کر دیا گیا۔

راجہ صاحب کولاس راجہ دیپ سنگھ (Raja Deep Singh) کی بغاوت اور نظام آباد میں سوناجی پنڈت اور پٹواری رنگ راؤ کی بغاوتیں لگ بھگ ایک ہی زمانہ میں ہوئیں۔ ان بغاوتوں میں ایک طرح کا تال میل اور ربط تھا اور ان تمام کے روح رواں اصل میں نانا صاحب پیشوا تھے۔ رنگ راؤ کی بغاوت میں جن چار لوگوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور ان پر مقدمے چلائے گئے ان میں سے ایک راجہ صاحب کولاس بھی تھے۔ ان کے تعلق سے نظام سرکار کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ وہ اپنی فوجوں میں اضافہ کر رہے ہیں تاکہ کولاس کو بغاوت کا ایک مضبوط گڑھ بنایا جائے۔ وہ رنگ راؤ کی بغاوت کے منصوبوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انھوں نے ان کی ہمت افزائی بھی کی۔ رنگ راؤ اور ان کے دوسرے باغی ساتھی راجہ صاحب کولاس سے میل جول رکھے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب اور نانا صاحب پیشوا کے درمیان ربط تھا اور باغیوں کے لیے ان کے جو ہدایات یا احکامات جاری ہوتے تھے ان سے وہ بخوبی واقف تھے۔

The Hyderabad State Committee, The freedom struggle in Hyderabad Vol-II (1857-1885)

راجہ صاحب نے خفیہ طور پر کاسی رام اور لعل محمد کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ وہ عوام کو فوج میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھرتی ہونے کی ترغیب دیں جب ان پر حیدرآباد کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تو انھوں نے اپنے بیان میں اس بات سے اپنی لاعلمی ظاہر کی کہ وہ نانا صاحب یا ان کے ایجنٹ کو جانتے تھے۔ البتہ انھوں نے یہ اعتراف کیا کہ کاسی رام، شیخ مدار اور لعل محمد ان کے مکان میں رہا کرتے تھے اور ان لوگوں کے ذریعہ اپنی فوج میں بھرتی کرائی تھی۔ نظام حکومت کو اس کا بھی شبہ تھا کہ گلاب خاں جمعدار نے جو ڈاکہ ڈالا تھا اور نلنگاہ میں جو لوٹ مار مچائی تھی اس کے پیچھے بھی راجہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ راجہ صاحب پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ انھوں نے باغی رنگ راؤ کو گرفتار نہیں کیا۔ حالانکہ انھیں یہ اختیارات حاصل تھے۔ وہ باغیوں کی مصروفیات اور ان کے منصوبوں سے واقف ہونے کے باوجود حکومت کو اس کی اطلاع نہ دی بلکہ انھوں نے باغیوں کی مجرمانہ سرگرمیوں کو چھپانے کی کوشش کی اور آخر کار وہ خود بھی ان بغاوتوں میں شریک ہو گئے۔ چنانچہ ان "سنگین" الزامات کی بنا پر انھیں تین سال کی سزا دی گئی اور ان کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔

نظام آباد اور راجہ صاحب کو اس کی بغاوتوں (۱۸۵۷-۱۸۵۹ء) میں حصہ لینے والے یا مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست (جن کے حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ انھیں جو سزا دی گئی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔)

۱۔ صفدر الدولہ:۔	نانا صاحب سے ان کا قریبی ربط اور مراسلت تھی۔ انھیں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں عربوں کو فوج میں بھرتی کرائیں، غرض یہ کہ وہ اس بغاوت کے اہم لیڈر تھے۔	حبس دوام کی سزا دی گئی۔
۲۔ شیخ مدار:۔	ان کے ذمہ باغیوں کے خطوط رسانی کا کام تھا اس کام کے سلسلہ میں وہ نانا صاحب کے ایجنٹ سے ملتے اور	ایک سال کی سزا دی گئی۔

	ان کے پیام متعلقہ لوگوں کو پہنچاتے ۔ وہ صفدرالدولہ کے یہاں ملازم تھے ۔	
۳۔ کاسی رام ولد بہادر سنگھ:۔	وہ اس مقدمہ کے ایک گواہ تھے۔ ان کا رنگ راؤ، راجہ صاحب اور نانا صاحب کے ایجنٹوں سے ربط تھا کہ وہ فوجوں کی بھرتی کے لیے کئی ہزار کی ہنڈی لائے تھے ۔	پانچ سال کی سزا دی گئی ۔
۴۔ سنتاجی راؤ ولد رام راؤ :۔	ان کا باغی لیڈروں سے مسلسل ربط رہا اور ان کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اس سے وہ واقف تھے ۔	ان کے بارے میں بغاوت میں سرگرمی سے شریک ہونے کا ثبوت نہیں ملا ۔
۵۔ لعل محمد ولد شیخ نادید :۔	انھیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ نصیب خاں جمعدار سے ربط پیدا کریں اور روہیلوں کو فوج میں شامل کریں ۔ وہ دوسرے باغی لیڈروں کے ساتھ بغاوت کا منصوبہ بنانے میں اہم رول ادا کرتے تھے ۔	
۶۔ رگھوناتھ واجی ولد واجی گوپال :۔	انھوں نے بغاوت میں سرگرم حصہ لیا ۔ انھیں تمام باغی لیڈروں سے قریبی ربط تھا۔ فوجوں کی بھرتی کے کام میں بھی وہ شریک تھے۔ وہ نیلے کر کے پٹواری تھے ۔	تین سال کی سزا اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی ۔
۷۔ جیئے رام پاٹیل ولد لنگوجی پاٹیل :۔	انھوں نے اپنے عدالتی بیان میں کہا کہ صفدرالدولہ کے ایک خط کے مطابق (۲۵) ہزار عربوں اور روہیلوں پر مشتمل فوج تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔	ملازمت سے علاحدگی کے بعد (۳) سال کی قید اور

جائداد بھی ضبط کر لی گئی۔

انھیں نانا صاحب کے ایجنٹ (جو ایک برہمن تھا) سے یہ معلوم ہوا کہ نانا صاحب اور باجا بائی شمالی ہند سے آئے اور راجہ صاحب کی مدد سے (۷۰۰) سپاہیوں کی فوج تیار کر لی تھی۔ روہیوں کی فراہمی کے لیے پرگی کے سینا نائک سے ربط پیدا کیا گیا تھا۔ وہ بھی گاؤں کے باشندے تھے۔

۸۔ بابو پاٹیل ولد:۔ جیے رام پاٹیل۔

بابو پاٹیل کا نانا صاحب کے ایجنٹ، راجہ صاحب کو لاس اور صفدر الدولہ سے قریبی ربط تھا اور وہ ان لوگوں کے خطوط رسانی کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق راجہ صاحب کاسی رام کی مدد سے عوام کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

روہیلوں کی بغاوتیں ۱۸۵۸-۱۸۶۰ء:- آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مختلف مقامات کی بغاوتوں (خاص طور پر مرہٹواڑہ اور کچھ حد تک کرناٹک کے علاقوں میں) کا جب بھی ذکر آتا ہے تو ان میں لڑاکو کردار ادا کرنے والوں کی اکثریت روہیلوں کی ہوتی ہے، اس کے بعد عربوں کا نمبر آتا ہے۔ لہٰذا ہمارے ذہن میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ روہیلے کون تھے۔ کس علاقہ کے رہنے والے تھے اور انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں اتنا نمایاں اور اہم رول ادا کرنے کے اسباب و وجوہات کیا تھے۔ یہاں ہمارا مقصد روہیلوں کی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ اوپر اٹھائے ہوئے سوالوں کا مختصر جائزہ لینا ہے تاکہ اس پس منظر میں روہیلوں کی بغاوتیں جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کے صحیح قد و قال ہمارے سامنے آئیں۔

لے غوری اور غزنوی خاندان کے پٹھانوں کے چند قبیلوں نے جب کوہستان روہ ( ) میں سکونت اختیار کی تو انھیں "روہلہ" یا روہیلہ کہا جانے لگا۔ اس کوہستان کا سلسلہ مشرق میں کشمیر کی پہاڑیوں، مغرب میں دریائے ایلیس (جو ہرات سے متصل ہے) شمال میں کوہ کاشغر اور جنوب میں بلوچستان کے حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کوہستانی سلسلہ میں ایک پہاڑ ہے جس کو روہو (Rohu) کہتے ہیں اور یہاں کے رہنے والے روہیلے کہلائے جاتے ہیں۔ پشتو زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بھی پہاڑ کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ ایک انگریز مورخ برک (Burk) نے روہیلوں کے تعلق سے یہ کہا تھا کہ وہ "دنیا کی بہت ہی بہادر انتہائی ذی عزت اور کشادہ دل قوم ہے"۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک پوتے کا نام افغان تھا وہ فوج کا سپہ سالار تھا اور بیت المقدس کی تعمیر اس کے اہتمام سے ہوئی تھی۔ افغان کی اولاد کے قبیلے اکثر کوہ غور، کوہ فیروزہ، جنال اور خراسان میں آکر آباد ہوئے اور بعض عربستان میں جا بسے، جن میں خالد بن ولید بہت مشہور تھے۔

ہندوستان میں عام طور پر افغان، روہیلہ اور پٹھان کو ہم معنی استعمال کرتے ہیں۔ جو درست نہیں۔ روہیلہ اصل میں افغانوں کے اس قبیلے کو کہتے ہیں جو ہجرت کرکے ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ تاریخ فرشتہ کے بموجب مسلم سلاطین کے عہد میں یہ لوگ (افغان) پہلی دفعہ ہندوستان کے شہر ٹینہ میں آباد ہوئے۔ اس لیے اہل ہندان کو پٹھان کہتے ہیں۔

شمالی ہند میں روہیلے کی اصطلاح بہت کم سنائی دیتی ہے۔ البتہ دکن اور خاص طور پر حیدرآباد میں اس نام کا عام چلن رہا۔

افغانوں کی زبان پشتو ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پشت نامی ایک موضع ملک غور میں ہے۔ اس مقام کے لوگ جو زبان بولتے تھے وہ پشتو کہلائی۔ افغانستان قدیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب اور آتش پرست مذہب

لے محمد نجم الدین خان، اخبار الصنادید (جلد اول) نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۶ء۔

۲ے Strachy, Sir J. Hastings and the Rohillas 1892.

کی نشانیاں کابل اور بلخ میں موجود ہیں۔ لیکن یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُن حضرت صلعم کے زمانے ہی میں افغانوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ان کی بعض رسومات پر یہودیوں کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔

روہیل کھنڈ :۔ سیر متاخرین (فارسی میں ایک اہم تاریخ) کے مطابق ہندوستان پر نادر شاہ کا جب حملہ ہوا (۱۷۳۸ء) تو وہ افغان اور روہیلے جو قندھار میں رہتے تھے خوف زدہ ہو کر ہندوستان آ گئے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ قندھار کے اطراف واکناف کے رہنے والے افغانوں نے ایرانی فوج کے حملوں سے تنگ آ کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ ان ہجرت کرنے والے روہیلوں کے سربراہ سید علی محمد خان (عرف روہیلہ) تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد نواب صاحب نے راجہ ہر نند کو شکست دی اور ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور یہی علاقہ روہیل کھنڈ کہلایا۔ بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ سید علی محمد خاں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے بھی یہاں روہیلوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ ہمایوں (۱۵۳۰-۱۵۵۶) اور اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵) کے خلاف شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵) اور ان کے جانشینوں کے جو معرکے ہوئے ان میں روہیلوں نے نمایاں حصّہ لیا تھا اور اس کے بعد ہندوستان میں ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ پہاڑی علاقوں کے زمین داروں کے پاس اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز تھے۔

روہیل کھنڈ کا علاقہ (۱۲) ہزار مربع میل پر مشتمل تھا جو ہری دوار جہاں گنگا ندی ہمالیہ کی پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقہ میں داخل ہوتی ہے۔ سے شروع ہو کر گڑھوال (Garhwal) اور کماؤں (Kumaon) کے نشیبی علاقوں سے ہوتے ہوئے اودھ کی سرحد تک پہنچتا ہے۔ روہیل کھنڈ میں جنوب مغربی صوبہ کا وہ حصّہ بھی شامل تھا جس میں چھ برطانوی اضلاع کئی اور بڑے شہر تھے۔ ریاست رام پور اس صوبے کے عین بیچ میں تھی۔ روہیل کھنڈ اور اودھ میں بھی طبعی حیثیت سے کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اس کا بھی ذکر کرتے چلوں کہ روہیل کھنڈ کا قدیم نام کٹھیر (Katehr) بھی تھا۔

ہندوستان پر نادر شاہ کے حملہ (۱۷۳۹ء) کے بعد روہیلہ سردار علی محمد کی

فوجی طاقت میں اضافہ ہوا اور علاقہ بھی وسیع ہوا۔ اس اہم کام میں روہیلوں کے ایک اور سردار رحمت علی ولد شاہ علی (جو افغانستان میں ۱۷۰۱ء میں پیدا ہوئے) نے اہم رول ادا کیا۔ ان دونوں نے مل کر روہیل کھنڈ کو مستحکم اور طاقتور بنایا۔ چنانچہ ۱۷۴۷ء میں روہیل کھنڈ کا بہت بڑا علاقہ علی محمد خاں کے زیر نگین تھا اور مغل بادشاہوں نے انھیں اپنا گورنر بنایا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں ہندوستان پر احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد یہاں جو افراتفری پھیلی تو اس سے فائدہ اٹھا کر علی محمد خاں نے ایک خود مختار سردار کی حیثیت اختیار کر لی اور ضلع بریلی کے ایک مقام اونلہ (Aonla) کو اپنا پائے تخت بنایا۔ لیکن اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ روہیلوں کے دوسرے اہم سرداروں کے نام تھے ڈنڈی خاں (Dundi Khan) ذابیتا خاں (Zabita Khan) وغیرہ۔ روہیلوں اور مرہٹہ فوجوں کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اودھ کے نواب سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر نواب انھیں مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ رکھیں تو اس کے معاوضہ میں وہ نواب صاحب کو (۴۰) لاکھ روپے دیں گے چنانچہ (۱۷۷۳ء) میں مرہٹوں کی فوجیں روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کی نیت سے آئیں۔ جب انھیں نواب صاحب اور روہیلوں کے درمیان خفیہ معاہدہ کا علم ہوا تو وہ حملہ کیے بغیر واپس چلی گئیں۔ جب یہ خطرہ ٹل گیا تو نواب صاحب نے روہیلوں سے حسب معاہدہ رقم کا مطالبہ کیا، لیکن روہیلوں نے یہ رقم دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مرہٹوں کی فوج نے کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ وہ واپس چلی گئیں۔ روہیلوں کا یہ جواب نواب صاحب کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے انھوں نے روہیلوں کی اس وعدہ خلافی کا بدلہ لینے کے لیے وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings) سے فوجی مدد طلب کی اور یہ وعدہ کیا کہ (۴۰) لاکھ روپیوں کی رقم کمپنی سرکار کو بطور عطیہ دے دی جائے گی۔ چنانچہ اس شرمناک معاہدہ کی بنا پر نواب صاحب اور کمپنی سرکار کی فوجیں مل کر روہیلوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ہزاروں روہیلے مارے گئے اور سیکڑوں کو اپنا علاقہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ غالباً اسی واقعہ کے بعد روہیلوں میں انگریز دشمنی کے شعلے بھڑک اٹھے اور بدلہ کی اسی آگ نے انھیں اپنے پرانے دشمنوں (یعنی مرہٹوں) سے ہاتھ ملانے اور ان کی سرپرستی میں آزادی کی لڑائی میں شریک ہو کر انگریزوں سے بدلہ لینے

کا انھیں ایک اچھا موقع فراہم کیا۔

روہیلوں کی بغاوتیں :-

اب تک ہم روہیلوں کے حسب نسب، ان کی زبان، ان کے آبائی وطن اور ان کے کردار کی خصوصیات سے تو واقف ہو چکے۔ آیئے اب اس کا سرسری جائزہ لیں کہ دکن کی تحریک آزادی میں انھوں نے کتنا اہم رول ادا کیا اور ان کی بغاوتیں ریاست کی دوسری بغاوتوں سے کس طرح مختلف تھیں اور ان کی خصوصیات کیا تھیں۔

(۱) انیسویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کی تحریک آزادی سے ان کا گہرا ربط تھا۔ اور ان تحریکوں سے وہ زیادہ متاثر تھے۔

(۲) انھیں مرہٹہ پیشواؤں، نانا صاحب، راؤ صاحب، بالا صاحب اور تانتیا ٹوپے سے گہری عقیدت تھی بلکہ وہ اپنے کو ان کے تابعدار سمجھتے تھے۔

(۳) ان کی بغاوتیں کسی ایک مقام یا علاقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ ریاست کے مختلف حصّوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

(۴) وہ نظام یا انگریز فوجوں کا عام طور پر بالمقابل سامنا نہیں کرتے تھے بلکہ چھاپہ مار لڑائی کو ترجیح دیتے تھے۔

دیسی ریاستوں کے تعلق سے کمپنی سرکار کے منظور کردہ قانون (جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) پر عمل آوری کی وجہ سے شمالی ہند کی جن ریاستوں کو برطانوی صوبوں میں ضم کر دیا گیا تھا وہاں کے سپاہی جو اکثر روہیلے تھے بڑی تعداد میں دکن کی طرف آنا شروع ہوئے اور یہاں انھوں نے ان لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جو پہلے ہی سے انگریز دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ مرہٹہ پیشوا رہنما جو شمالی وسطی ہند میں کمپنی سرکار کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف دکن میں دوسرا محاذ کھولا جائے تاکہ ہر طرف سے انگریزوں پر دباؤ ڈالا جائے۔ اس کے علاوہ دیسی ریاستوں کے حکمران جو کمپنی سرکار کے قانون سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے خفیہ طور پر روہیلوں، گونڈوں اور بھیلوں کی بغاوتوں کی ہمت افزائی بھی کی۔ چنانچہ روہیلوں کی ایک بڑی تعداد اجنٹہ، تلنگ، بسمت، لاتور، بکھتل اور نرمل میں جمع ہونے لگی تاکہ ان مقامات پر کمپنی سرکار کے خلاف بغاوتوں

کو آگے بڑھایا جائے اور اس مقصد کے تحت تانتیا ٹوپے اور راؤ صاحب کے نمائندے بھی دکن کے ان علاقوں میں سرگرم عمل ہو گئے۔

جیسے ہی شہر حیدر آباد میں یہ خبر پہنچی کہ تانتیا ٹوپے نربدا پار کر چکے ہیں تو فوراً مجاہدین آزادی نے شہر کی مسجدوں میں یہ پوسٹر لگا دیے کہ عوام بڑی تعداد میں ان کی تحریک میں شریک ہو جائیں۔

ایک اور باغی مسلم رہنما عادل محمود خاں نے جب اپنے پانچ سو (۵۰۰) سپاہیوں کے ساتھ نربدا ندی پار کیا تو اس کی اطلاع عوام کو ایک اور پوسٹر مسجدوں میں لگا دی گئی اور ان سے جدوجہد آزادی میں شریک ہونے کی اپیل کی گئی۔

نرمل (ضلع عادل آباد) میں بغاوت ۱۸۵۸ء۔

کمپنی سرکار کو یہ خبریں مل رہی تھیں کہ نرمل کے علاقے میں روہیلوں کے فوجی دستے چھاپے مار رہے ہیں اور نظام کی فوجوں کی اچھی خاصی پٹائی بھی کر رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ روہیلوں کے دستوں کی رہنمائی دو برہمن کر رہے ہیں جو تانتیا ٹوپے کے ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔ نرمل کے تعلقدار نے بھی ریاست کے دیوان کو یہ اطلاع دی کہ ہزاروں روہیلے اور گونڈ جنھیں ناگپور سے ہر طرح کی مدد مل رہی ہے۔ حملہ آور ہو گئے ہیں۔ ان طاقت ور حملوں کا انھیں اس لیے اچھا موقع مل گیا کہ اس علاقہ میں انگریز گھوڑ سوار فوج نہیں تھی۔

حملے سے پہلے روہیلوں نے ایک اپیل جاری کی جس میں لکھا تھا کہ "تمام روہیلے جو نانا صاحب (پونا) کے تابعدار ہیں کی جانب سے یہ اپیل۔ نظام (مغلائی) انگریزوں کا ہم نوا بن گیا ہے اور نانا صاحب کی مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے ہم نظام کے ملک پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ صوبہ دار (یعنی نظام) نے ہمارے تین ساتھیوں کو پکڑ لیا ہے جس کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ اس خط کو متعلقہ عہدہ داروں کو پہنچا دیا جائے تاکہ اس کو اورنگ آباد روانہ کیا جائے۔ اس خط کے متن سے نظام کو بھی واقف کرا دیا جائے تاکہ انھیں اس کا علم ہو کہ ہم ان کے ملک کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

حملے کے فوراً بعد حیدر آباد کنٹنجنٹ فوج اور بلاری کی ایک رجمنٹ ان کے خلاف بھیجی گئی چوں کہ یہ پہاڑی علاقہ تھا اس لیے کمپنی سرکار کی فوجوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا

پڑا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی اپریل ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔ مجاہدین نے انگریز فوجوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن انگریز فوجوں کی عددی برتری اور فوجی مہارت کی وجہ سے انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ کئی مجاہدین گرفتار کر لیے گئے لیکن اس وقت گونڈوں کا سردار رام جی بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد رام جی گونڈ گرفتار کر لیا گیا، ان پر مقدمہ چلایا گیا اور نرمل میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح نرمل کی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔

اجنٹہ کے بھیلوں کی بغاوت ۔ ۱۸۵۷ء :۔ اجنٹہ جو زمانہ قدیم میں پہاڑیوں کی چٹانوں سے تراشی ہوئی دیواروں اور چھتوں پر بنائی ہوئی عدیم المثال تصاویر و نقش و نگار کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر کو تاریخ کی ستم ظریفی نے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انسانی خون خرابے اور بغاوتوں کا مرکز بنا دیا۔

اجنٹہ کے پچھڑے ہوئے نادار اور مفلس بھیل (Bhil) اپنے لیڈر بھاگوجی نائک (Bhagi Naik) کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف (۱۸۵۷ء) میں بغاوت کر دی۔ ان کی بجا طور پر یہ شکایت تھی کہ ان کا نہ کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ مقام، وہ انتہائی مفلس و نادار تھے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر گاؤں گاؤں پھرتے اور جس طرح بھی ہو جبر و زیادتی سے یا بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے اور تن ڈھانپ لیتے اور انھیں سماج حقارت کی نظروں سے دیکھتی۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں انگریز لیڈروں کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔

ویزاپور (Vaizapur) کے اہم زمیندار گوئند کاسی راج دیش پانڈے نے ان بغاوتوں کا ساتھ دیا۔ ویزاپور کی اس بغاوت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خاندیس کے باغیوں کی بھی ممکنہ مدد کی جائے۔ چنانچہ اورنگ آباد سے خاندیس اور ویزاپور کی بھیل بغاوتوں کو کچلنے کے لیے کیپٹن پاڈلر (Capt; Pedler) کی فوج بھیجی گئی۔ خاندیس کے بھیلوں اور انگریز فوجوں کا مقابلہ مہادیو پہاڑیوں (Mahadeva Hills) میں ہوا اور یہ بغاوت کچل دی گئی۔ اس طرح ویزاپور کی بغاوت کو ختم کرنے اورنگ آباد سے گھوڑ سوار فوج بھیجی گئی۔ ان پر ۲۰ نومبر ۱۸۵۷ء کو حملہ کیا گیا، کافی تعداد میں بھیل مارے گئے۔ بہت سارے زخمی ہوئے اور کچھ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر جنگلوں میں

چھپ گئے۔

حیدرآباد کے رزیڈنٹ کی ایما پر دسمبر ۱۸۵۹ء دپش پانڈے گوبند کاسی رام کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر الزامات یہ تھے کہ اس نے ساباجی نائک (Shayaji Naik) سے مل کر دو ہزار جیلوں کو جمع کیا اور ضلع اورنگ آباد اور احمد نگر میں بغاوت کرادی۔ ان پر مقدمہ چلا کے قید کرلیا گیا اور جیل میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

چولہ میں بغاوت - ۱۸۵۸ء

بعض انگریز مورخین اور وقایع نویسوں کا یہ خیال ہے کہ چولہ کے واقعات کو بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ لوٹ اور غارت گری کا ایک افسوس ناک حادثہ تھا جس میں روہیلوں نے ان کے الفاظ میں " رابن ہڈ " کا رول ادا کیا تھا۔ کیوں کہ روہیلوں نے گنگا کھیڑ میں خوب لوٹ مار مچائی۔ ان کے بیان کے مطابق ۔ وہاں کا لوٹا ہوا مال کھلے بازاروں میں فروخت کیا گیا۔ روہیلوں کے اس نام نہاد " لوٹ مار " کے واقعہ کو بہانہ بنا کر مرہٹواڑہ کے مختلف علاقوں مثلاً نلنگہ، ہنگولی، پربھنی، عمرگہ، کھرڈلہ اور چولہ وغیرہ کے مقامات پر روہیلوں اور دوسرے قبائل کے لوگوں نے انگریزوں اور نظام سرکار کے مقامی حکام کی ظلم و زیادتیوں کے خلاف جو جدوجہد کی انھیں بدنام کرنے اور غلط پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور چولہ کے جاگیردار پیرزادہ غلام حسین اور سید حسین جو پیرزادہ کے فرزند تھے اور پرجل (Perjal) کے سید غلام جیلانی اور ان کے ساتھیوں کو موردالزام بنایا گیا اور انھیں مختلف نوعیت کی سزائیں دی گئیں۔

نلنگہ میں بغاوت :-

روہیلوں نے مرہٹواڑہ کے علاقہ میں اپنے حملوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کا ایک نشانہ نلنگہ تھا جو اس وقت برطانوی ہند کا علاقہ تھا اور بعد میں ضلع بیدر میں شامل کیا گیا۔ پھر تعلقہ پربھنی کے ایک گاؤں کسورے ([illegible]) کی باری آئی۔ ۱۸۵۹ء جہاں بریگیڈیرہل (Hill) کی فوجوں کا روہیلوں اور عربوں سے سترہ، اٹھارہ گھنٹوں تک مقابلہ جاری رہا۔ ایک انگریز فوجی افسر بری طرح زخمی ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک اور واقعہ اورنگ آباد جیل میں بغاوت کا پھوٹ پڑنا تھا۔ جس کے نتیجے کے طور پر کئی لوگ جیل سے فرار ہوگئے، لیکن کئی قیدیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ اور (۵۰)، (۶۰) کو مار ڈالا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا

ایک اہم واقعہ تھا۔

برگیڈیر ہل، میجر براک (Brack) اور کئی دوسرے انگریز فوجی افسروں نے روہیلے، عرب اور بھیل جن جن مقامات پر بغاوت کے مقصد سے اکٹھا ہوئے یا پھر انھوں نے بغاوت شروع کی تھی تو ان کی سرکوبی اور انھیں ختم کرنے کے لیے ایک منظم اور باقاعدہ فوجی مہم شروع کی گئی۔ چنانچہ بسونت (Buswant) اور اطراف واکناف کے مقامات کو اڑا دیا گیا، بسمت (Busmath) جن تھر (Janther) نرسی، جالنہ، داسی، واجار (Wajar) اور دوسرے مقامات پر حملے کیے گئے، بعض مقامی قلعوں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان علاقوں کے دیس مکھوں، اور دیش پانڈوں کو حکم دیا گیا کہ وہ روہیلوں اور عربوں کی آمد و رفت اور ان کے کاروائیوں پر سخت نگرانی رکھیں اور حکومت کو اس کی فوری اطلاع دیں ورنہ ان کے خلاف بھی سخت کاروائی کی جائے گی۔

مرہٹواڑہ کے علاقوں کی ان بے شمار بغاوتوں کا اہم مرکز چولہ سمجھا جاتا تھا اور یہاں کے جاگیردار پیرزادہ شاہ غلام حسین عرف مستان ایک اہم لیڈر مانے جاتے تھے۔ روہیلوں کی بغاوتیں، جن میں بھیلوں، گونڈوں اور عربوں نے بھی نمایاں طور پر حصہ لیا وہ دو سال تک ریاست کے شمالی حصوں، خاص طور پر مرہٹواڑہ کے اکثر علاقوں میں زور و شور سے جاری رہنے کے بعد (۱۸۶۰ء) کو اختتام کو پہنچیں۔

مذکورہ بالا بغاوتوں میں حصہ لینے والے درجنوں باغیوں اور اہم لیڈروں (جن کا ہم تفصیل سے آگے ذکر کریں گے) کے خلاف شہر کی فوجداری عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ مارچ ۱۸۵۹ء کو شروع ہوا اور اسی سال نومبر میں اس کا فیصلہ سنایا گیا۔ اس مقدمہ کے اہم "مجرم" تھے چولہ کے پیرزادے شاہ غلام حسین اور سید حسین (ولد پیر بادشاہ) اور پرجل (Perjal) کے جاگیردار سید غلام جیلانی۔ کمپنی سرکار اور نظام حکومت کے ان نام نہاد "مجرمین" پر کئی نوعیت کے الزامات لگائے گئے۔ اور انھیں کتنی سخت سزائیں سنائی گئیں ان کا ہم اجمالاً ذکر ذیل میں کر رہے ہیں۔

(۱) شاہ غلام حسین ولد پیر بادشاہ جاگیردار موضع چولہ :۔ پیرزادے نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ان کے موضع میں مختلف اوقات روہیلے بڑی تعداد میں آ یا

کرتے تھے۔ ان کا یہ عام طریقہ کار تھا کہ وہ گاؤں کے باہر اپنا پڑاؤ ڈالتے یا پھر مقامی درگاہ کے قرب وجوار میں رہتے۔ انھوں نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ وہ روہیلوں کو کبھی بھی اپنے گھر میں نہ پناہ دی اور نہ ان کے رہن سہن اور خورد و نوش کا انتظام کیا۔ لیکن حکومت کی جانب سے ان پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ انھوں نے روہیلوں اور عربوں کو پناہ دی اور روہیلوں نے گنگا کھیڑ سے لوٹ کا مال (بقول کمپنی سرکار) لاکر چول کے بازار میں فروخت کیا اس سے پیرزادے واقف تھے اور اس کی اطلاع حکومت کو نہ دی۔ ان الزامات کی بنا پر انگریز فوجی افسر نے پیرزادے، ان کے چار لڑکوں، (۲۴) عربوں اور ۲۰ دوسرے اشخاص کو گرفتار کیا جن میں مقامی دیش پانڈے بھی شامل تھے۔ عدالت نے انھیں دو سال قید کی سزا سنائی اور موضع چول کو حکومت کے علاقے میں ضم کر دیا گیا۔

(۲) سید محسین ولد پیر بادشاہ جاگیردار موضع چول:۔ محسن صاحب نے عدالت میں وہی بیان دیا جو اُن کے بڑے بھائی پیرزادے نے دیا تھا۔ ان پر وہی الزامات لگائے گئے، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس بنا پر انھیں بھی دو سال کی سزا اور ان کے موضع کو نظام سرکار کے علاقے میں شامل کر لیا گیا۔

(۳) سید غلام جیلانی، جاگیردار پرجال:۔ جیلانی صاحب چول کے جاگیردار کے چچا تھے۔ عدالت میں انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ مختلف اوقات میں عرب ان کے موضع کو آیا کرتے تھے۔ لیکن ان عربوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ انھوں نے یہ بات تسلیم کرلی کہ ان کے بھائی کے لڑکے نے موضع کے کچھ لوگوں کے ورغلانے پر روہیلوں سے ربط پیدا کیا اور ان سے دوستانہ مراسم بھی باقی رکھے۔ عدالت کے خیال میں ان کی باغیانہ سرگرمیوں کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور ان کے اقبالی بیان کے پیش نظر انھیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔

مذکورہ بالا تین اہم "ملزمین" پر عدالتی کارروائی اور انھیں دی گئی سزاؤں کے بعد ہم اب ان اصحاب کا ذکر کریں گے جنھوں نے چول کی بغاوت میں حصہ لیا یا باغیوں کی مدد کی:۔

(۱) غلام نبی پٹیل:۔ موضع چول کے رہنے والے تھے لیکن ان پر مقدمہ ناندیڑ میں ۱۲۷۵ھ

میں چلایا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے روہیلوں کا ساتھ دیا تھا۔ — ۱۱ سال قید کی سزا۔

(۲)۔ ناگپا:۔ ان پر بھی وہی الزام لگایا گیا — ۵ سال قید کی سزا۔

(۳)۔ اکشمیا:۔ موضع چولہ کا باشندہ وہی الزام لگایا گیا۔ — 〃 〃 〃

(۴)۔ نارائن بنجارہ:۔ موضع چولکا باشندہ وہی الزام لگایا گیا۔ — 〃 〃 〃

(۵)۔ رنگابی:۔ موضع عمری کی رہنے والی تھیں 〃 〃 — 〃 〃 〃

(۶)۔ اسلم یا فقیرا چاؤشلا: موضع چولہ کے باشندے تھے، پربھل کے جاگیردار جیلانی صاحب کے مطابق انھوں نے فقیرا کو اپنے مکان کی حفاظت کے لیے دو سال تک ملازم رکھا تھا۔ ان پر مقدمہ فوجی عدالت میں چلایا گیا، جہاں انھوں نے یہ بتلایا کہ وہ اپنے موضع سے کئی ہفتوں کے سفر کے بعد شہر حیدرآباد پہنچے۔ وہاں عبدالرحمٰن روہیلے سے ملے۔ انھیں اپنے ساتھ موضع چلنے اور وہاں نائب کے ذریعہ ملازمت دلانے کا وعدہ کیا۔ خاں صاحب کو تلوار بطور تحفہ دیا اور انھیں بھوسی (   ) گاؤں میں ساتھ لائے اسی گاؤں کے قریب جنگل میں وہ ان سب کے ساتھ بارہ دن تک روپوش رہے۔ اسی دوران انگریز فوجوں نے اس گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت جنگل میں فقیرا کے ساتھ شریف خاں اور ان کے ۴۰ روہیلوں کو پانڈ والیگا کے (۱۲) بارہ ہوچن اور اڈونی گاؤں (   ) کے ہرسا نام نائک موجود تھے۔ فقیرا کو گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن نظام کی فوج کے ایک مسلم سپاہی نے روہیلوں کو انگریز فوج — فقیرا کو موت کی سزا دی گئی

	کے آنے کی خبر دی اور وہ مختلف سمتوں میں فرار ہو گئے۔	
(۷) - ہری دھیڑ (ہریجن):-	ہری دھیڑ پر روہیلوں کے ساتھ مل کر گاؤں پر حملہ کرنے، لوٹنے اور کمپنی سرکار کے ایجنٹوں کے مارنے کا الزام لگایا گیا۔	۷ سال کی سزائے قید۔
(۸) - شیخ علی عرب:-	جدہ کے شہری تھے لیکن حیدر آباد میں مقیم تھے، ہنگولی کی فوجی عدالت میں نومبر ۱۸۵۹ء کو اپنا بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ حیدر آباد سے روانہ ہوئے اور ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک سفر کرنے کے بعد اپنے گاؤں جتور (Jitoor) پہنچے ان کے ساتھ ہتھیار بھی تھے۔ جیات نگر میں ان کی ملاقات عبدالرحیم خاں سے ہوئی۔ خاں صاحب نے اپنے ساتھی کو تلوار دی اور اپنے ساتھ جتور کے قریب ایک گاؤں بھوسی (Bhoosi) لے گئے اور یہ بھی وعدہ کیا کہ انھیں نوکری بھی دلا دی جائے گی۔ یہ دونوں بارہ روز تک بھوسی کے جنگلوں میں رہے۔ پھر ایک انگریز فوجی رجمنٹ نے اس گاؤں کا گھیراؤ ڈالا اور قبضہ کر لیا اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔	جتور گاؤں میں پھانسی کی سزا دے دی گئی۔
(۹) - شاہ عبدالحق قادری:-	حالات کا علم نہ ہو سکا۔	دو سال قید
(۱۰) - شیخ محمود اللہ علی:-	مذکورہ ذیل تمام افراد کو ریزیڈنسی کے حوالے کر دیا گیا۔	سزا کا علم نہ ہو سکا لیکن عام طور پر ایسے اشخاص کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

(۱۱) - شیخ احمد ولد عبود:-	مذکورہ ذیل تمام افراد کو رزیڈنسی کے حوالے کر دیا گیا۔				سزا کا علم نہ ہو سکا لیکن عام طور پر ایسے اشخاص کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔
(۱۲) - محسن ولد محمد:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۳) - عمر ولد عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۴) - محمد بن عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۵) - حبیب احمد:	〃	〃	〃	〃	〃
ولد عبد اللہ:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۶) - مبارک ولد احمد:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۷) - سعید ولد عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۸) - محمد ثانی ولد عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۱۹) - مبارک ثانی ولد عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۰) - اسلم ولد سعید:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۱) - ناصر ولد عبود:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۲) - سفینہ دار صاحب:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۳) - ہمت ولد عمر:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۴) - امباداس راؤ:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۵) - کشن راؤ :-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۶) - شیخ سعید :-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۷) - علی صاحب :-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۸) - محمد خاں :-	〃	〃	〃	〃	〃
(۲۹) - جلال صاحب:-	〃	〃	〃	〃	〃
(۳۰) - بڑے خاں :-	〃	〃	〃	〃	〃
(۳۱) - مدار صاحب:-	〃	〃	〃	〃	〃

(۳۲)۔ فتح محمد :۔ مذکورہ ذیل تمام افراد کو رزیڈنسی کے حوالے کردیا گیا۔ سزا کا علم نہ ہوسکا۔ لیکن عام طور پر ایسے اشخاص کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

(۳۳)۔ شیخ حسین :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳۴)۔ شیخ علی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳۵)۔ حریت خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳۶)۔ بالاجی مقدم :۔ 〃 〃 〃 (۱۱) سال قید اور جائداد ضبط کرلی گئی۔

نرمل (عادل آباد) کی بھیل بغاوتوں (۱۸۵۸) میں حصہ لینے والے اصحاب اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :۔

(۱)۔ رام جی بھیل :۔ گونڈ قبیلے کا سردار اور اس بغاوت کے لیڈر تھے۔ پھانسی دیدی گئی۔

(۲)۔ امیر محمد خاں :۔ گونڈوں کی بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ قتل کردیے گئے

(۳)۔ ملنگ شاہ :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۴)۔ امام خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۵)۔ مدد خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

نلنگر (۱۸۵۹) ضلع پربھنی کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والوں کی فہرست :۔

(۱)۔ محمد غوث :۔ حالات کا علم نہ ہوسکا (۷) ماہ کی قید

(۲)۔ جان باز خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۳)۔ رحمت اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۴)۔ منصور خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۵)۔ رتن گیر :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

(۶)۔ محمد جعفر :۔ 〃 〃 〃 〃 〃

اجنٹہ کے بھیلوں اور اطراف واکناف کے مقامات پر ہونے والی بغاوتوں (۶۰-۱۸۵۷) میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :-

(۱)۔ سیورام ولد کملائے :- حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ ۱۰ سال کی قید بامشقت

(۲)۔ دھونڈے ولد ناگوجی انڈ :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۳)۔ سوناولد مچاپتی : 〃 〃 〃 〃 〃

(۴)۔ انتنا ولد رام ناک مہار :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۵)۔ ناگاولد راجناک :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۶)۔ ماردتی۔ ولد سنتاجی پٹیل :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۷)۔ لچھمن پوری ولد گردون پوری :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۸)۔ ماناجی ولد میاجی پٹیل :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۹)۔ لچھمن ولد سوناجی :- 〃 〃 〃 〃 〃

(۱۰)۔ راماولد سیناک مہار :- 〃 〃 〃 موضع دھوڑا 〃 〃

(۱۱)۔ ولد بھکناک :- 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۱۲)۔ دھتوبا ولد مساجی پٹیل :- 〃 〃 موضع مہڈی پرگنہ بامتی ۷ سال کی سزا بامشقت

(۱۳)۔ کٹوبا ولد مساجی پٹیل :- 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۱۴)۔ کھنڈوجی ولد مساجی :- 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۱۵)۔ کمرشنا :- 〃 〃 〃 〃 سزا تازیانہ

(۱۶) - مہادیو ولد بابو:-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا		سزا تازیانہ
(۱۷) - ہری رام زرگر:-	〃 〃 〃	موضع بامتی	ایک سال قید بامشقت و پابہ زنجیر
(۱۸) - نارائن ک..ار:-	〃 〃 〃 〃	〃	〃 〃
(۱۹) - مہادیو ولد کشن مہار:-	〃 〃 〃 〃	〃	(۱۰) سال کی قید بامشقت
(۲۰) - پنجا ولد بالاز انک:-	〃 〃 〃 〃	〃	〃 〃 〃
(۲۱) - لال خاں ولد بھائی خاں:-	〃 〃 〃 〃	〃	〃 〃 〃
(۲۲) - رام جی ولد راؤجی کنبی:-	〃 〃 〃	موضع دھیر	۳ سال قید بامشقت
(۲۳) - راؤجی ولد طناجی:-	〃 〃 〃 〃	〃	〃 〃 〃
(۲۴) - اماجی ولد ٹرادری: پٹیل:-	〃 〃	موضع لکڑلا بامتی	〃 〃 〃
(۲۵) - سوربا جی انڈ:-	〃 〃 〃 〃	〃	〃 〃 〃
(۲۶) - جیرام ولد نارائن:-	〃 〃	موضع جتور	〃 〃 〃
(۲۷) - کاشی رام ولد نرسوجی کومبتی:-	〃 〃	موضع چور	〃 〃 〃
(۲۸) - پنکپا ولد نارائن جی:-	〃 〃 〃		کمشنر برار کے حوالے کیا گیا۔
(۲۹) - اپاجی ولد گنگاجی زرگر:-	〃 〃 〃		〃 〃 〃
(۳۰) - پلاجی ولد رنگوجی زرگر:-	〃 〃 〃 〃		〃 〃 〃
(۳۱) - رام راؤ ولد ماناجی دلیسہ کھ:-	〃 〃 〃		پربھنی کے نائب کے حوالے کیا گیا۔
(۳۲) - ستواوالد نرسو کیکار(؟):-		(موضع چور)	حبس دوام کی سزا۔

(۳۳)۔ لکشا دھیڑ (ہریجن) حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ بلولی (۱۴) سال سزائے قید

(۳۴)۔ راڈیا ولد سیناس

دھیڑ (ہریجن) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳۵)۔ سایا ولد ملنا :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳۶)۔ گنگنا ولد سیناس :۔

دھیڑ (ہریجن) 〃 〃 〃 موضع چولر 〃 〃 〃

(۳۷)۔ ہریا ولد روپ ناک :۔ 〃 〃 〃 بلولی 〃 〃 〃

(۳۸)۔ بالاجی ولد گراجی :۔ 〃 〃 〃 کردوری 〃 〃 〃

(۳۹)۔ فتح خاں ولد نظام خاں :۔ 〃 〃 〃 چار تھانہ 〃 〃 〃

(۴۰)۔ دیوان شاہ خاں

ولد سید شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃 جنتور 〃 〃 〃

(۴۱)۔ مرزا خاں :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۲)۔ راگھو ولد کوناجی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۳)۔ سلوا ولد مہیتی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۴)۔ راؤجی ولد میاجی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۵)۔ میرا ولد شنکر راؤ :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۶)۔ راؤجی کھنڈوجی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۷)۔ ہنماک ولد کنماک :۔ 〃 〃 〃 اٹولی 〃 〃 〃

(۴۸)۔ سیویا ولد تناک :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴۹)۔ منو ولد کاسی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۰)۔ جکو ولد سیوناک :۔ 〃 〃 〃 سکل 〃 〃 〃

(۵۱)۔ سوکیا ولد تناک :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۲)۔ ڈھوبا ولد بھوانی :۔ 〃 〃 (بکل) 〃 〃 〃

(۵۳)۔ تلیا ولد ستواجی :۔ 〃 〃 (وارڈر) 〃 〃 〃

(۵۴)۔ ایشونتا ولد اپاجی :۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۵)۔ سمبیا ولد کشنا:۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ (وارڈر) ۱۴ سال قید کی سزا

(۵۶)۔ اپناک ولد یکناک:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۷)۔ رادیا ولد یکناک:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۸)۔ پتی ولد سکوا:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۵۹)۔ ہنمانجی ولد مسابی:۔ 〃 〃 〃 (اٹولی) 〃 〃 〃

(۶۰)۔ دولت رام ولد

جسروپ مارواڑی:۔ 〃 〃 〃 جتور ۷ سال قید کی سزا

(۶۱)۔ سداسیو ولد ورکپا

کومٹی:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۶۲)۔ ماکشیم ولد انکوپا

کومٹی:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۶۳)۔ باپو ولد رکساوزی:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۶۴)۔ اپاجی ولد نارائن:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۶۵)۔ لچمن ولد بلونت پٹواری:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۶۶)۔ سیوارام ولد

پانڈورنگ ریز:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

گنگا کھیڑی کی بغاوت (۱۸۶۰) میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست:۔

(۱)۔ محمد حنیف:۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ قتل کر دیا گیا۔

(۲)۔ شیخ لال:۔ 〃 〃 〃 ۲ سال قید کی سزا

(۳)۔ شیخ غلام حسین دی گئی۔

ولد شیخ حسین:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴)۔ جمال محمد:۔ 〃 〃 〃 ۱۱ سال قید کی سزا۔

(۵)۔ دیوجی پٹیل:۔ 〃 〃 〃 وطن داری کی خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔

(۶)۔ راجہ رام پٹیل:۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۷) - آنند راؤ :-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	وطن داری کی خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔
(۸) - حاجی علی بھری :-	〃 〃 〃	لڑائی میں زخمی ہو کر فوت ہو گئے اور معاش بھی ضبط کر لی گئی۔
(۹) - نارو باپٹیل :-	〃 〃 〃	قتل کر دیا گیا۔
(۱۰) - گنگاجی مقدم :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۱) - رستم خاں :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۲) - شیخ داؤد :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۳) - سکھا نائک :-	〃 〃 〃	۱۲ سال قید کی سزا دی گئی۔
(۱۴) - مہادیا :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۵) - وکٹرنا :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۶) - ابلپا :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۱۷) - سوما نائک :-	〃 〃 〃	〃 〃

کھرڑکی بغاوت (۱۸۵۹) میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :-

(۱) - شنکر آتمارام	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	۷ سال قید کی سزا دی گئی۔
(۲) - ترمبک راؤ ولد داجی کھڑے والے :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۳) - شیخ چاند :-	〃 〃 〃	〃 〃
(۴) - دامن راؤ ولد ڈھل :-	〃 〃 〃	۲ سال قید کی سزا دی گئی۔
(۵) - سید رسول :-	〃 〃 〃	ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔
(۶) - غلام نبی خاں عرف پاپامیاں :-	〃 〃	ایک سال قید کی سزا دی گئی

(۷) - چھوٹو حجام :-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	۲ سال قید کی سزا دی گئی۔
(۸) - لال سنگھ دھیڑ (ہریجن) :-	〃 〃 〃 〃	〃 〃 〃

عمرگر اور تامسہ کی بغاوت (۱۸۵۹) میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :-

(۱) - آنند راؤ :-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	قتل کر دیا گیا۔
(۲) - نرسنگ راؤ :-	〃 〃	〃
(۳) - شیخ احمد :-	〃 〃	〃
(۴) - شیخ عبداللہ بن محمد :-	〃 〃	〃
(۵) - شیخ نظام بن محمد :-	〃 〃	〃
(۶) - شیخ محمد بن علی :-	〃 〃	۴ سال قید کی سزا دی گئی۔
(۷) - شیخ سعید بن محمد :-	〃 〃	〃
(۸) - شیخ فراہم بن محمد :-	〃 〃	قتل کر دیا گیا۔
(۹) - محمد علی خاں :-	〃 〃	۳ سال قید کی سزا دی گئی
(۱۰) - دیوجی پٹیل :-	〃 〃	وطن ضبط کر لیا گیا۔
(۱۱) - شیخ احمد بن عبود :-	〃 〃	۱۴ سال کی سزا دی گئی۔
(۱۲) - عمر بن عبود :-	〃 〃	〃
(۱۳) - محمد بن عمر :-	〃 〃	〃
(۱۴) - مبارک بن علی :-	〃 〃	〃
(۱۵) - احمد بن عمر :-	〃 〃	〃
(۱۶) - محمد خاں :-	〃 〃	〃
(۱۷) - علی بن بدر :-	〃 〃	〃
(۱۸) - سید احمد بن عبداللہ :-	〃 〃	〃
(۱۹) - مبارک بن احمد :-	〃 〃	〃
(۲۰) - مبارک بن محمد :-	〃 〃	〃
(۲۱) - اسلم بن سعید :-	〃 〃	〃
(۲۲) - ناصر بن عبود :-	〃 〃	〃

(۲۳)۔ شیخ محمد بن عبود :-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	۱۴ سال کی سزا دی گئی۔
(۲۴)۔ شیخ بن سلیمان :-	〃 〃	〃
(۲۵)۔ مبارک بن عبود :-	〃 〃	〃
(۲۶)۔ سعید بن عبود :-	〃 〃	〃
(۲۷)۔ سعید بن صالح :-	〃 〃	〃
(۲۸)۔ شیخ علی ولد شیخ میراں :-	〃 〃	〃
(۲۹)۔ بڑے خاں ولد حسین خاں :-	〃 〃	〃
(۳۰)۔ بھوانی سنگھ :-	〃 〃	〃
(۳۱)۔ جلال محمد ولد محمد برہان :-	〃 〃	〃
(۳۲)۔ شیخ مدار ولد محمد قادر :-	〃 〃	〃
(۳۳)۔ شیخ حسین :-	〃 〃	〃
(۳۴)۔ فتح محمد ولد محمد علی :-	〃 〃	〃
(۳۵)۔ گلاب خاں :-	〃 〃	رزیڈنسی کے حوالے کر دیا گیا۔
(۳۶)۔ دیوداس :-	〃 〃	〃 〃 〃

ہنگولی کی بغاوت (۱۸۵۹) میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :-

(۱)۔ طرہ باز خاں عرف طرہ خاں :-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	قتل کر دیا گیا۔
(۲)۔ نور خاں	〃 〃	〃
(۳)۔ محمد علی خاں	〃 〃	۳ سال قید کی سزا
(۴)۔ دیوان جی پٹیل :-	〃 〃	وطن ضبط کر لیا گیا۔
(۵)۔ زین خان :-	〃 〃	عبور دریائے شور۔
(۶)۔ بھوجا دھیڑ (ہریجن)	〃 〃	ایک سال قید کی سزا دی گئی۔
(۷)۔ رامیا دھیڑ (〃)	〃 〃	〃
(۸)۔ مرن جی دھیڑ (〃)	〃 〃	〃
(۹)۔ شیو	〃 〃	〃
(۱۰)۔ میر خاں	〃 〃	۷ سال قید کی سزا دی گئی۔

(۱۱)۔ دادا میاں :- حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ ۷ سال قید کی سزادی گئی۔

راجو کی سازش (۱۸۶۰) میں حصّہ لینے اور مدد کرنے والوں کی فہرست :-

(۱)۔ حاجی مشیر علی خاں :-	حالاتِ زندگی	کا علم نہ ہو سکا۔	۱۴ سال قید کی سزا۔
(۲)۔ بہادر خاں :-	〃	〃	〃
(۳)۔ جمال :-	〃	〃	〃
(۴)۔ کالو :-	〃	〃	〃
(۵)۔ شیخ محمد ولد شیخ پیر محمد :-	〃	〃	〃
(۶)۔ شہباز خاں ولد فرید خاں :-	〃	〃	〃
(۷)۔ حیات خاں ولد خیر خاں :-	〃	〃	〃
(۸)۔ قائم خاں ولد بہلول خاں :-	〃	〃	〃
(۹)۔ سید امام :-	〃	〃	〃
(۱۰)۔ جمال شاہ ولد احمد خاں :-	〃	〃	〃
(۱۱)۔ شیخ احمد ولد محمد شریف :-	〃	〃	〃
(۱۲)۔ رمضانی ولد بڈھن شاہ :-	〃	〃	〃
(۱۳)۔ ستیا :-	〃	〃	〃
(۱۴)۔ لال خاں :-	〃	〃	〃
(۱۵)۔ سمبھیا :-	〃	〃	〃
(۱۶)۔ کوسیا :-	〃	〃	〃
(۱۷)۔ باڑیا :-	〃	〃	〃
(۱۸)۔ راجہ علی خاں :-	〃	〃	〃
(۱۹)۔ شاہ ولی خاں :-	〃	〃	〃
(۲۰)۔ سید عبدالقادر :-	تحقیقات کے قبل انتقال ہو گیا۔		〃
(۲۱)۔ غلام نبی :-	〃	—	〃
(۲۲)۔ محمد خاں :-	حالات زندگی	کا علم نہ ہو سکا۔	ایک سال قید کی سزا۔
(۲۳)۔ شیخ چاند :-	〃	〃	〃

(۲۴)۔ شیخ حسن	:-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	دو سال قید کی سزا۔
(۲۵)۔ کونڈو	:-	〃	ایک سال قید کی سزا۔
(۲۶)۔ غازی خاں	:-	〃	〃
(۲۷)۔ خاں محمد	:-	〃	〃
(۲۸)۔ ہیر داس	:-	تحقیقات کے قبل انتقال ہو گیا۔	〃
(۲۹)۔ امیر محمد	:-	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	۲ سال قید کی سزا۔
(۳۰)۔ رسول شاہ	:-	〃	ڈیڑھ سال قید کی سزا۔
(۳۱)۔ سید منور	:-	〃	ایک سال قید کی سزا۔
(۳۲)۔ رامیا	:-	〃	〃
(۳۳)۔ سنگھیا	:-	〃	〃
(۳۴)۔ پوچیا	:-	〃	〃
(۳۵)۔ رامیا	:-	〃	〃
(۳۶)۔ یداللہ بیگ	:-	〃	〃
(۳۷)۔ ایسیا	:-	〃	〃
(۳۸)۔ کھنڈیا	:-	〃	〃
(۳۹)۔ دھونڈیا	:-	〃	〃
(۴۰)۔ امام خاں	:-	〃	〃
(۴۱)۔ راجیا	:-	〃	〃
(۴۲)۔ سکھیا	:-	〃	〃
(۴۳)۔ سائیگا	:-	〃	〃
(۴۴)۔ بالیا	:-	〃	〃
(۴۵)۔ ستیا	:-	〃	〃
(۴۶)۔ سیویا	:-	〃	〃
(۴۷)۔ کشٹنا	:-	〃	〃
(۴۸)۔ کیریا	:-	〃	〃

(۴۹)۔ محی الدین خاں :۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ عبور دریائے شور کی سزا۔

(۵۰)۔ امیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۱)۔ جان باز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۲)۔ کریم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۳)۔ نواز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۴)۔ فتح خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۵)۔ دن مست خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۶)۔ رحمٰن خان :۔ 〃 〃 〃

(۵۷)۔ باز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۸)۔ حیات :۔ 〃 〃 〃

(۵۹)۔ سیف خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۰)۔ غازی خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۱)۔ عمر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۲)۔ عزیز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۳)۔ محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۴)۔ امیر خاں ثانی :۔ 〃 〃 〃

(۶۵)۔ نظام خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۶)۔ غوث خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۷) عثمان خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۸)۔ نظیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۹)۔ حسن خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۰)۔ نبی خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۱)۔ گلزار خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۲)۔ انور خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۳)۔ حمید خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۴)۔ نذر خاں :۔	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔		عبور دریائے شور کی سزا۔
(۷۵)۔ احمد خاں :۔	〃	〃	〃
(۷۶)۔ غوث داد خاں :۔	〃	〃	〃
(۷۷)۔ عبدالرحمٰن خاں :۔	〃	〃	〃
(۷۸)۔ لعل اللہ خاں :۔	〃	〃	〃
(۷۹)۔ ولی خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۰)۔ طرہ خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۱)۔ نصیب خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۲)۔ شاہ ولی خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۳)۔ شجاعت خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۴)۔ نادر خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۵)۔ کریم خاں ثانی :۔	〃	〃	〃
(۸۶)۔ دولہ خاں :۔	〃	〃	〃
(۸۷)۔ فرید خاں :۔	〃	〃	〃

ریاست حیدرآباد کے اضلاع مرہٹواڑہ میں ہوئی بغاوتوں کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے اور ان بغاوتوں میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مجاہدین کی فہرست بھی ہے جن کے بارے میں یہ علم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کن مقامات کی بغاوتوں میں حصہ لیا تھا۔ قطعی طور پر یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بغاوتیں کن سالوں میں ہوئی تھیں۔ البتہ ان مجاہدین کو دی گئی سزاؤں کے ساتھ بعض جگہ سن درج کیے گئے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بغاوتیں غالباً ۱۸۵۹ء۔۱۸۶۰ء کے درمیانی مدت میں ہوئی تھیں۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ان مجاہدین کے ناموں کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے ان بغاوتوں کے مقام اور سن کا تعین کیے بغیر ان کے ناموں کی فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

مرہٹواڑہ کے مختلف اضلاع کی بغاوتوں (۱۸۵۹ء۔۱۸۶۰ء) میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :۔

(۱)۔ امیر اللہ خاں	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	شہر بدر کر دیا گیا۔

(۲)۔ شیر دل خاں :۔	حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔	عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔
(۳)۔ امیر حمزہ خاں:۔	〃 〃	〃
(۴)۔ قدن خاں :۔	〃 〃	〃
(۵)۔ کشن راؤ تعلقدار:۔	〃 〃	خدمت سے علاحدہ کر دیا گیا۔
(۶)۔ بینی سنگھ :۔	〃 〃	۱۴ سال قید کی سزا ،
(۷)۔ گردھاری :۔	〃 〃	〃
(۸)۔ مہارخ سنگھ:۔	〃 〃	〃
(۹)۔ رمضان علی :۔	〃 〃	〃
(۱۰)۔ ہیرا :۔	〃 〃	〃
(۱۱)۔ بٹو :۔	〃 〃	〃
(۱۲)۔ اسفندار خاں:۔	〃 〃	〃
(۱۳)۔ رفاقت علی :۔	〃 〃	〃
(۱۴)۔ راج محمد :۔	〃 〃	〃
(۱۵)۔ گلاب خاں :۔	〃 〃	۷ ماہ قید کی سزا دی گئی۔
(۱۶)۔ رحم دل خاں:۔	〃 〃	〃
(۱۷)۔ نواب خاں :۔	〃 〃	〃
(۱۸)۔ محمد حنیف دکھنی:۔	〃 〃	رزیڈنسی کے حوالے کیا گیا۔
(۱۹)۔ شیخ لال :۔	〃 〃	〃
(۲۰)۔ جلال خاں :۔	〃 〃	〃
(۲۱)۔ جمال محمد :۔	〃 〃	〃
(۲۲)۔ شاہ باز خاں:۔	〃 〃	〃
(۲۳)۔ رازدار خاں:۔	〃 〃	〃
(۲۴)۔ دیو جی :۔	〃 〃	〃
(۲۵)۔ مہدا جی :۔	〃 〃	〃
(۲۶) یادیا :۔	〃 〃	〃

(۲۷)۔ سید شاہ ولد غلام قادر :۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

(۲۸)۔ نعمت اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۲۹)۔ یموں خاں ولد نعمت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۰)۔ بہرام خاں ولد خاں زاد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۱)۔ یداللہ خاں ولد اورنگ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۲)۔ شاہ داد خاں ولد داؤد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۳)۔ گل انداز خاں ولد دل بند خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۴)۔ سید خلیل ولد سید عمر :۔ 〃 〃 〃

(۳۵)۔ رحیم خاں ولد محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۶)۔ معزالدین خاں ولد شیر محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۷)۔ منصور خاں ولد قلندر خاں :۔ 〃 〃 عبور دریائے شور اور قید دوام کی سزا دی گئی۔

(۳۸)۔ دیدار خاں ولد عزیز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۳۹)۔ سعادت خاں ولد عمر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۰)۔ حیدر خاں ولد شیر علی خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۱)۔ سمندر خاں ولد عزت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۲)۔ سعادت خاں ولد رحمت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۳)۔ نسیم خاں ولد طلب دار خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۴)۔ عادل خاں ولد کالے خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۵)۔ قاسم خاں ولد موسیٰ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۶)۔ سید نواب ولد سید میر :۔ 〃 〃 〃

(۴۷)۔ سردار خاں ولد اشرف خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۸)۔ احمد شاہ خاں ولد فقیر محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۴۹)۔ احمد خاں ولد حبیب خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۰)۔ عبدالرحمٰن خاں ولد حبیب خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۱)۔ شاہ دولہ خاں ولد شیر علی خاں :۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ عبور دریائے شور اور قید دوام کی سزا دی گئی۔

(۵۲)۔ سید و میاں ولد جیت میاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۳)۔ عمر خاں ولد دید اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۴)۔ سید رسول ولد سید شاہ :۔ 〃 〃 〃

(۵۵)۔ شیر خاں ولد حمان خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۶)۔ امام خاں ولد الٰہی خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۷)۔ عبداللہ خاں ولد خیر محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۸)۔ نور خاں ولد قایم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۵۹)۔ میر عالم خاں ولد عزت شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۰)۔ موسیٰ خاں ولد زمان شیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۱)۔ جواہر خاں ولد قلندر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۲)۔ بہادر خاں ولد ظفر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۳)۔ عظیم خاں ولد نوبت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۴)۔ ناظر خاں ولد عجب خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۵)۔ شکور خاں ولد دائم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۶)۔ عبداللہ خاں ولد دیدار خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۷)۔ موسیٰ خاں ولد امیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۸)۔ اعظم خاں ولد رحیم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۶۹)۔ سراندا زخاں ولد ایاز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۰)۔ صولت خاں ولد علی الدین خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۱)۔ سعید خاں ولد سید محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۲)۔ منصور خاں ولد عمر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۳)۔ نذر خاں ولد عمر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۴)۔ میر بار خاں ولد خاں یار خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۵)۔ مدد خاں ولد نور محمد خاں :۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ عبور دریائے شور اور قید دوام کی سزا دی گئی۔

(۷۶)۔ داؤد خاں ولد حضر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۷)۔ رحمت اللہ خاں ولد سعد اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۸)۔ سرور خاں ولد قمر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۷۹)۔ طرہ باز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۰)۔ محمد خاں ولد حضرت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۱)۔ نسیم خاں ولد عبد اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۲)۔ فیروز خاں ولد عالم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۳)۔ محمد خاں ولد غلام محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۴)۔ رستم خاں ولد سرور خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۵)۔ حسن خاں ولد بادل خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۶)۔ عبد اللہ خاں ولد سلطان خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۷)۔ سیف اللہ خاں ولد محی الدین خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۸)۔ منور خاں ولد صغیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۸۹)۔ انور خاں ولد امیر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۰)۔ حسن خاں ولد نصر اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۱)۔ سیف اللہ خاں ولد فرخ شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۲)۔ ولی محمد ولد فقیر محمد :۔ 〃 〃 〃

(۹۳)۔ محی الدین ولد بادشاہ صاحب :۔ 〃 〃 〃

(۹۴)۔ نور شاہ خاں ولد بہادر شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۵)۔ میر باز خاں ولد جان باز خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۶)۔ رحمت شاہ خاں ولد فضل شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۷)۔ رحمت شاہ خاں ولد بہادر شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۹۸)۔ بصیر خاں ولد سیار محمد خاں) :۔ 〃 〃 〃

(۹۹)۔میر عالم خاں ولد کریم خاں :۔ حالات زندگی کا علم نہ ہو سکا۔ عبور دریائے شور اور قید دوام کی سزا دی گئی۔

(۱۰۰)۔ امیر خاں ولد عظیم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۱)۔ شاہ خاں ولد شاہد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۲)۔ مردی خاں ولد اصغر خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۳)۔ بدرالدین خاں ولد الٰہ دین خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۴) داراب خاں ولد میاں گل خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۵)۔ سید انور خاں ولد نور علی خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۶) نواز خاں ولد محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۷) غلام حسین خاں ولد سبحان شاہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۸)۔ گلاب شاہ خاں ولد غلام خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۰۹) صاحب شاہ خاں ولد معظم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۰)۔ سعد خاں ولد احمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۱)۔ میاں نور خاں ولد شاہ نور خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۲)۔ سوائے خاں ولد ننھے خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۳)۔ زبردست خاں ولد شیخ نور خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۴)۔ میر محمود خاں ولد سید محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۵)۔ عطائی خاں ولد میر زمان خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۶)۔ حکیم خاں ولد محمد دین خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۷)۔ امیر خاں ولد نصر اللہ خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۸)۔ سید میر خاں ولد دین محمد خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۱۹)۔ قاسم خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۲۰)۔ عظمت خاں :۔ 〃 〃 〃

(۱۲۱)۔ ہشتم خاں ولد سرور خاں :۔ 〃 〃 〃

بیگم بازار (شہر حیدر آباد) میں باغیانہ تحریک ۱۸۶۲ء[1]

۱۸۵۷ء میں برٹش رزیڈنسی پر مولوی علاوالدین اور طرہ باز خاں کی قیادت میں حملے کے بعد ریاست کے دوسرے مرکزوں پر بغاوتوں کا سلسلہ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا اور ان بغاوتوں کو کچلنے کے "انعام" کے طور پر آصف جاہ پنجم اور دیوان مختار الملک کو کئی خطابات، اعزازات اور تحفہ و تحائف دیے گئے اور یہ سمجھ لیا گیا کہ اب حیدر آباد میں امن و امان کا بول بالا ہے لیکن یہ ایک غلط فہمی تھی حکمرانوں کی ـــــ حالانکہ بغاوت کا جو شعلہ ۱۸۵۷ء میں بھڑکا تھا وہ اس شدت سے بظاہر نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس آگ کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ بغاوتوں کو کچلنے کے لیے دیے انعام و اکرام کو حیدر آباد کے عوام نے اپنی عزت و آبرو پر ایک طمانچہ سمجھا اور انھوں نے اپنی اس بے عزتی کا جواب فارسی میں لکھے ہوئے اس اعلان نامہ سے دیا جو انھوں نے نظام کے محل، ان دو مسجدوں میں جہاں مختار الملک اور شمس الامرا، نماز ادا کیا کرتے تھے۔ (نیا پل افضل گنج) کے پاس، اور شہر کے باب الداخلہ پر آویزاں کیا تھا۔ اس طویل اعلان نامے کے اقتباسات ہم پیش کر رہے ہیں۔" دکن کے حکمران اور عہدہ دار غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کے دماغ پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ خدائے تعالیٰ انھیں اپنا فضل و کرم عطا کرے۔ کمپنی (ایسٹ انڈیا) کی ایما پر دیوان یہ سازش کر رہا ہے اور مشورے دے رہا ہے کہ کمپنی کی جانب سے سٹار آف انڈیا کا اعزاز، تحفے اور نائٹ ہڈ (Knight - Hood) کا خطاب دیا جا رہا ہے۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیے جائیں۔ کچھ دنوں بعد اگر یہ اعزازات قبول کر لیے گئے۔ تو کہا جائے گا کہ افغانوں، عربوں اور روہیلوں کو شہر بدر کر دیا جائے، شہر کے عوام سے ہر قسم کے ہتھیار چھین لیے جائیں۔ یہ حکم بھی دیا جائے گا کہ شہزادے (مبارز الدولہ) کے مکان پر فوجی پہرہ بٹھا دیا جائے اور ریاست کی ترقی اور نشوونما کے لیے کمپنی سرکار کی جانب سے عدالت قائم کی جائے۔ اگر کمپنی سرکار کے ان احکامات کو ان سنا کر دیا جائے تو پھر حکمران (حیدر آباد کے) کو گورنر جنرل کے حضور میں

---

[1] The Hydrabad State committee, The freedom struggle in Hydrabad Vol II (1857 - 1885) pp 207 — 225

پیش ہونے کو کہا جائے گا تاکہ انھیں شخصی طور پر یہ احکامات سنائے جائیں۔ اس کے باوجود اگر حکمران نے بات ٹالنے کی جرأت کی تو پھر اس خاندان (آصف جاہ) کے کسی اور فرد کو حکمران بنا دیا جائے گا۔ یہ تمام اقدامات دیوان کی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ خبردار اور ہوشیار! ورنہ بعد میں آپ کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا۔ امیر کبیر (شمس الامرا:) بھی ریاست کی بھلائی کے لیے کوئی نیک مشورہ نہیں دیتے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ان کا گھر محفوظ ہے وہ حکمران (آصف جاہی) اور ریاست کے بارے میں کیوں سوچیں؟ افسوس! صد ہزار افسوس! کہ دنیا کی محبت نے ان کے دل پر اس قدر حاوی ہو گئی ہے کہ اب ان میں پہلا سا اعتقاد اور مذہب اسلام کے تعلق سے وہ جذبہ اور جوش باقی نہیں رہا۔ ان کی یہ دنیا داری لائق لعنت اور ملامت"۔ اس اعلان نامے کے آخر میں خدا سے یہ دعا مانگی گئی کہ "کاش قادر مطلق ان لوگوں (ریاست کے حاکموں) کے دماغوں پر پڑے غفلت کے پردے ہٹا دے اور ان میں مذہب اسلام کے لیے ایک نیا جوش اور اعتقاد پیدا کرے"۔ دعا کے بعد یہ انتباہ بھی دیا گیا کہ "عوام بربادی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ وہ تباہ حالی اور مصیبتوں کا شکار ہیں اب یہ بات یقینی ہے کہ وہ متحد ہو کر دیوان کے خلاف شورش برپا کریں گے"۔

چنانچہ اس اعلان نامہ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور شہر کو (۱۸۶۲ء) میں ایک بار پھر سیاسی اتھل پتھل، شورش اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی شروعات اس وقت ہوئی جب راؤ صاحب پیشوا، مالوہ، بڑودہ اور پونے ہوتے ہوئے مارچ ۱۸۶۲ء کو حیدرآباد پہنچے اور بیگم بازار میں کرایہ کا گھر لے کر اپنے قریبی ساتھی کشن راؤ کے ساتھ قیام پذیر ہوئے اور وہ چھ (۶) مہینے تک حیدرآباد میں روپوش رہے۔

انھیں بیگم بازار میں مقیم گوسائین (Gosain) طبقہ سے جو بنک کاری کا کاروبار کرتے تھے۔ ہر ممکنہ مدد ملی۔ اس کے علاوہ انھیں تعلقہ آرمور (ضلع نظام آباد) کے زمین دار رکمار یڈی اور کشٹاپور (ضلع عادل آباد) کے ایک برہمن جاگیردار کی بھی بھرپور تائید حاصل تھی۔ راؤ صاحب با اثر لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے مالی امداد دینے اور قیمتی شال بھی تقسیم کرتے تھے۔ اس طرح وہ شہر کے اکثر علاقوں اور مختلف طبقوں کے عوام کو اپنی تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس تحریک میں مختلف طبقات کے ہندوؤں

کے علاوہ پٹھان، راٹھور، بلوچی اور عرب شامل تھے۔ اتنی وسیع اور پھیلی ہوئی تحریک کو جاری رکھنے ان کے کارکن چھپ کر کام کرتے اور آپس میں ربط باقی رکھنے خفیہ مقامات پر ملتے جن میں قابل ذکر یہ تھے۔ بخش گنج، سیتارام باغ، قمرالدین خاں کا باغ، (گوشہ محل) بال مکند باغ، شرف بی کا باغ، جگن تھ کا مندر، چنچل گوڑہ، مشیرآباد، اورحسین شاہ ولی صاحب کی درگاہ، نارسنگی میں ساہوکاروں کے باغ، کاروں کے قریب گوساین کا ایک مٹھ، کشن باغ وغیرہ۔

تحریک کے اس غیر معمولی پھیلاؤ اور اس کی ہمہ گیر نوعیت سے خائف ہو کر کمپنی سرکار کے عہدہ دار نے کہا تھا کہ "نظام کا ملک اس وقت بغاوت کا ایک گڑھ بنا ہوا ہے اور اگر عرب (بڑی تعداد میں) شامل ہو جائیں تو پھر سارا ملک (ریاست) بغاوت کر دے گا"۔

راؤ صاحب کا پتہ لگانے اور انھیں گرفتار کرنے نظام کی پولیس نے مختلف مقامات پر چھاپے مارے لیکن راؤ صاحب اور کشن راؤ کسی طرح حیدرآباد سے باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے البتہ ان کے ساتھیوں اور کارکنوں پر عدالت میں مقدمات چلائے گئے اور مختلف مختلف نوعیت کی سزائیں دی گئیں۔ ان پر الزام صرف یہ تھا کہ وہ راؤ صاحب کی سازش میں شریک تھے، ان سے شال اور مالی امداد حاصل کی تھی۔

بیگم بازار (شہر حیدرآباد) کی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست:۔

(۱) - رام پر بن ولد شیودت:۔	ایودھیا کے برہمن خاندان سے تعلق تھا ان پر باغی رام راؤ کا ساتھ دینے کا الزام تھا۔	حبس دوام کی سزا
(۲) - بال کشن ولد آتمارام :۔	رتنا گیری کے برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۳) - بھاؤ ولد گوپال جی :۔	راجپور کے (ضلع رتنا گیری) مرہٹہ خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۴) - لکشمن داس ولد ماتادین ولد سکھ لال۔ :۔	ایودھیا کے رہنے والے تھے۔	〃
(۵) - جندن ولد بھوانی برشاد :۔	تمکان گڑھ کے گوڑ برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	〃

(۶)- جنتو با ولد سکھارام مادھو :-	گوالیار کے برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	حبس دوام کی سزا۔
(۷) - وینکٹ چاری ولد سیتو چاری:-	وشنو مذہب کے پیرو تھے۔	〃
(۸) - رکما ریڈی ولد نرسمہا ریڈی:-	موترہ گاؤں کے زمین دار تھے۔	〃
(۹) - تلجا پرشاد		دس سال بلا مشقت کی سزا۔
(۱۰) - وشنوناتھ بھٹ ولد وٹھل بھٹ:-	اجین کے رہنے والے تھے۔	دس سال با مشقت کی سزا۔
(۱۱) - رام بھٹ ولد مورو بھٹ :-	کشنا پور کے برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۱۲) - لنگیا ولد راجن بھٹ :-	بال مکند باغ (حیدرآباد) کے مندر کے پجاری تھے۔	〃
(۱۳) - نرسنگا چاری ولد بے رتنا چاری:-	پورن مل باغ (حیدرآباد) کے رہنے والے تھے۔	〃
(۱۴) - کالی داس ولد تلسی داس :-	بڑودہ کے بقال خاندان سے تعلق تھا۔	۷ سال با مشقت کی سزا
(۱۵) - کشنا چاری ولد ویر راگھو چاری:-	کم بھاکن کے برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۱۶) - اینتا ولد راجن بھٹ :-	بال مکند باغ (حیدرآباد) کے مندر کے پجاری تھے۔	〃
(۱۷) - بالا بھاؤ ولد اننا سادھو :-	مدھول میں رہنے والے برہمن تھے۔	〃
(۱۸) - نرہر بھٹ ولد منا جی پنت بھٹ:-	〃 〃	〃
(۱۹) - نگی راؤ ولد بال گوپال :-	جلال پور (تعلقہ میدک) کے رہنے والے تھے	۳ سال کی با مشقت کی سزا۔
(۲۰) - راما چاری ولد انگا چاری :-	رمیش ہرجی کے رہنے والے اور وشنو مذہب کے پیرو تھے۔	〃
(۲۱) - کشن راؤ عرف کشیٹا ولد پرشوتم :-	آصف نگر (حیدرآباد) میں رہنے	〃

	والے برہمن تھے۔	
(۲۲) - وامن کومٹی ولد پرسورام :-	سمپت گاؤں کے کومٹی اور عارضی قیام بیگم بازار میں تھا۔	۳ سال کی بامشقت کی سزا۔
(۲۳) - اننا ولد بزمکھ :-	گونی گاؤں (ضلع ناگر) کے رہنے والے تھے۔	〃
(۲۴) - بلدیو پرشاد ولد بالادین :-	(فوجی) بنسواڑہ کے رہنے والے برہمن۔	〃
(۲۵) - متھراپرشاد ولد چاندی پرشاد :-	ناناڈیڑ کے رہنے والے برہمن۔	〃
(۲۶) - گنیش سنگھ ولد اسرار سنگھ :-	پٹواری اور راجپوت خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۲۷) - سیتارام (دوم) ولد ٹھاکر پرشاد :-	بنسواڑہ کے رہنے والے برہمن۔	〃
(۲۸) - پریم سنگھ :-	〃 〃	〃
(۲۹) - رام پرتاپ ولد نتھورام :-	بیگم بازار (حیدرآباد) کا رہنے والا۔	ایک سال قید کی سزا۔
(۳۰) - نندلال عرف مہرا ولد پیرجی :-	〃 〃	〃
(۳۱) - رام چندر راؤ ولد لچھمن راؤ :-	برہمن خاندان سے تعلق تھا۔	〃
(۳۲) - لچھمن راؤ ولد پنڈت گنگا دھر :-	〃 〃	〃
(۳۳) - موہن لال ولد کشن لال :-	بیگم بازار کے اگروال خاندان سے تعلق تھا۔	۵ ہزار روپیوں کا جرمانہ
(۳۴) - پورن مل :-	〃 〃	۱۰ ہزار روپیوں کا جرمانہ
(۳۵) - حبیب خاں کوتوال :-	〃 〃	اور خدمت سے علاحدگی
(۳۶) - جے سوریہ لچھمن سنگھ ولد نندی دیں :-	کانپور کا رہنے والا برہمن۔	〃
(۳۷) - کپورچند ولد چوتھ مل :-	بیگم بازار میں سکونت اختیار کی تھی۔	رہا کر دیا گیا۔
(۳۸) - گوپال بھٹ ولد باواجی :-	نرمکھ کے رہنے والے ایک برہمن۔	〃
(۳۹) - رام بھٹ دوم ولد بالاجی :-	جیٹ گپا کے رہنے والے ایک برہمن۔	〃
(۴۰) - گنڈو با ولد رام چندر بھٹ :-		〃
(۴۱) - گنپتی باوا ولد آنند بھٹ :-		〃

سکندرآباد اور کوکٹپلی میں باغیانہ سرگرمیاں اور گرفتاریاں :- بیگم بازار کی بغاوت کے تعلق سے

ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سکندرآباد اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں کمپنی سرکار کے خلاف چھوٹے پیمانے پر جو باغیانہ سرگرمیاں اور گرفتاریاں عمل میں آئیں ان کا بھی سرسری جائزہ لے لیا جائے۔

رزیڈنسی پر حملے کے (جولائی ۱۸۵۷ء) کچھ دنوں پہلے سکندرآباد میں مقیم فوجوں میں بے چینی اور انحراف کے آثار پائے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو رزیڈنٹ نے ریاست کے دیوان کو جو خط لکھا اس میں کہا گیا تھا کہ گیارہ افراد کو سکندرآباد چھاؤنی کے علاقے میں گرفتار کیا گیا اور ان کے بیانات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس واقعہ کی مزید تحقیقات کے لیے ان افراد کو ریاست کے دیوان کے حوالے کر دیا گیا جن کے نام یہ تھے۔

(۱) شیوچرن (۲) مادھوداس (۳) الوپ سنگھ (۴) کشن داس (۵) لعل خاں (۶) قادر خاں۔

ریاست کے دیوان نے رزیڈنٹ کو یہ اطلاع دی کہ مذکورہ بالا اشخاص کے کیس کو فوجداری عدالت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ دوران تحقیقات یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ اشخاص فوج سے نکالے ہوئے سپاہی تھے۔

اسی طرح بلارم کے قریب کوکٹ پلی میں بھی ایک اور واقعہ پیش آیا۔ حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج کے ایک اہم انگریز کیپٹن ماسن ٹائر (Capt. Murray) پر گھوڑا سوار فوج کے ایک سپاہی نے تلوار سے حملہ کیا اور اس افسر کے ہاتھ کو زخمی کر دیا اور پھر حملہ آور طیش میں آکر بے قابو ہو گیا اس نے ایک رسالدار اور تین سپاہیوں کو بری طرح زخمی کر دیا۔ حملہ آور سپاہی فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے گولی مار کر زخمی کر دیا گیا، عجلت میں کورٹ مارشل کی کارروائی پوری کر کے اس سپاہی کو پھانسی دے دی گئی۔

اس واقعہ کے بعد رزیڈنٹ نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ اس کے پیچھے کن اشخاص کا ہاتھ تھا۔ تحقیقات کے بعد اس بات کا علم ہوا کہ وہ لوگ جو برٹش سرکار کے خلاف ہیں۔ ان کی یہ کوشش رہی کہ نہ صرف نظام کو انگریزوں کے خلاف رویہ اختیار کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے بلکہ عوام میں بھی بے چینی پھیلائی جائے۔ ان میں قابل ذکر اشخاص یہ تھے۔

(۱) عظمت جنگ (۲) مردھا محمد چاند (۳) بزخاں (۴) مولوی ابراہیم۔

مذکورہ بالا ان تمام اشخاص کا ذکر برٹش رزیڈنسی پر حملہ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے ناموں میں آچکا ہے اس لیے یہاں ان کا دوبارہ ذکر غیر ضروری ہو گا۔

پھالکی میں بغاوت ۔ ۱۸۶۷ء: ستارا کے راجہ کو ان کی ریاست سے بے دخل کرنے کے بعد کئی اصحاب اپنے کو راجہ صاحب کے رشتہ دار بتلا کر دکن کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے اور کئی مقامات پر بغاوتیں شروع کرنے میں مصروف تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً (۹) سال (۱۸۵۸ - ۱۸۶۷ء) تک جاری رہا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۹ء میں کیپٹن مرے (Capt. Murray) نے ایک شخص کو گرفتار کیا جو اپنے کو ستارا کا راجہ ظاہر کر رہا تھا اور ثبوت کے طور پر راجہ صاحب کے خاندان کے اکثر افراد کا نام لے رہا تھا جو یا تو مر گئے تھے یا پھر دکن کے باہر مختلف مقامات پر سازشوں میں حصہ لے رہے تھے۔

اسی زمانہ میں رام راؤ عرف جنگ بہادر نامی ایک شخص کو پھالکی کے قریب جو اس وقت ضلع بیدر میں شامل اور امیر کبیر شمس الامراء کی جاگیر کا ایک حصہ تھا گرفتار کر لیا گیا۔ رام راؤ پر یہ الزامات لگائے گئے تھے کہ اس نے اپنے کو ستارا کا چھترپتی بتلایا۔ کئی سو اشخاص کو اپنا ہمنوا بنا لیا، اپنے ساتھیوں کے تقرر (نامزدگی) کے احکامات جاری کیے، بیدر کے ایک تعلقہ آشٹی کی گڑھی پر قبضہ کر کے وہاں بھگوا جھنڈا گاڑ دیا۔ انھوں نے سروار (Sarwar) گاؤں کے پٹیل آنند راؤ کی مدد سے ایک مضبوط گڑھی تعمیر کروایا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے۔ (۲۵) ہزار کی ہنڈی دی گئی، گڑھی کی حفاظت کے لیے دو سو سپاہی مقرر کیے اور محافظ دستے بھی بنائے۔ حکومت کو جب اس کا علم ہوا تو گڑھی کا محاصرہ کیا گیا، لیکن رام راؤ وہاں سے بچ کر نکل گیا۔ اور آوچا (Aucha) گاؤں (تعلقہ پھالکی) رائچور اور لورما (Lorma) وغیرہ میں روپوش رہے۔ اسی دوران انھوں نے اس گاؤں کے پٹیلوں سے آپسی دوستی اور اتحاد کا معاہدہ کیا۔ یہ تمام اقدامات اس مقصد سے کیے گئے تھے کہ پانچ سو سواروں اور پیدل سپاہیوں کا ایک طاقتور دستہ تیار کیا جائے تاکہ نل درگ (Naldurg) اور آوسا (Ausa) کے قلعوں کو فتح کیا جا سکے۔ ان تمام تیاریوں

---

1. ... State Committee, The freedom ... 1095)

کا مقصد یہی تھا کہ بھالکی اور اطراف کے علاقوں میں بغاوت کرائی جائے۔

رام راؤ کی جانب سے جو حکم نامے جاری کیے گئے تھے اس کا متن درج کیا جارہا ہے:-

"میرے اجداد کو اس ملک پر کئی برسوں تک حکمرانی کا اعزاز حاصل تھا لیکن انگریزوں نے ان کے شاہی تخت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ اب اس تخت کو واپس حاصل کرنا اور انگریزوں کا نام و نشان مٹا دینا میرا مصمم ارادہ ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے کئی افراد کو ملازم رکھا گیا ہے۔ اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو بھی شامل کیا جائے گا۔ جمعدار کو (۴۰) روپے، سپاہی کو (۳۰) روپے اور سوار کو (۱۰) روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے گی۔ اس اعلان نامہ پر باضابطہ طور پر دستخط ثبت کی گئی ہے۔ خدا قادر مطلق اور حاضر و ناظر ہے۔" (اس کی تاریخ ۲۵ شعبان ۱۲۸۶ھ تھی)۔

مقدمہ کے دوران دیے گئے ایک بیان میں گوبند راؤ (گواہ) نے یہ بتلایا کہ رام راؤ کو شمالی ہند (غالباً نیپال) سے تانتیا ٹوپے نے دکن میں انقلابی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے بھیجا تھا۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھالکی سازش بجا طور پر ۱۸۵۷ء کی انقلابی بغاوت کی آخری صدائے بازگشت تھی۔ ان سنگین الزامات کی بنا پر رام راؤ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا اور ان کے خلاف مقدمہ شروع کردیا گیا۔ رزیڈنٹ کے آفس میں ان کے ابتدائی بیانات قلمبند کیے گئے اور پھر اس مقدمہ کو حیدرآباد کی عدالت کے حوالے کردیا گیا۔ اس کیس میں رزیڈنٹ کی دلچسپی کے باعث مقدمہ کی کاروائی میں سرعت پیدا کی گئی اور فیصلہ بھی جلد سنا دیا گیا۔ چنانچہ فوجداری عدالت کے جج مولوی نصر اللہ خاں نے مئی ۱۸۷۰ء (مطابق ۱۲ محرم ۱۲۸۴ھ) کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ عدالت نے ان افراد پر بغاوت کا سنگین الزام لگایا اور اسی بنا پر رام راؤ عرف جنگ بہادر اور ان کے تیس ساتھیوں کو حبس دوام کی سزا، دو مجاہدین کو (۱۴) سال کی سزا سنائی گئی اور ایک کو بری قرار دیا گیا۔

مقدمہ کے دوران جو بیانات قلمبند کیے گئے ان سے یہ بات ابھر کر آتی ہے کہ اس سازش کا سب سے اہم لیڈر رام راؤ عرف جنگ بہادر تھا اور اس کی ہدایات کے مطابق دوسرے ساتھی عمل کیا کرتے تھے۔ اس کے حتمی بیان کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ستارا کے راجہ کے خاندان سے اس کا یقینی تعلق تھا۔ بیانات سے اس

کا بھی علم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑی بغاوت نہ تھی بلکہ بھالکی کی حد تک محدود تھی البتہ اطراف واکناف کے پٹیل اور پٹواریوں کا پوری طرح تعاون حاصل تھا۔ اس سازش میں باغیوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے اس کے خلاف فوری اقدامات کیے اور مقامی عوام کا بھی بھرپور تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ اس سازش کے لیے مالیہ کی فراہمی ہزاروں روپیوں کی ہنڈیوں کے توسط سے ہوئی جو رام راؤ اور اس کے بعض با اعتماد ساتھی مختلف مقامات سے فراہم کرتے تھے۔

بھالکی کی سازش میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست :-

(۱) رام راؤ عرف جنگ بہادر ولد جگدیو راؤ۔

وہ ستارہ (قدیم) کے رہنے والے تھے۔ بعض گواہوں کے بیان کے مطابق ان کا اصلی نام مادھو راؤ تھا۔ جو ایک فقیر اور بھگت کے بھیس میں رہا کرتے تھے۔ وہ تقریباً تین سال اس پاس کے جنگلوں میں چھپتے رہے۔

مقدمہ کے دوران یہ ثابت ہوا کہ بھالکی سازش کے اہم لیڈر وہی تھے۔ وہ اپنے کو ستارا کے چھترپتی کے بھتیجا/ بھانجا بھی کہا کرتے تھے۔ انھوں نے جو مہر بنائی تھی اس پر بھی "چھترپتی" کندہ تھا۔ دوران تلاشی ان کے پاس سے کوئی اہم دستاویزات برآمد نہیں ہوئے اور نہ کوئی ایسے کاغذات ملے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ کسی قابل اعتراض مالی لین دین میں ملوث تھے۔ البتہ سازش کے اخراجات کی پابجائی کے لیے وہ ہزاروں روپیوں کی ہنڈیاں لاتے اور متعلقہ افراد میں تقسیم کرتے تھے۔ لیکن اس کا علم نہ ہو سکا کہ وہ ہنڈیاں کہاں سے لاتے تھے۔ اور روپیوں کی فراہمی کے ذرائع کیا تھے۔

ان پر فوجیں اکٹھا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا اس سے انھوں نے اپنے عدالتی بیان میں صاف انکار کر دیا اور

حبس دوام اور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

یہ بھی کہا کہ عدالت میں جو مُہر پیش کی گئی تھی وہ ان کی نہیں بلکہ ان کے چچا یعنی ستارا کے راجہ چھتر پتی کی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق کرشنا دیش پانڈے اور شنکر راؤ دیش پانڈے نے انھیں یہ بتلایا کہ ستارا کی ریاست ان کے آباواجداد کی تھی اور اب انھیں اس ریاست کو واپس لینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن رام راؤ نے کہا اس مقصد کو حاصل کرنے ان کے پاس نہ دولت ہے نہ فوج۔ ان کے اس جواب پر مذکورہ افراد نے کہا کہ ستارا کی ریاست انھیں واپس دلانے کے لیے وہ خود فوج تیار کریں گے، ان کی طرف سے جنگ لڑیں گے اور ہر ممکنہ مدد کریں گے۔ اس کے بعد رام راؤ سے ان افراد نے ان کی مہر مانگی جو انھوں نے دے دی۔ چند سادہ کاغذات پر مُہر لگا دی گئی اور پھر ان کاغذات پر ان افراد نے یہ لکھا دیکھا کہ انگریزوں کے علاقے پونا اور ستارا کو فتح کیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ (۵) سال پہلے وہ اور بال کشٹیا گرفتار کیے گئے تھے لیکن تین چار مہینوں کے بعد رہا کر دیے گئے۔

(۲) بھیم راؤ ولد گروجی :- بھالکی کے پٹواری گوبند راؤ اور اس سازش میں شریک اکثر افراد سے اس کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ایک دن وہ گوبند راؤ سے ملنے گیا۔ اس نے بھیم راؤ کو حلف لینے کہا اور بعد میں یہ خواہش کی کہ وہ (۲۵) افراد کو بھرتی کرائے۔ لیکن یہ نہیں بتلایا کہ آخر کس مقصد کے لیے یہ بھرتی کرائی جا رہی ہے۔ دوسرے دن پھر وہ گوبند راؤ کے گھر گیا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ وٹھوبا نے کہا کہ ملازمت کے لیے (۲۵) افراد کی ضرورت ہے۔ بھیم راؤ نے کہا اس کام کے لیے روپیوں کی ضرورت پڑے گی اور انھوں

بھالکی کے تعلقہ دار نے گرفتار

نے پچاس روپیوں کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بال کشن نے اخراجات کے لیے (۲۵) روپے بھیم راؤ کو دے دیے۔ تین مہینے بعد فتح خاں کے توسط سے اس کی ملاقات رام راؤ (جنگ بہادر) سے ہوئی۔ انھوں نے بھیم راؤ کو ایک کاغذ دیا جس پر بال کشٹیا اور وٹھوبا کی مُہریں لگی ہوئی تھیں اور یہ کہا کہ اس کاغذ پر دو افراد کے نام اور ان کے سابقہ حالات لکھے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔ اس کے بعد دو سادے کاغذات بھی دیے جس پر بال کشن کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ بال کشن نے اسی وقت اس کاغذ پر سپاہیوں کی تنخواہ کی تفصیل لکھی جو اس طرح تھی۔ گھوڑ سوار کو (۸۰) روپے، جمعدار کو (۴۰) روپے اور دکھنی سپاہیوں کو (۳۰) روپے، وہاں موجود دوسرے اشخاص کو بھی کچھ رقم دی گئی۔ اس واقعہ کے (۲۰) بیس دن بعد اس کو گرفتار کر لیا گیا۔

کیا اور انھیں بھی حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

(۳) الیشو ننا نائک وادی ولد نارائن :- وہ بھالکی کے رہنے والے اور زراعت پیشہ تھے۔ انھیں اس سازش کے اہم لیڈروں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ ان سے بھی دس افراد کو ملازمت کے لیے فراہم کرنے کی خواہش کی گئی تھی۔ بغاوت کے اہم لیڈر بال کشن اور ویر بھدریا کے بلاوے پر وہ جہانگیر علی کے ساتھ سرداری گاؤں گئے۔ پھر ان دونوں کو ادسا تعلقہ کے گاؤں کاٹ پور جانے کو کہا گیا جہاں ان کی ملاقات (۱۵)، (۲۰) مرہٹوں سے ہوئی جو غالباً اس سازش میں شریک تھے۔ ادسا کے جنگل میں وہ ایک چاوس اور نائک سے ملے۔ جنھوں نے یہ کہا کہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہے اس لیے وہ واپس چلے جائیں۔ وہاں سے واپسی کے بعد پہلی بار

گرفتاری کے بعد انھیں (۱۴) سال بامشقت قید کی سزا دی گئی۔

ان کی ملاقات رام راؤ (جنگ بہادر) سے ہوئی اور انھیں یہ بتلایا گیا کہ یہی اس سازش کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے بال کشن سے صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نہ انھیں ملازمت چاہیے اور نہ وہ بھرتی کرانے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں رام راؤ کے علاوہ وٹھوبا، گوبند راؤ اور بال کشن اس سازش کے اہم لیڈر تھے۔

(۴) جہانگیر علی ولد عبد القادر:۔ بھالکی کے رہنے والے تھے اور جنگ بہادر کے ملازم تھے۔ اس سازش کے لیڈر بال کشن اور گوبند راؤ نے جہانگیر علی سے کہا تھا کہ وہ فوج میں بھرتی کے لیے ایک سو سے زائد افراد کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ فوج میں بھرتی کرانے میں بُری طرح ناکام رہے اور کچھ دنوں بعد اورنگ آباد چلے گئے۔

بھالکی کے تعلقدار نے گرفتار کیا اور انھیں (۱۴) سال بامشقت قید کی سزا دی گئی۔

(۵)۔ ویرپدا پا ولد رام شٹی:۔ سازش میں شریک تھے

(۶)۔ بال کشن ولد بنکٹ راؤ:۔ بھالکی کے رہنے والے تھے اور پیشہ کے لحاظ سے وہ پٹیل تھے۔ وہ رام راؤ عرف جنگ بہادر کے بہت ہی قریبی اور بااعتماد ساتھی تھے۔ جنگ بہادر نے ان سے کہا تھا کہ ایک باضابطہ فوج تیار کرنی ہے اور اب تک (۸) گاؤں سے (۷۰۰) افراد کو وہ اکٹھا کر چکے ہیں جنھوں نے ان کا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے۔ جو افراد اس فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں انھیں معاوضہ دینے کے لیے مختلف مقامات سے ہزاروں روپیوں کی جو ہنڈیاں جنگ بہادر کے ذریعہ وصول ہوئی تھیں وہ قابلِ بھروسہ افراد کو دی جاتی تھیں۔ جن کے نام یہ تھے۔ وٹھوبا (Vithoba) کھن کویا باوا (Kaya Bawa)

گرفتاری کے بعد انھیں

حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

اور تلجاپور کے پٹیل تھے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ہنڈیاں آرٹن (Artan) گاؤں میں رکھی جاتی تھیں۔ بال کشن کا کہنا ہے کہ وہ جنگ بہادر کے پاس ملازمت (بھرتی) حاصل کرنے کے ارادے سے آئے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی سابقہ زندگی کے حالات لکھ کر بھیم راؤ کے حوالے کیا تھا جس پر جنگ بہادر نے اپنی مُہر لگائی تھی۔ اس سازش کے متعلق تمام ریکارڈ اور فائیل رکھنے کی ذمہ داری سردار ی (Sardari) کے ساتھاجی (Sathaji) کو دی گئی تھی اور جب جنگ بہادر سرداری میں قیام پذیر ہوئے تو ان ریکارڈ اور فائیلوں کے انچارج کشن راؤ کو بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کی ذمہ داری بھی ان ہی کی تھی۔ بال کشن کو یہ معلوم ہوا تھا کہ جنگ بہادر اور نانا راؤ (غالباً کوئی مرہٹہ پیشوا تھا) کے درمیان خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔ جنگ بہادر کے ساتھیوں کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا جو نارگاؤں (Nargaon) تعلقہ راجورہ کے باشندے اسمٰعیل کے پاس محفوظ تھا۔ جنگ بہادر کی جانب سے خطوط بھی بال کشن لکھا کرتے تھے۔ یہ خطوط کئی گاؤں کے دیس مکھوں، پٹیلوں اور پٹواریوں کو لکھے گئے تھے۔ ان خطوط میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ داردل (Vardal) کے مہتمم (Superintendent) جنگ بہادر کے بہی خواہ ہیں۔ چنانچہ ان کی ہی مدد سے وہ آشٹی سے فرار ہوئے جب حکومت کے فوجوں

نے وہاں حملہ کیا تھا۔

(۷)۔ وٹھوبا ولد کنڈاجی :۔ وہ تعلقہ تلنگ کے رہنے والے تھے اور جنگ بہادر کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھوں نے اس سازش میں نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق اس سازش میں کئی افراد شامل تھے۔ ان میں سے بعض تو شہر حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر بھی کام کر رہے تھے۔ چنانچہ حکومت کا بھی یہ خیال تھا کہ یہ سازش کافی پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس سازش کو برٹش حکومت کے خلاف ایک منظم بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ لیکن پورے مقدمے کی تفصیلات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کی یہ رائے تھی کہ اس کو ایک مقامی اور محدود سازش کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ وٹھوبا پر یہ الزام تھا کہ فوجی بھرتی میں انھوں نے ایک ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔

گرفتاری کے بعد حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

(۸)۔ بال کشٹیا عرف بال کرشنا:۔ عدالت میں ان کا بیان بھی وٹھوبا کے بیان سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ البتہ انھوں نے اس سازش کے پھیلاؤ کے بارے میں زیادہ تفصیلات بتلائیں۔ لیکن ان کے بیان میں بھی نئے مقامات کے نام نہیں بتلائے گئے۔ ان پر بھی فوج میں بھرتی کرانے کے کام کا الزام تھا۔

(۹)۔ گوبند راؤ ولد رام جی پنڈت:۔ اس سازش کے اہم لیڈروں میں ان کا نام بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ان پر اہم الزام یہ تھا کہ سازش کو تقویت پہنچانے

کے مقصد سے انھوں نے باغی فوج میں لوگوں کو بھرتی کرانے کے کام میں پوری سرگرمی سے حصّہ لیا تھا۔ وہ بھالکی تعلقہ کے کیسر جالگا (Kesar Jalga) گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ بہ اعتبار پیشہ پٹواری تھے۔ اپنے بیان میں گوبند راؤ نے کہا کہ جنگ بہادر کی گرفتاری کے بعد بھالکی کے مقامی عہدہ داروں (فضل علی اور لشونت راؤ) نے ان کی کچھ اعانت کی اور اس کے معاوضہ میں کافی رقم بٹور لی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ جنگ بہادر کے خطوط پہنچانے کا کام یلدرنی کے پٹیل ہنمنت راؤ انجام دیا کرتے تھے۔ جنگ بہادر کے روابط جالنہ اور شولا پور کے مجاہدین سے بھی تھے۔

(۱۰) - راجہ لاچ متی (Raja Lachmati) :- وہ جنگ بہادر کے برادر نسبتی تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ وہ امبا اور نوبارڈ (Novbard) میں ہنگامہ برپا کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کے علاوہ سیناپتی بالا صاحب جنگ بہادر کی سازش میں شامل ہیں۔

واسدیو بلونت پھٹکے کی بغاوت - ۱۸۷۹ :- پھٹکے مشہور مرہٹہ انقلابی لیڈر تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا مرکز ضلع گلبرگہ کے اطراف کا علاقہ تھا۔ انھیں گنڈ گاپور (Gandga Pur) اور ریاست کے اکثر کرناٹک کے علاقوں میں کافی مقبولیت اور عوام کی تائید حاصل تھی۔ ان کے سب سے اہم ساتھی اسماعیل خاں اور دوسرے روہیلے سردار تھے۔ ریاست کے باہر کے چند

علاقوں مثلاً پونا وغیرہ میں بھی ان کا اثر تھا اور بعض مرہٹہ سرداروں مثلاً ناندیڑ کے مہاراجہ ہول کر سے ان کے روابط تھے۔

۱۸۷۹ء میں پھٹکے نے گلبرگہ کے سرحدی علاقوں کا دورہ کیا تھا تاکہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ روہیلوں اور عربوں کا تعاون حاصل کرے اور انھیں اپنی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے آمادہ کریں۔ ان ہی ذرائع سے انھوں نے اپنی تحریک کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی بھی ممکنہ کوشش کی۔

جب بمبئی کے پولیس کے سپرنٹنڈنٹ میجر ڈانیال (Myor Danial) کو یہ اطلاع ملی کہ پھٹکے ریاست حیدرآباد پہنچ چکے ہیں اور وہاں ان کی انقلابی سرگرمیاں جاری ہیں تو بمبئی کے گورنر کے توسط سے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو مطلع کیا گیا اور یہ درخواست بھی کی گئی کہ میجر کو اس مہم میں ریاستی پولیس کے عہدہ داروں کا بھرپور تعاون فراہم کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹ر جولائی ۱۸۷۸ء کو برار کے انسپکٹر جنرل پولیس اور حیدرآباد کے ایک اعلا پولیس افسر کو میجر کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا تاکہ پھٹکے کو جلد سے جلد گرفتار کیا جائے اور ان کی انقلابی سرگرمیوں کا خاتمہ کیا جائے۔ واسدیو بلونت کی گرفتاری کے لیے تین ہزار روپیوں کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ حیدرآباد کے پولیس افسر عبدالحق نے گلبرگہ میں ایک سو سواروں، دو سو سپاہیوں، (۵) جمعداروں، (۸) دفعداروں اور ایک سپرنٹنڈنٹ پر مشتمل چھوٹی سی فوج نے گنور (Gunnoor) گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور مقامی مندر کے تمام برہمنوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے بیانات قلمبند کیے گئے تاکہ پھٹکے کی سرگرمیوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ یہ سرکاری کاروائی میجر ڈانیال کی سرکردگی میں انجام پائی۔ اس مندر کے ایک برہمن رنگو پنت مورلیشور (Ranga Pant Moreshwar) نے اپنے بیان میں بتلایا کہ پھٹکے یہ گاؤں چھوڑ کر میراصاحب کے ساتھ پنڈرپور کے لیے روانہ ہو گئے ہیں۔ پولیس پارٹی نے ان کا تعاقب شروع کیا اور ۲۱ر جولائی ۱۸۷۹ء کو میجر ڈانیال اور عبدالحق نے ضلع بیجاپور کے دیوان گری گاؤں کے ایک مندر میں ان کو اور ان کے ساتھی گوپال مورلیشور کو گرفتار کر لیا گیا۔ گنور گاؤں میں جب برہمنوں پر جرح کی گئی تو انھوں نے بتلایا کہ پھٹکے کو اس علاقے کے عربوں اور روہیلوں سے گہرا ربط اور مراسلت بھی تھی۔ چنانچہ روہیلوں

کے ایک سردار اسماعیل خاں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ (۵) سو افراد کو باغی فوج میں بھرتی کرایا گیا۔ اس کام کے لیے پھٹکے نے گھوڑے خریدنے کے لیے روہیلوں کو (۲) ہزار روپے بطور اڈوانس دیے اور مزید (۳) ہزار دینے کا یقین دلایا تھا۔ اس بارے میں پھٹکے اور اسماعیل خاں کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ بھی ہوا۔ جس کا مسودہ ونکو پنت (Vanku Pant) نے تیار کیا تھا۔ باغی فوج تیار کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برٹش حکمرانوں کے خلاف جنگ کی جائے اور ان کے علاقوں میں تباہی پھیلائی جائے۔ پھٹکے کی گرفتاری کے وقت ان کے (۳۵) ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔

ان گرفتاریوں کے بعد نظام سرکار نے بغاوت کے اس کیس کو عدالت کے سپرد کیا جو ریلوے جوڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور ضلع گلبرگہ کے صدر تعلقدار پر مشتمل تھی۔ عدالت نے اپنا فیصلہ ۱۷ مارچ ۱۸۸۰ء کو سنایا۔ تحقیقات کے دوران اس بات کا علم ہوا کہ ان نام نہاد ملزمین کے ساتھ انتہائی افسوس ناک اور بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ جن (۲۹) ملزمین کو جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ ان میں سے (۲۴) کو بے قصور قرار دیا گیا اور صرف (۵) کے خلاف الزامات ثابت کیے جا سکے۔ گلبرگہ جیل میں مقید اُن مجاہدین کے ساتھ جو شرمناک سلوک روا رکھا گیا اس کے خلاف "دکن ٹائمز" (Deccan Times) نامی اخبار نے مسلسل کئی دنوں تک سخت احتجاجی مضامین لکھے اور جیل کے عہدہ داروں کی مجرمانہ بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا اور حکومت سے یہ سوال کیا کہ (۲۴) بے قصور افراد کو (۸) مہینوں تک جیل میں بند رکھنے کا کیا قانونی جواز تھا۔ جن پانچ مجاہدین کو مجرم قرار دیا گیا تھا ان میں سے اسماعیل خاں کو (۷) برس کی، ایک کو اٹھارہ مہینوں کی اور ایک کو ایک برس کی سزا دی گئی۔ گڈنور گاؤں کے پٹیل اور پٹواری کو پچاس پچاس روپیوں کا جرمانہ کیا گیا۔

عدالت میں گواہوں نے جو بیانات دیے ان سے یہ علم ہوتا ہے کہ بغاوت میں اُن افراد کا کیا رول تھا۔ جس کا ذکر ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

واسدیو پھٹکے کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والوں کی فہرست :-

(۱) - اسماعیل خاں روہیلہ :- اس بغاوت میں عربوں اور خاص طور پر روہیلوں نے بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا اور اس کا سہرا اسماعیل خاں کے سر تھا جو اُن کے

رہنما تھے۔ پھٹکے کے بعد اس بغاوت کے سب سے
اہم لیڈر خاں صاحب تھے۔ وہ اتنے بااعتماد اور قابل (۷) سال کی قید کی سزا دی گئی۔
بھروسہ آدمی سمجھے جاتے تھے کہ پھٹکے نے ان کے ذمہ
باغی فوج میں بھرتی کرانے، گھوڑے خریدنے اور دوسرے
کاموں کے لیے کثیر رقم ان کے حوالے کی تھی۔ ان ہی کی
کوششوں سے پھٹکے اور روہیلوں کے سرداروں کے
درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ طے پایا تھا کہ وہ متحدہ
طور پر انگریزوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ اس فوجی
مہم کے لیے اسماعیل خاں کو روہیلوں کا جمعدار مقرر
کیا گیا تھا۔ انھوں نے دوسرے مقامات کے علاوہ
گڈنور (Gudnoor) گاؤں سے زیادہ سپاہی بھرتی
کیے تھے۔ وہ پانچ سو روہیلوں کو بھرتی کرنا چاہتے
تھے۔ یہ ان کے خلاف کافی سنگین الزامات تھے۔
انھیں گرفتار کرنے سے پہلے ان کے تمام ہتھیار
چھین لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد پولیس کی حوالات
سے خاں صاحب کو چھڑانے روہیلوں کی ایک ٹکڑی
حملہ کرنا چاہتی تھی لیکن مقامی لوگوں کے سمجھانے پر
انھوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

(۲)۔ چھترو نائک (Chatroo Naik):۔ انھوں ایک سال کی سزا دی گئی۔
نے بغاوت میں حصہ تو لیا تھا لیکن ان کے رول
کے بارے میں تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

(۳)۔ رام چندر وشوامتر:۔ یہ بھی بغاوت میں شریک ڈیڑھ سال کی سزا دی گئی۔
ضرور تھے لیکن ان کے رول اور حالات زندگی کا علم
نہ ہو سکا۔

(۴)۔ رام چندر ہنومان:۔ یہ بھی بغاوت میں شریک ضرور تھے لیکن صرف پچاس روپے کا جرمانہ

ان کے رول کا اور حالات کا علم نہ ہوسکا۔ کیا گیا۔

(۵)۔ پورا پادھون پت :۔ یہ بھی بغاوت میں شریک صرف پچاس روپے کا
ضرور تھے لیکن ان کے رول اور حالات کا علم نہ ہوسکا جرمانہ کیا گیا۔

(۶)۔ ونکو پت :۔ وہ واسدیو بلونت پھڈکے کے بہت ہی قریبی اور قابل بھروسہ ساتھی تھے۔ واسدیو اور اسماعیل خاں (روہیلے) کے درمیان سپاہیوں کی بھرتی کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کا مسودہ انھوں نے ہی تیار کیا تھا۔ اس معاہدہ پر دستخط کے وقت حسین احمد دکھنی، شہاب الدین دکھنی، اور تین روہیلے موجود تھے۔ ونکو پت اپنی انقلابی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اکثر افضل پور اور گنڈگا پور (Gandga Pur) کا دورہ کیا کرتے تھے۔ اس لیے ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ شائد افضل پور کے رہنے والے تھے۔ اور کروڑ گیری کے محکمہ میں ملازم تھے۔

(۷)۔ رنگناتھ ایشور بھٹ :۔ عدالت میں ان کے بیان کے مطابق واسدیو بلونت سے ان کی اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ جب وہ پونا گئے تو وہ وہاں واسدیو بلونت کے ساتھ رہے جہاں انھوں نے جمع کردہ ہتھیار بھی دیکھے۔ واسدیو بلونت کبھی کبھار ایشور بھٹ کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ہتھیاروں کی خریدی کے لیے چاندی کی سلاخیں ایک مقامی دیول کے پجاری راؤجی بھٹ کے پاس رکھایا کرتے تھے۔ اپنے قیام کے دوران انھوں نے ایشور بھٹ کو بندوق چلانا بھی سکھایا تھا۔ ایشور بھٹ کے بیان کے مطابق واسدیو سپاہیوں کی بھرتی کے لیے

گنڈ گاپور (Gandgapur) تا رائن کھیڑ، النَد اور ضرورت پڑنے پر حیدرآباد بھی جایا کرتے تھے۔ واسدیو کی تلاش میں جب پولیس نے گاؤں کا گھیرا ڈال دیا تو ایشور بھٹ کی والدہ نے تمام متعلقہ کاغذات کو جلا دیا۔ اس کے بعد ایشور بھٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ملازم سرکار ہونے کے باوجود ان سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا۔

(۸)۔ راموشی نائک :۔ Ramoshi Naik وہ واسدیو بلونت کے ساتھیوں میں تھے اسماعیل خاں کی گرفتاری کے بعد انھیں بھی گرفتار کر کے جیل میں رکھا گیا۔

(۹)۔ جانوجی راؤ :۔ انھوں نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واسدیو بلونت کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ سپاہیوں کی بھرتی کے تعلق سے اسماعیل خاں اور واسدیو بلونت کے درمیان جو گفتگو ہوئی اور جو معاہدہ طے پایا اس وقت وہ بھی موجود تھے اور ان تمام امور سے بخوبی واقف تھے۔

رامپا اور ریکا پلی میں بغاوتیں ۱۸۷۹ء-۱۸۸۰ء :۔ نظام آباد اور عادل آباد کی بغاوتوں کے علاوہ تلنگانہ کے علاقہ میں ان دو بغاوتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ مقامی زرعی مسائل ان بغاوتوں کے پیچھے کارفرما تھے۔ یہ بغاوتیں ریاست کے سرحدی علاقوں میں ہوئیں۔

پہلی بغاوت کا مرکز رامپا نامی گاؤں تھا جو ضلع گوداوری کا ایک حصہ تھا اور دوسری بغاوت ریکاپلی میں ہوئی جو تعلقہ بھدراچلم میں شامل تھا۔ گویا بغاوتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ لیکن ان کے اسباب ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ان بغاوتوں کو ستمبر ۱۸۸۰ء میں کچل دیا گیا۔ رامپا بغاوت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو ختم کرنے مدراس اور حیدرآباد کی حکومتوں کو مشترکہ طور پر فوجی کاروائی کرنی پڑی۔ اس بغاوت کے اسباب وعلل کا پتہ لگانے کے لیے انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کی ان زرعی تبدیلیوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ جو کمپنی سرکار کی جانب سے (۱۸۰۲—۱۸۰۳ء) میں دوامی بندوبست کے نفاذ کے ساتھ شروع ہوئیں۔ لیکن رامپا کے علاقہ کو اس کے دائرہ عمل میں شریک نہیں کیا گیا۔ اسی بنا پر یہاں کے کسانوں میں بے چینی اور ہل چل شروع ہوئی۔ اسی دوران رام بھوپتی دیوا (Ram Bhupati Deva) نامی منصب دار پہاڑی علاقوں سے اپنی فوج لے کر نیچے اترا اور میدانی علاقوں کے کئی گاؤں پر جبراً قبضہ کرلیا۔ لیکن اس کو ان گاؤں سے جلد نکال دیا گیا اور اسے مجبوراً کمپنی سرکار کے اقتدار کو تسلیم کرنا پڑا۔

دس سال بعد (۱۸۱۳ء) اس علاقے میں بھی دوامی بندوبست پر عمل شروع ہوا اور کچھ سالوں بعد رام بھوپتی دیوا (Ram Bhupati Deva) اور کمپنی سرکار کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے اس سے حاصل کیے ہوئے پہاڑی اور میدانی علاقوں کو اس شرط پر واپس کیے گئے کہ وہ ان علاقوں پر امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری قبول کرے۔ لیکن اس کا (۱۸۳۵) میں انتقال ہوگیا۔ اس کی ایک لڑکی اور ایک نابالغ لڑکا سری مدوہوتی رام بھوپتی دیو (Sri Madhuvati Ram Bhupati Deva) تھا۔ لڑکی زمنیات کی جائز وارث قرار پائی لیکن اس نے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی عصمت پر شبہ کیا جانے لگا۔ چنانچہ اسے اور اس کے بھائی کو۔ جن کے آپسی تعلقات کشیدہ تھے۔ گاؤں سے نکال دیا گیا اور زمنیات کورٹ آف وارڈز کی نگرانی میں دے دی گئیں۔ ۱۸۴۰ء میں حکومت کے اس اقدام کے خلاف گڑبڑ شروع ہوئی جس کو فرو کرنے پولیس روانہ کی گئی لیکن نظم وضبط قائم نہ ہوسکا اور (۵) سال بعد یعنی ۱۸۴۵ء میں بڑے پیمانے پر ہل چل

پھیل گئی اور زمیندارنی (لڑکی) کو اپنے ناجائز بھائی کے حق میں پوری جائداد سے دست بردار ہونا پڑا۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ مقامی منصب دار اور مقطعہ دار کے درمیان حقوق کے تعلق سے طویل بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار منصب دار کے قانونی حق کو تسلیم کیا گیا۔ ان زرعی مسائل پر منصب داروں اور مقطعہ داروں کے درمیان جو کشمکش چل رہی تھی اس سے کسان بھی متاثر ہو رہے تھے اور ان کے آپسی جھگڑوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ان حالات میں آبکاری کے نئے قواعد و ضوابط شروع کیے گئے جن کی رو سے خانگی استعمال کے لیے سیندھی نکالنے پر پابندی لگا دی گئی اور سیندھی کی آمدنی کو گتہ داروں کے حوالے کر دی گئی اور ان گتہ داروں نے یہ مطالبہ کیا کہ اگر مقطعہ دار سیندھی تاسنا چاہیں تو انھیں اس کی فیس (Chiguru Panna) ادا کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ منصب داروں نے بھی ایک اور ٹیکس (Modalu Panna)لگانے کی دھمکی دی۔ ان نئی پابندیوں اور ٹیکسوں نے عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جو رامپا بغاوت کے پھوٹ پڑنے کی ایک اہم اور فوری وجہ ثابت ہوئی۔ سیندھی پر لگائی گئی پابندیوں کی عمل آوری کے لیے پولیس نے عوام پر جو زیادتیاں شروع کیں اس سے بغاوت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ عوام نے ان نئے ٹیکسوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ اگر انھیں اسی طرح تنگ کیا جاتا رہا تو وہ پولیس کو ختم کر دیں گے یا پھر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیں گے۔ ایک اور مسئلہ جو مقامی عوام کے لیے پریشان کن تھا وہ یہ کہ میدانی علاقے کے تاجروں نے پہاڑی علاقوں کے پچھڑے ہوئے قبائل کی معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھاری سود پر قرضے دیے اور ان کی ادائی کے تعلق سے غیر واجبی اور یک طرفہ معاہدہ طے کر لیے اور الٹے قرض دار عوام پر یہ الزام لگا کہ وہ اپنے کیے ہوئے معاہدوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں ان کے خلاف عدالت میں مقدمے دائر کر دیے گئے اور کچھ مثالیں ایسی بھی ہوئیں کہ صرف (۵) روپے کے قرض کے بدلے ان کے جانوروں اور کھیتوں کی پیداوار ضبط کر لی گئی۔ قبائلی عوام یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ قانون کی اس طرح غلط اور یک طرفہ عمل آوری کے اصل ذمہ دار حکومت اور اس کے کارندے ہیں۔ ان افسوس ناک حالات میں اپنے مسائل کو حل کرنے کا ان کے سامنے ایک ہی راستہ رہ

گیا تھا اور وہ یہ کہ حکومت اور ان کے کارندوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی جائے۔ چنانچہ رامپا کے پولیس انسپکٹر نے ۹ مارچ ۱۸۷۹ء کو تعلقدار کو یہ رپورٹ بھیجی کہ وہاں کے حالات انتہائی دھماکو ہیں اور کسی وقت بھی بغاوت پھوٹ پڑ سکتی ہے۔ تعلقدار فوراً بھدراچلم پہنچ گیا اور مہتم پولیس کی سرکردگی میں پولیس کی جمعیت روانہ کی گئی۔ دوسرے دن گوکاورم (Goka Varam) گاؤں میں باغیوں کے ایک مسلح جتھے کے دو پولیس کے جوانوں کو روک لیا لیکن یہ افواہ پھیلائی گئی کہ باغیوں نے پولیس کے سپاہیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔

۱۳ مارچ کو پہاڑی قبائل کی ایک بڑی ٹکڑی چوڈاورم گاؤں (Choda Varam) کے پاس جمع ہوئی تاکہ اپنی شکایات دوم تعلقدار کے پاس پیش کی جائیں۔ ابتدا میں تو وہ اپنی بات چیت سے بظاہر مطمئن نظر آئے لیکن فوراً بعد شاید یہ سوچ کر کہ حکومت عہدہ داروں کی بات کا کیا بھروسہ انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پولیس کے کیمپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس گولی باری سے کچھ نقصان تو نہیں ہوا لیکن پولیس انسپکٹر اپنے ۳۰ جوانوں اور ۳۲ رائفلوں کے ساتھ محصور ہو گیا تاہم انھوں نے فوجی کمک آنے تک کسی طرح گاؤں پر قبضہ باقی رکھا اور کچھ ہی دنوں بعد مقامی انفنٹری کے چار سو افسروں اور سپاہیوں کا ایک طاقتور دستہ گاؤں پہنچ گیا اور پیش قدمی شروع کر دی۔ اسی دوران باغیوں نے جن دو سپاہیوں کو گرفتار کیا تھا۔ ان کی ماتا کی دیول پر پوری عقیدت کے ساتھ قربانی چڑھا دی اور اپنے اس ارادے کا اعلان کر دیا کہ اب ان کے سامنے بغاوت کے سوائے کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بغاوت کی آگ سارے رامپا میں پھیل گئی جس کا مجموعی رقبہ ۵ ہزار مربع میل تھا، جو گھنے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقہ میں فوجوں کو نقل و حرکت میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے برخلاف باغیوں کے لیے کوئی دشواری نہ تھی کیونکہ وہ ان پہاڑی علاقوں کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔ باغیوں نے سرکاری فوج سے راست مقابلہ کرنے سے ہمیشہ گریز کیا اور گوریلا لڑائی کی حکمت عملی اختیار کی۔ وہ دور دراز کے پولیس ٹھکانوں پر حملہ کئے اور ان گاؤں کو تباہ و برباد کئے جو حکومت وقت کے ساتھ تھے۔

اس بغاوت کو ختم کرنے ۱۸۷۹ء کے اواخر میں حکومت نے فوجیں روانہ کیں جس میں اطراف کے اضلاع کے کئی سو پولیس سپاہی، مدراس انفنٹری کے چھ(۶) رجمنٹ سرنگ لگانے والے انجنیروں (پہاڑی علاقے کی مناسبت سے) کی دو کمپنیاں اور حیدرآباد کنٹنجنٹ فوج کے سواروں کے رسالہ کا ایک اسکواڈران اور انفنٹری کا ایک حصہ روانہ کیا گیا۔ حکام کو یہ ڈر تھا کہ بغاوت کی یہ لہر کہیں ریکاپلی اور ڈچارتی (Dutcharti) کے علاقوں اور پولاورم (Pola Varam) ڈیویژن (Division) کے قبائلی اور پہاڑی حصوں میں نہ پھیل جائے۔ اس کا سدّباب کرنے چاروں طرف سے فوجیں روانہ کی گئیں اور رامپا کے شمالی اور مشرقی سرحدوں پر فوجیں بٹھادی گئیں، گوداوری اور ساوری (Saveri) ندیوں کے کناروں پر ملٹری پوسٹ قائم کردیے گئے۔

رامپا بغاوت کے چار اہم لیڈر چندریا، یس۔ جے پلی کنٹا سامبیا (Pulicanta Sambayya) اور بڈورو (Bodur Iuru) گاؤں کے امبل ریڈی (Ambal Reddy) تھے۔

مذکورہ بالا فوجی اقدامات کے علاوہ رامپا بغاوت کے اسباب و علل کا پتہ لگانے جولائی ۱۸۷۹ء میں ریونیو بورڈ کے ایک رکن مسٹر سلیون (Sullivan) کو مقرر کیا گیا۔ انھوں نے ضلع کا تفصیلی دورہ کے بعد حسب ذیل تجاویز پیش کیں تاکہ آئندہ ایسی بغاوتوں کا سدّباب ہو سکے۔ ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ منصب داری کو ختم کیا جائے اور مقطعہ داروں کو یہ ہدایت دی جائے کہ آئندہ وہ حکومت سے راست تعلق رکھیں۔ ان تجاویز کی وجہ سے بغاوت میں وہ پہلی سی شدت باقی نہیں رہی اور اس دوران تمام اہم باغی لیڈروں کو یا تو گرفتار کرلیا گیا یا پھر انھیں مار ڈالا گیا اور جو لیڈر بچ گئے تھے انھیں گول گڈا (Gold gonda) اور جے پور (Jey pore) کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود بغاوت کی چنگاری پوری طرح ختم نہ کی جاسکی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں تامس دورا (Tammas Dora) نے ضلع وزیگاپٹنم میں سورش پھیلادی جو کم زور اور غیر منظم تھی۔ غرض یہ کہ رامپا بغاوت ایک سال تک جاری رہی اور نومبر ۱۸۸۰ء تک اس علاقہ میں بڑی حد تک حالات معمول پر آگئے۔ رامپا بغاوت

کے گہرے اثرات ریاست پر زیادہ نہیں پڑے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان باغیوں کا ربط کھم کے بعض افراد سے تھا اور مدھیرہ کے ایک گاؤں میں باغیوں نے اپنا پڑاو ڈالا تھا۔

رامپا بغاوت میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست:۔

(۱)۔ چندریا:۔ وہ بغاوت کے بہت اہم اور جانباز لیڈر تھے۔ انھوں نے یلاورم (Yellavaram) ڈیویژن میں مئی کے مہینے میں بڑے پیمانے پر ہل چل مچائی تھی اور اڈاتی گلیہ (Addati Gela) پولیس تھانہ کو جلا دیا اور پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ نکلے اور اسی مقام پر ایک یورپین پولیس افسر کی پارٹی کو کچھ دنوں کے لیے مقید رکھا۔ ان کی گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیوں کا انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ فروری ۱۸۸۰ء کو انھیں قتل کر دیا گیا۔

(۲)۔ سردار جنگم پولی کنٹا سامبھیا (Sirdar Jangam Pulikunta Sambayya):۔ ان کا شمار باغیوں کے چار اہم لیڈروں میں ہوتا تھا۔ انھیں ۲۹ اپریل ۱۸۷۹ء کو گرفتار کر لیا گیا۔

(۳)۔ تامن درا:۔ (Tamman Dora) بغاوت کے ایک اہم لیڈر تھے۔ ان کا کارنامہ یہ تھا کہ جب بغاوت ہونے کو تھی تو وہ ۱۷ اکتوبر میں ضلع وزیگاپٹنم پر حملہ کیا اور وہاں شورش پیدا کر دی۔ انھیں نومبر ۱۸۷۹ء میں گرفتار کیا گیا۔

(۴)۔ بدورو امبل ریڈی:۔ بغاوت کے چار اہم لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے ریکاپلی عوام کے تعاون سے اس علاقہ کے وڈی گوڑم پولیس اسٹیشن پر حملہ کیا تھا۔

ریکاپلی کی بغاوت۔ ۱۸۷۹ء:۔ ریکاپلی اور رامپا کی بغاوتیں ایک ہی سال (۱۸۷۹ء) میں ہوئیں اور ایک دوسرے سے

جوڑی ہوئی تھیں۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رامپا بغاوت کے زیر اثر ریکاپلی میں بغاوت شروع ہوئی اور رامپا بغاوت میں حصہ لینے والے بعض لیڈروں نے ریکاپلی بغاوت کی بھی رہنمائی کی تھی۔ اس کے باوجود ریکاپلی بغاوت کے پیچھے کارفرما اسباب بالکل مختلف تھے۔ صوبہ متحدہ (برٹش زیر انتظام) کے علاقہ میں پنڈو (Pondu) کی کاشت وسیع پیمانے پر اور بلا روک ٹوک ہوا کرتی تھی اور ایک کلہاڑی مار کر جس قدر پودا کاٹا جاسکتا تھا اس پر صرف چار آنے ٹیکس لگایا جاتا تھا۔ مدراس کی حکومت نے اس ٹیکس کو تین گنا بڑھا دیا اور کاشت کاروں کو بعض حصوں پر کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ اس کے علاوہ بعض مخصوص جھاڑوں کو جو محفوظ مقامات پر لگائے جاتے تھے ان کو کاٹنے پر مزید ٹیکس لگا دیا گیا۔ ان نئے ٹیکسوں اور پابندیوں نے عوام میں بے چینی پیدا کر دی۔ اس کو بنیاد بنا کر رامپا کے باغی لیڈروں نے ریکاپلی کے عوام کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔

۱۰ر جولائی ۱۸۷۹ء کو رامپا بغاوت ۔ لیڈر امبل ریڈی اور ان کے ساتھیوں نے ریکاپلی کے عوام کو اپنے ساتھ لے کر وڈی گوڈم (Vaddi Gudem) پولیس تھانہ پر حملہ کر دیا لیکن انھیں پیچھے ڈھکیل دیا گیا اور مسلح پولیس کے ایک دستہ کو ان کا تعاقب کرنے راج مندری سے اسٹیم کی ایک کشتی روانہ کی گئی۔ چونکہ کشتی کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا اس لیے باغیوں نے اس پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد (۲۵) سپاہیوں کا ایک اور دستہ روانہ کیا گیا، گوداوری اور ساوری ندیوں پر اسٹیم کشتیوں کی طلایہ گردی شروع کر دی گئی اور ان ندیوں کے کناروں پر پولیس کی چوکیاں قائم کر دی گئیں۔ ان اقدامات کے نتیجہ کے طور پر حالات معمول پر آگئے اور عوام اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ریکاپلی میں تامن درا نے ایک بار پھر ہل چل مچا دی لیکن بہت جلد حالات پر قابو پا لیا گیا۔

جب مذکورہ بالا بغاوتوں کی اطلاع رزیڈنٹ نے سر سالار جنگ کو دی تو انھوں نے ان باغیوں (۱) رام ریڈی (۲) بی امل ریڈی (۳) کارو تامن درا (Karu Tamman Dora) (۴) کاکورو ریڈی (Kakuru Reddy) (۵) بندیلی درا

(Bundali Dora) کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے اور ہر ایک باغی کی گرفتاری کے لیے دو سو روپیوں کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ ۳۰ اپریل ۱۸۷۹ء کو ایک اور اعلان کے ذریعہ کارو تامن درا (Karu Tamman Dora) کی گرفتاری کے لیے (۵۰۰) روپیوں کا انعام مقرر کیا گیا۔

رامپا اور ریکاپلی کی بغاوتوں نے حکومت مدراس اور نظام سرکار کو کافی پریشان کر رکھا تھا جس کا اندازہ اس مراسلت سے ہوتا ہے جو اُن دونوں حکومتوں کے درمیان ہوئیں اور سر سالار جنگ نے کھمم اور نلگنڈہ کے تعلقداروں کو جو احکامات جاری کیے تھے کھمم کے تعلقدار کو یہ لکھا گیا تھا کہ حکومت کو یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ حیدرآباد کی سرحد رامپا کی ایک پولیس چوکی پر عربوں نے حملہ کر دیا ہے۔ مدراس کے گورنر کے مطابق رامپا کے باغی ریاست کے سرحدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لیے مقامی مہتمم پولیس کو حکم دیا جائے کہ فوراً ریاست کے سرحدوں پر ایسے انتظامات کیے جائیں کہ آمدورفت کے ذرائع متاثر نہ ہوں، باغیوں کو گرفتار کیا جائے اور انھیں فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ ان ہدایات کے روشنی میں کھمم کے تعلقدار نے اپنے ضلع میں باغیوں کی سرگرمیوں کے تعلق سے وقفہ وقفہ سے جو رپورٹیں روانہ کی تھیں انھیں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے تاکہ ان سے اس ضلع میں باغیوں کی سرگرمیوں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

۱۔ تعلقہ پالونچہ کے پولیس آفیسر نے رپورٹ دی ہے کہ کچھ دنوں قبل باغیوں کا ایک جتھہ رامپا میں جمع ہوا، ایک پولیس چوکی پر حملہ کیا گیا اور پولیس کے چند سپاہی مارے گئے۔

۲۔ تعلقدار کی ایک رپورٹ کے مطابق کوٹاوار (Kotar War) گاؤں میں آبکاری کی دوکان پر حملہ کیا گیا اور پولیس کے چند جوانوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ چنانچہ اس کی تدارک کے لیے نائب کمشنر پولیس کی سرکردگی میں (۴۰) فوجی سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کیا گیا، باغیوں اور پولیس کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ اور نائب کمشنر بُری طرح زخمی ہوا اور کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

۳۔ ضلع کھمم کے ایک گاؤں وینکاپیٹھ (Venka pet) کو باغیوں نے جلا دیا۔

۴۔ فوج نے سنگناپلی کا محاصرہ کیا اور (۱۷) افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔

۵۔ وڈی گوڑم (Waddi gudem) گاؤں کو نیست و نابود کردیا گیا۔

باغیوں کا یہ بھی منصوبہ تھا کہ بھدراچلم کو بھی لوٹا جائے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ریاستی عوام سے ربط بھی پیدا کیا۔ گوداوری ندی کے قریب باغیوں اور پولیس میں جھڑپ ہوئی۔ تعلقہ مدھیرہ کے ایک گاؤں کاکی پلی (Kake pully) کو باغیوں نے گھیر لیا۔ ان بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کیپٹن فالن (Capt. Fallan) کی سرکردگی میں فوج روانہ کی گئی جس نے مختلف مقامات پر باغیوں پر حملہ کیا اور ریاست کے مختلف حصوں میں (۱۲) افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔

بغاوت کا یہ شعلہ صرف ضلع کھمم تک محدود نہ تھا بلکہ نلگنڈہ کے تعلقداری رپورٹ کے بموجب دیورکنڈہ (Devar konda) اور دیولپلی (Devala Pully) کی پہاڑیوں میں باغیوں کی بڑی تعداد جمع ہوئی اور انھوں نے چالیس گاؤں کو تباہ و برباد کردیا۔ مختصر یہ کہ حکومت مدراس اور حیدرآباد کی مسلح پولیس کی مشترکہ کوششوں اور حملوں کے بعد ضلع کھمم اور نلگنڈہ کے عوام کی بغاوتوں کو فرو کیا جا سکا۔

ریکاپلی کی بغاوت میں حصہ لینے والے اور مدد کرنے والے اصحاب کی فہرست:-

(۱)۔ رام ریڈی :- ریکاپلی بغاوت کے اہم لیڈر تھے سرسالار جنگ کی ایما پر اُن کی گرفتاری کے احکام جاری کیے گئے اور ان کی گرفتاری کے لیے دو سو روپیوں کے انعام کا بھی اعلان کیا تھا۔

(۲)۔ کاکورو ریڈی :- 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۳)۔ بندیلی درا :- 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴)۔ کاروتا من درا :- 〃 〃 〃 ان کی گرفتاری کے لیے پانچ سو روپیوں کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔

چوتھا دور ـــــ ۱۸۸۰ ـــــ ۱۹۰۰ء

بیس[۲۰] سال کے اس مختصر دور میں بڑے پیمانے پر کوئی سیاسی جدوجہد اور بغاوتیں نہیں ہوئیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور بڑی حد تک امن وامان کا دور تھا جس کے دوران اہم سیاسی اور سماجی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ تعلیمی ترقی کے مزید مواقع فراہم ہوئے، بڑے پیمانے پر صحافتی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور کئی انگریزی، فارسی، اُردو، تلگو اور مرہٹی رسائل شائع ہونا شروع ہوئے۔ میر لائق علی خاں، سالار جنگ دوم کے دور (۱۸۸۴ - ۱۸۸۷ء) میں ریاستی نظم ونسق کی زبان فارسی کے بجائے اُردو، بنائی گئی۔ اس زمانہ میں ذرائع آمدورفت میں زیادہ سہولتیں پیدا کرنے کے خیال سے سکندرآباد تا ورنگل ریلوے لائن بنائی گئی اور پھر ۱۸۸۸ء میں اس لائن کو ایک طرف ڈورناکل اور یلندو (جہاں کوئلہ کے کھان ہیں) تک اور دوسری طرف بجواڑہ تک وسعت دی گئی۔ اس طرح ریاست کے لیے صنعتی ترقی اور تجارت کے دروازے کھل گئے۔

۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے ایک سال بعد اور اس دور کی شروعات کے کچھ عرصہ پہلے ایک اور دُوررس سیاسی تبدیلی ہوئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ایک اہم اعلان نامہ جاری کیا جس میں برٹش سرکار اور ہندوستان کے نئے تعلقات کی وضاحت کی گئی۔ جس کی رو سے ہندوستان کو برٹش تخت وتاج کا ایک حصہ بنا دیا گیا اور رسوائے زمانہ الیسٹ انڈیا کمپنی کے راج کو ختم کر دیا گیا۔

۱۸۷۷ء میں ملکہ انگلستان نے ایک اور اعلان نامہ جاری کر کے اپنے موجودہ خطابات کے ساتھ "ملکہ ہند" کے خطاب کا اضافہ کیا اور اس طرح ہندوستان پر اپنے اقتدار اعلا کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۸۴ء میں وائسرائے ہند لارڈ رپن کے ہاتھوں میر محبوب علی خاں

آصف جاہ ششم کی مسند نشینی کی رسم انجام پائی۔

چاندہ ریلوے اسکیم کے خلاف احتجاج :-

اس دور کے ابتدا میں چاندہ ریلوے اسکیم کا نزاعی مسئلہ ابھر کر آیا۔ نظام گیارنٹیڈ (Gu ranteed) اسٹیٹ ریلوے یہ چاہتی تھی کہ ریلوے لائن کو ایک طرف کو ورنگل سے بجواڑہ تک توسیع دی جائے اور دوسری طرف چاندہ تک، اس لیے اس اسکیم کو عام طور پر" چاندہ ریلوے پراجکٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تعلق سے حکومت یہ چاہتی تھی کہ ریلوے لائن کی توسیع کے لیے جس قدر سرمائے کی ضرورت پڑے اس کی فراہمی لندن میں قرضے اکٹھا کر کے کی جائے۔ لیکن ریاست کے بعض اعلا عہدہ دار اور عوام کسی بیرونی ملک سے اس مقصد کے لیے قرضہ حاصل کرنے کے سخت خلاف تھے۔ اس مسئلہ پر احتجاج منظم کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر ڈاکٹر گھور ناتھ چٹوپادھیا (سروجنی نائیڈو کے والد) تھے۔ ان کے صدارت میں ایک شاندار احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا اور یہ قرارداد منظور کی گئی کہ حکومت بیرونی ملک سے قرضہ حاصل نہ کرے بلکہ سرمایہ کی فراہمی مقامی ذرائع سے کی جائے۔ لیکن حکومت نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ان قومی سرگرمیوں کو برطانوی حکومت کی مخالفت کا رنگ دیا گیا اور ۱۹ مئی ۱۸۸۳ء میں انھیں ملازمت سے علاحدہ کر کے شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نئی ریلوے لائن کی وجہ سے سفر میں سہولتیں پیدا ہوئیں، صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی اور تجارت میں اضافہ ہوا۔

۱۸۸۶ء میں ہندوستان پر روسی حملہ کے خطرہ کا بہانہ بنا کر وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے نظام کو مجبور کیا کہ وہ سواروں کا ایک فوجی دستہ تیار کریں، جس کا نام امپریل سروس ٹروپس ہوگا اور جس کے جملہ اخراجات نظام سرکار کو برداشت کرنے ہوں گے۔ حکومت ہند کی اس تجویز سے نواب وقار الملک اور دوسرے امرا نے بھی اختلاف کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سب سی ڈیری اور کنٹنجنٹ نامی دو علاحدہ فوجوں کی موجودگی

میں ایک تیسری نئی فوج غیر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ خدشہ بھی تھا کہ تیسری فوج کے خرچ کے ضمن میں نہ معلوم ریاست کا کوئی اور علاقہ انگریز سرکار کے حوالے کرنا پڑے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام :- اس دور کا سب سے اہم اور تاریخ ساز واقعہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا تھا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر حیدرآباد میں بھی بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے پر اس کے گہرے اثرات پڑے۔ اس وقت حیدرآباد کا نظم و نسق اور حکومت پر مہدی محسن الملک، عماد الملک بلگرامی، وقار الملک اور مہدی حسن فتح نواز جنگ جیسے عہدہ دار چھائے ہوئے تھے جو سرسید احمد کے سیاسی اور سماجی نظریات کے حامی اور انڈین نیشنل کانگریس کے سخت خلاف تھے۔ کانگریس کے خلاف "جہاد" میں سب سے آگے محسن الملک تھے۔ لیکن حیدرآباد کے عوام کانگریس کے قیام اور نئی پیدا شدہ سیاسی بیداری کی تائید میں تھے۔ بیداری کی اس لہر کو ایک تحریک کا روپ دینے والوں میں سے سب سے آگے ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا اور ان کے دیرینہ رفیق کار ملا عبدالقیوم تھے۔ وہ نہ صرف کانگریس میں شریک ہوئے بلکہ انھوں نے قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم "انجمن اخوان الصفا" کی بنیاد رکھی۔ اس قومی دھارے میں شامل ہونے والوں میں رام چندر پلے، محب حسین (حیدرآباد میں سماجی اصلاح کے پہلے علم بردار) اور مشہور قوم پرست اخبار "ہزار داستان" کے اڈیٹر سید عقیل قابل ذکر ہیں۔ اس کے برخلاف نظام سرکار نے کانگریس کے قیام اور قومی بیداری کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا، اس کے باوجود حیدرآباد اور سکندرآباد کے تعلیم یافتہ طبقہ نے کانگریس کی حمایت میں ۱۸۸۸ء میں ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کی جانب سے سکندرآباد اور چادر گھاٹ (جو اس وقت رزیڈنسی کے علاقہ میں شامل تھا) میں کانگریس کی تائید میں کئی شاندار جلسے منعقد کیے گئے۔ ان جلسوں کا اہتمام کرنے اور تقاریر کرنے والوں میں قابل ذکر حضرات یہ تھے۔ سی۔ رام چندر پلے، ایڈل جی سہراب جی شینائی، حاجی سجن لعل، گنگا بھیشم، مراڈوروی بد، سی۔ رنگیا، غلام دستگیر صاحب، وینو گوپال پلے، اسماعیل صاحب، سبد لو میاں، حسین خاں صاحب، حکیم سجن صاحب، حاجی شیخ آدم، حاجی موسیٰ، یم۔ واہنا اور ڈاکٹر نبی خاں صاحب وغیرہ۔ مقامی انگریزی، اردو، تلگو اور مرہٹی اخبارول

نے بھی اس تحریک کی پر زور حمایت کی۔ حتیٰ کہ بعض عیسائیوں مثلاً چادر گھاٹ میتھوڈسٹ چرچ (Methodist Episcopal Church Chaderghat) کے ریورنڈ مسٹر گلڈر نے بھی کانگریس کی تائید کی۔ قومی تحریک جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی نوجوانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہوتی گئی۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر حیدرآباد اور سکندرآباد میں کئی تعلیمی اور سماجی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں نوجوانوں کی بھلائی کے لیے ایک سوسائٹی (The young men improvement society) چادر گھاٹ میں بنائی گئی جس کی جانب سے ایک دارالمطالعہ اور کتب خانہ چلایا جاتا تھا۔ اور سرآوردہ اصحاب کی تقاریر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سکندرآباد میں البرٹ ریڈنگ روم اور شہر حیدرآباد میں مال والا سبھا اور چادر گھاٹ میں ہندو سوشیل کلب کا قیام عمل میں آیا۔ موخرالذکر اداروں کے روح رواں راجہ مرلی منوہر بہادر رہے۔ مال والا سبھا کے قیام کا بنیادی مقصد تعلیم کی اہمیت پر زور دینا، علم کی روشنی پھیلانا اور تعصب اور توہم پرستی کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔ ان ہی دنوں مسٹر راما سوامی ایر نے دسمبر ۱۸۸۲ء میں تھیوسوفیکل سوسائٹی چادر گھاٹ میں شروع کی اور جنوری ۱۹۰۶ء میں ہنومان ٹیکری پر تھیوسوفیکل سوسائٹی ہال تعمیر کیا گیا۔ اس سوسائٹی کی جانب سے مذہبی اور ثقافتی مسائل پر تقاریر کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوتا تھا۔

صحافتی سرگرمیاں :-[1] جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے ساتھ ساتھ صحافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس زمانہ میں کئی انگریزی، فارسی، اُردو، اور مرہٹی رسائل اور اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔

انگریزی رسائل :- حیدرآباد ٹیلی گراف (۱۸۸۲)، دی دکن اسٹانڈرڈ (۱۸۸۹ء) دی دکن ٹائمز (۱۸۹۱ء)، دی حیدرآباد ریکارڈ (۱۸۹۱ء) دی دکن بجٹ (۱۸۹۷)، دی دکن میل (۱۸۹۸)، دی دکن پنچ، اور حیدرآباد کرانیکل (۱۸۹۹ء)

---

1. The Hydrabad State Committee, The freedom struggle in Hydrabad, Vol. III, (1865 – 1920) PP 11 – 13

اردو رسائل :- شوکت الاسلام، آصفی، مسرور القلوب، معلم شفیق، ہزار داستان، سید الاخبار، مشیر دکن، علم و عمل، معلم نسواں وغیرہ۔

دوسرے قابل ذکر رسائل :- گلبرگہ سماچار، نظام ویابھو (Vaibhav)، بھاگیہیا (Bhageshya)، نگر، سری بھاگیہ (Sri Bhageshya)، وجے (مرہٹی)، چمپاوتی (مرہٹی)، دنیا ورتمان (Dina Vartaman) تلگو میں۔

یہاں صرف ان ہی رسائل اور اخبارات کا ذکر کیا گیا ہے جو کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) کے بعد شائع ہونا شروع ہوئے۔

حیدرآباد میں جب بھی صحافت کے فروغ کا ذکر آتا ہے تو جمال الدین افغانی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حیدرآباد میں ان کے تین سالہ (۱۸۷۹-۱۸۸۲ء) قیام کے دوران انھوں نے اردو صحافت کو پروان چڑھانے کی ممکنہ سعی کی اور ان کی ہمت افزائی کی بدولت مولوی محب حسین نے ایک اعلیٰ معیاری رسالہ "معلم شفیق" نکالنا شروع کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ افغانی نے کئی قومی رہنماؤں اور صحافیوں کا حوصلہ بڑھایا اور وہ خود قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اپنی اعلیٰ نگارشات سے حیدرآباد کے عوام کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔

یہاں اس بات کا ذکر باعث دلچسپی ہوگا کہ ۱۹۰۱ء تک جملہ (۱۴) اخبارات اور رسائل شائع ہوتے تھے۔ ان میں سے (۱۲) اردو، اور (۲) مرہٹی کے تھے۔ ان میں روزناموں کی تعداد سات تھی باقی ہفتہ وار اور ماہ نامے تھے (انگریزی کے علاوہ) اس کے برخلاف ۱۹۰۰ میں مدراس پریسیڈنسی سے (۱۶۱) بمبئی پریسیڈنسی سے (۱۷۸) اور بنگال سے ۱۹۰۵ء میں (۱۱۱) رسائل شائع ہوا کرتے تھے۔

یہ ایک خوش آئند بات تھی کہ جتنے رسائل اور اخبارات اس زمانے میں شائع ہوئے اس کی اکثریت ابھرتی ہوئی قومی تحریک اور کانگریس کے طرفدار تھے، اور انگریز سامراجیوں اور ان کی پٹھو نظام سرکار کی جمہوریت دشمن پالیسیوں پر کڑی تنقید کیا کرتے تھے۔ صحافت کے اس جمہوریت اور حریت پسند رویہ کی وجہ سے حیدرآباد کے نوجوانوں میں سامراج دشمن، قوم پرستی اور آزادی کے جذبات تیزی سے ابھر رہے تھے۔ اس صورت حال کو حکومت حیدرآباد قطعی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ اس نے

صحافت پر پابندیاں لگانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۹۱ء میں ہوم ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے ایک سرکیولر جاری کیا گیا جس کے ذریعہ اخباروں پر کئی پابندیاں لگادی گئیں۔" اس سرکیولر میں اخبار کے ایڈیٹروں کو یہ ہدایت تھی کہ ایسی کوئی خبر شائع نہ کی جائے جس سے کسی سرکاری ملازم کو گزند کی دھمکی کا گمان ہو یا جس سے عوام کے ذہنوں کو ہزہائی نس دی نظام گورنمنٹ یا اس کے کسی افسر کو بہکایا جائے۔"

صحافت پر حکومت کی غیر جمہوری پابندیوں کے خلاف حیدرآباد اور سکندرآباد کے اکثر اخباروں نے سخت تنقیدی اداریہ اور مضامین شائع کیے۔ اور ایک اُردو اخبار "شوکت الاسلام" نے ان پابندیوں کے معاہدہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا اور اپنے ایک اداریہ میں حکومت کی جانب سے صحافت پر پابندیوں پر مذمت کا اظہار شاعرانہ انداز میں اس طرح کیا۔

"یہ ہلاکو خانی احکام ہیں یا چند دوستوں کی طرف سے حکومت کے
چہرہ کو سیاہ کرنے کی کوشش
محبت بھرے دلوں کی دردناک دھڑکنوں پر
ہم کب تک خاموشی اختیار کریں
ہیں چل رہا ہوں
آخر اس راز کو کب تک چھپا رکھوں۔

بھلا نظام حکومت اس گستاخی کو کس طرح برداشت کرسکتی تھی چنانچہ اس اخبار کو بند کردیا گیا۔ صحافت پر پابندیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ ان میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

آریہ سماج تحریک کی ابتدا:۔ ۱۸۹۲ء میں سوامی گیرآنند سرسوتی کی کوششوں کی بدولت شہر حیدرآباد میں آریہ سماج کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے پہلے صدر کا منتا پرساد تھے اور اس کی پہلی سالانہ کانفرنس

کندہ عوامی باغ میں (جو اس وقت رزیڈنسی کے تحت تھا) منعقد کی گئی تھی۔ آریہ سماج کے بانیوں نے اس مقصد سے اس تحریک کو شروع کیا تھا کہ ہندو مذہب میں جو غلط اور غیر ضروری رسم اور رواج رائج ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ آریہ سماج کے ان اغراض و مقاصد کا بہت بڑے پیمانے پر پرچار شروع ہوا۔ شری گوکل پرشاد اور شری دین دیال شرما کی پرجوش تقاریر نے ہندو نوجوانوں میں زبردست ہل چل مچا دی۔ سناتن دھرم کو ماننے والے ہندو آریہ سماج کی اس اصلاحی مہم سے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے "دی سناتن دھرم مہا منڈل" قائم کی تاکہ آریہ سماج کے خلاف جوابی مہم شروع کی جائے۔ ان دونوں تنظیموں نے ہندو مذہب کے مختلف پہلوؤں اور اصلاح کی ضرورت پر بحث مباحثوں کا اہتمام کیا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آریہ سماج کی اصلاحی مہم کا ہندو نوجوانوں پر بڑا گہرا اثر پڑا اور روز بہ روز آریہ سماج کی مقبولیت اور اس کے پیروؤں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں حیدرآباد میں آریہ سماج ہی ایک ایسی تنظیم تھی جس نے ہندو نوجوانوں کو اصلاحی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کی طرف راغب کیا اور ان میں بیداری کی شمع روشن کی۔ لیکن چند سالوں بعد حیدرآباد کا سیاسی ماحول مکدر ہونا شروع ہوا تو آریہ سماج کی ماہیئت میں بھی تبدیلی آنا شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ وہ ہندو مذہب کے اصلاحی پرچار کے ساتھ ساتھ ہندو طبقہ کے سماجی اور سیاسی مسائل پر زیادہ زور دینا شروع کیا اور بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اس پر فرقہ واریت کی چھاپ گہری ہوتی گئی۔ آریہ سماج کے تعلق سے نظام حکومت نے ابتدا ہی سے یہ رویہ اختیار کیا کہ یہ تحریک حیدرآباد کے باہر سے آنے والے غیر ملکی ہندوؤں کی طرف سے شروع کی گئی ہے جو حیدرآباد کے مسلمانوں، ہندوؤں اور ہریجنوں کو آریہ سماج میں شریک ہونے کے لیے ورغلا رہے ہیں اور یہ اپنی کتاب "ستیارت پرکاش" میں مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن، مسلمانوں کے خدا اور ان کے رسول محمد صلعم اور جنت کے بارے میں غیر مہذب زبان استعمال کی گئی ہے اور ان پر حملے کیے گئے ہیں۔ اسی بنا پر آریہ سماج کے لیڈروں کو شہر بدر کیا گیا اور اس تحریک کو کچلنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔

گنیش اُتسو کی شروعات :- گنیش اتسو کو ایک تہوار کے روپ میں منانے کا طریقہ حیدرآباد شہر میں سب سے پہلے ۱۸۹۵ء میں شروع ہوا۔ گنیش اتسو منانے کی ابتداء، لوکمانیہ تلک (۱۸۲۰–۱۸۶۵ء) نے مہاراشٹرا میں کی تھی۔ یہ تہوار عام طور پر ایک ہفتہ عشرہ کے لیے منایا جاتا تھا جس کے دوران بھجن گائے جاتے، ایک میلہ ترتیب دیا جاتا اور اہم عصری مسائل پر لکچروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تلک نے اس اتسو کی ابتداء، ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران کی تھی تاکہ اس کے ذریعہ عوام میں بیداری پیدا کی جائے اور انھیں آزادی کی جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے کیونکہ اس زمانے میں شہری آزادیوں کا فقدان تھا۔[1]

حیدرآباد شہر میں صرف دو مقامات پر۔ شاہ علی بنڈہ اور چادر گھاٹ ۔ یہ تہوار منایا جاتا تھا۔ لیکن کچھ برسوں بعد اس تہوار کے ان اعلا مقاصد کو بالکل مسخ کر دیا گیا، اس کو فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لیے آلۂ کار بنایا گیا اور اکثریتی طبقہ اپنی عددی برتری اور طاقت کے اظہار کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ چنانچہ چند برسوں پہلے حیدرآبادی عوام کو اس تہوار کے موقع پر بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس پرامن دور کے آخری دو، تین برسوں میں بال کرشنا ہری شافے کی گرفتاری (۱۸۹۷) اور بابا صاحب کی ضلع بیڑ میں بغاوت (۱۸۹۸ء) نے پھر ایک بار ہل چل پیدا کردی۔

ا۔ ڈاکٹر رگھوناتھ چٹوپادھیا :- ڈاکٹر رگھوناتھ چٹوپادھیا (مسز سروجنی نائیڈو کے والد) ہندوستان کے صف اول کے مجاہدین آزادی میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے اور تعلیمی ترقی کے لیے انھوں نے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ وہ مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کے ایک گاؤں برہما نگر میں پیدا ہوئے۔ انھیں علم و حکمت ورثہ میں ملی تھی۔ وہ خود سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے مشرق اور مغرب کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا، انھیں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور عبرانی زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ

ایک سائنس داں بھی تھے اور کیمیا سے گہری دلچسپی تھی اور حیرت کی بات تو یہ ہے وہ کسی کیمیائی نسخہ سے سونا بنانے کی چکر میں بھی سرگرداں رہے۔ ان کی اس ہمہ گیر اور پہلو دار شخصیت سے متاثر ہو کر نوجوانوں کا ایک بڑا گروپ ان کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے ۱۸۷۷ء میں ایڈن برگ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس (ڈی۔ یس۔ سی) کی ڈگری حاصل کی تھی اور جرمن یونیورسٹی (بون) میں بھی زیر تعلیم رہے۔ انھیں یورپ میں مزید تعلیم کے لیے گل کرسٹ اسکالر شپ بھی دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ان تمام ڈگریوں سے زیادہ سنسکرت میں ان کی اعلا صلاحیتوں کی بنا پر جو ڈگری عطا کی گئی تھی اس کو زیادہ اہم تصور کرتے تھے۔

سر سالار جنگ ۱۸۵۳ء میں جب ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم بنے تو ان کی یہ کوشش رہی کہ ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنائیں اور یہاں انگریزی تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے ممکنہ سعی کریں۔ چنانچہ جب وہ ۱۸۷۷ء میں انگلستان گئے تو کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ انگریزی تعلیم کی ترویج کے لیے ڈاکٹر گھور ناتھ چٹوپادھیا کی خدمات بہت ہی کار آمد ثابت ہوں گی۔ سالار جنگ حیدر آباد واپس ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ریاست میں ملازمت قبول کرنے کی دعوت دی۔ جس کو انھوں نے قبول کر لیا اور ۱۸۷۷ء میں حیدر آباد آئے۔

حیدر آباد میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے ریاست کے تعلیمی مسائل کا جائزہ لیا اور جدید بنیادوں پر یہاں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں جُٹ گئے۔ سر سالار جنگ کی خواہش کے مطابق سب سے پہلے انگریزی ذریعہ تعلیم کے ایک اسکول کی ابتدا کی۔ کچھ ہی دنوں بعد ۱۸۸۱ء میں "حیدر آباد کالج" کی بنیاد رکھی اور اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کالج کے پہلے پرنسپل تھے یہ کالج بعد میں نظام کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ وہ اس کالج پرنسپل کے عہدہ سے ۱۹۰۷ء میں سبکدوش ہوئے۔

اس کے بعد انھوں نے تعلیم نسواں کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ ان کی شریک حیات شریمتی وراداسندری دیوی اور دوسری روشن خیال خواتین کی مدد اور کوششوں

کی بدولت ناپسلی میں لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول شروع کیا گیا اور یہی پودا تناور ہو کر خواتین کی تعلیم کے ایک علاحدہ کالج میں تبدیل ہو گیا جس کا بعد میں الحاق عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا گیا۔

اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب انگریزی سیکھنے پر بہت زور دیتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہر بچے کو ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جانی چاہیے چنانچہ انھوں نے مادری زبان میں تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے "انجمن معیار العلوم" بنائی۔ اس انجمن کی جانب سے کالج میں پڑھائے جانے والے تمام مضامین کے امتحانات خانگی طور پر اردو میں لیے جاتے۔ اس انجمن کے امتحانات میں سارے ہندوستان کے وہ تمام طلبہ شریک ہوتے جن کی مادری زبان اُردو ہوتی۔ کامیاب امیدواروں کو سرٹیفکیٹ دیے جاتے جس کی بنیاد پر طلبہ کو ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کا یہ ادارہ فنڈ کی کمی اور حکومت کی بے توجہی کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن مادری زبان (اُردو) میں تعلیم کی جو بنیاد اس وقت رکھی گئی تھی اسی بنیادوں اور اصولوں پر کئی سال بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب عورتوں کے پچھڑے پن کو دور کرنے، ان میں تعلیم عام کرنے اور انھیں سماجی بندھنوں سے آزادی دلا کر معاشی حیثیت سے انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے خواہش مند تھے۔

وہ بچپن کی شادی کے سخت خلاف تھے اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کے حامی تھے چنانچہ ان ہی کی کوششوں سے حیدرآباد میں اسپیشل میاریج ایکٹ کا نفاظ عمل میں آیا۔ وہ بین ملی شادیوں کی تائید میں تھے۔ اس کا عملی ثبوت خود ان کے افراد خاندان کی شادیوں سے ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر پر مختلف مکاتب اور عقائد کے نوجوانوں کا اس قدر ہجوم رہتا کہ وہ ایک "دربار" کی صورت اختیار کر لیتا اور پیار و محبت کا یہ دربار سب ہی کے لیے کھلا رہتا، جہاں مذہب، ذات پات، امیری غریبی کے تفرقے ختم ہو جاتے اور صرف بھائی چارگی اور یکجہتی و یگانگت کے مثالی نظارے دیکھنے میں آتے۔

اب تک ہم نے ڈاکٹر صاحب کے علمی، تعلیمی اور سماجی کارناموں کا جائزہ لیا۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو جو ۱۸۸۵ء کے بعد اجاگر ہونا شروع ہوا وہ ان کی سیاسی مصروفیات ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء کے بعد حیدرآباد میں بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی اور اس لہر کو طاقت ور بنانے والوں میں سرفہرست ڈاکٹر صاحب اور آن کے دیرینہ رفیق کار ملا عبدالقیوم تھے۔ یہ دونوں اصحاب کانگریس میں شریک ہونے والے پہلے حیدرآبادی تھے۔

حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات کو آگے بڑھانے "انجمن اخوان الصفا" کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کی پابندی سے بیٹھکیں ہوتیں، جس میں ملک کے سماجی، تعلیمی اور سیاسی مسائل پر بحث و مباحث ہوتے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملا عبدالقیوم کے ساتھ "چاندہ ریلوے پراجکٹ" کی تکمیل کے لیے بیرونی ممالک سے سرمایہ اکٹھا کرنے کی مخالفت میں احتجاجی مہم چلائی، اسی بناء پر ۱۹ر مئی ۱۸۸۲ء میں ان کی گرفتاری کا وارنٹ نکالا گیا اور انھیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کے قیام کے دوران ان کی شہربدری کے مسئلہ کو وائس رائے سے رجوع کیا گیا۔ وائسرائے نے یہ محسوس کیا کہ ان سے ناانصافی کی گئی ہے لہٰذا ان کی جلاوطنی منسوخ کی گئی اور حیدرآباد سے رزیڈنٹ کو واپس بلا لیا گیا۔ اس کے باوجود انھیں (۶) سال کی طویل مدت تک کالج کا پرنسپل نہیں بنایا گیا۔ ان صبر آزما چھ سالوں میں انھیں اور ان کے خاندان کو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار انھیں شعبۂ سائنس کا صدر بنایا گیا۔ یہاں بھی کچھ ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ انھیں مجبوراً قبل از قبل وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا۔ ان ریشہ دوانیوں اور مشکل حالات کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیمی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اسی جوش و خروش سے جاری رکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں ہریجن اور پست اقوام کے بچوں اور بالغوں کی تعلیم کے لیے شبینہ اسکول کھولا۔ حالانکہ وہ ایک کٹر بنگالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں برطانوی حکومت نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے

خلاف سارے ہندوستان میں ایک انقلابی اُبھار آیا۔ حیدرآباد میں بھی بنگالی عوام سے اظہار ہمدردی کے لیے ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا، جس کے روح رواں ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو شعر و ادب، تہذیبی اور ثقافتی مصروفیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے گھر کے دروازے دانشوروں، شاعروں، آرٹسٹوں اور ڈرامہ نگاروں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ خود ایک شاعر تھے اور ان کی شریک حیات بھی بنگالی کی اچھی شاعرہ تھی۔ ان کی وسیع المشربی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے گھر میں فرانس، جرمنی، آرمینا، افریقہ اور برما کے نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لیے مہینوں رہتے تھے۔ وہ تو عالمی برادری میں یقین رکھتے تھے اور اسی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

ایسے بلند پایہ والدین اور علم و ادب کے ایسے دانشورانہ ماحول میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے بچوں کا ہونہار ہونا ایک فطری بات تھی۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی شہرہ آفاق مسز سروجنی نائیڈو تھیں، جن کے نام سے حیدرآبادی بخوبی واقف ہیں۔ ویریندر ناتھ ان کا بڑا لڑکا تھا جو ایک عظیم المرتبت انقلابی تھا۔ انھوں نے جرمنی میں "مخالف سامراج لیگ" کی بنیاد ڈالی اور ساری عمر انگریز سامراجیوں کے خلاف لڑتے ہوئے گزاری۔ ان کی انقلابی سرگرمیوں نے سینکڑوں ہندوستانی نوجوانوں کے دلوں میں ایک نیا جوش پیدا کیا اور سامراج دشمن جدوجہد کو جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کا یہ ہیرو بغاوت کے پرچم کو ۱۹۴۲ء تک لہراتا رہا اور اس انقلابی پرچم کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے سورماؤں کے حوالے کر گیا۔

دوسرے لڑکے ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کو شعر و شاعری، موسیقی اور دوسرے فنون کا لطیف ذوق ورثہ میں ملا تھا اور آج بھی وہ کئی ہندوستانی فلموں میں اعلا فنی صلاحیتوں کا جوہر دکھلاتے ہیں۔ شاعری کے ابھی بھی وہ ایک تابندہ ستارہ ہیں۔

۱۹۱۵ء میں رگھوناتھ چٹوپادھیا کی موت سے حیدرآباد کی عوامی بیداری کا ایک دور ختم ہو گیا اور حیدرآبادی عوام ایک عظیم دانشور، سائنس داں، ماہر تعلیم اور سماجی مصلح سے محروم ہو گئے۔

مُلّا عبدالقیوم ۱۸۵۳ء-۱۹۰۶ء

مسز سروجنی نائیڈو نے ۱۹۴۱ء میں مُلّا عبدالقیوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "وہ ہندو مسلم اتحاد کا نہ صرف پیغامبر تھا بلکہ خود ایک جیتا جاگتا پیغام تھا۔ آج سے پچاس سال قبل جب ـــــ اور خاص طور پر ایک دیسی ریاست میں وطن پرستی کے چند کلمات بھی زبان پر لانا بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور ملک کی آزادی اور ترقی کے بارے میں اپنے خوابوں اور امیدوں کا کھلم کھلا اظہار کرنا اس وقت بڑی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔

آج ہمیں تاریخ کی کچھ عجب اور ناپاک ستم ظریفوں نے ایک احمقانہ اور تباہ کن فرقہ وارانہ جنگ میں پھنسا دیا ہے۔ جو بہت ہی افسوس ناک اور شرمناک بات ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے ملک کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ایسے حالات میں ایک دلیر، کشادہ دل انسان، عالم، آزادی کا سپاہی، محب وطن اور ایک محترم حاجی ـــ جو ہمیشہ صداقت کو ایک ـــ تابندہ ستارہ مان کر اس کی تلاش میں رہتا ـــــ کی یاد کو تازہ کرنا باعث فخر ہے۔ جس سے ہمیں ایک نئی طاقت کا احساس ہوتا ہے اور جو ہماری ہمت کو بڑھاتا ہے۔ میں اپنے والد کے دوست مُلّا عبدالقیوم کو محبت بھرا خراج عقیدت پیش کرتی ہوں جو ایک عظیم مسلمان، ایک عظیم ہندوستانی اور ایک عظیم انسان تھے۔"

مُلّا عبدالقیوم کے انتقال کے کئی سالوں بعد مسز نائیڈو نے اپنے اس خراج عقیدت میں اس عظیم شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت ہی مختصر، جامع اور موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مُلّا عبدالقیوم نہ صرف قوم پرست تھے بلکہ عالم دین بھی، ندوۃ العلماء سے ان کا گہرا تعلق

تھا۔ وہ انجمن ہلال کے روح رواں تھے، وہ جمال الدین افغانی کے قریبی رفیق تھے۔ حیدرآباد میں انجمن حجاز ریلوے کے بانی تھے اور انھوں نے ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد میں لازمی تعلیم کی ایک جامع اسکیم پہلی بار پیش کی تھی۔ غرض یہ کہ ان کی شخصیت کے تین اہم پہلو تھے۔ (۱) وہ ایک پکے اور سچے مسلمان تھے (۲) وہ ایک کٹر قوم پرست تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے دیرینہ رفیق رگھوناتھ چٹوپادھیا کے ساتھ حیدرآباد میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی اور (۳) وہ ایک ماہر تعلیم تھے اور یہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیل جائے۔ ان کی شخصیت میں یہ کوئی تضاد نہیں تھا بلکہ وطن پرستی، قومی اتحاد و یکجہتی اور صالح اسلامی تعلیمات کا ایک حسین امتزاج تھا۔

ملا صاحب ۱۸۵۳ء میں مدراس کے ایک مذہبی اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب موصل کے شیوخ بنی تمیم یعنی صدیقی شیوخ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد حکیم عبدالباسط عشرت ایک کامیاب اور نامور معالج تھے۔ ملا صاحب کا بچپن میسور میں گزرا اور آٹھ سال کی عمر میں وہ حیدرآباد آئے۔ یہاں دارالعلوم میں تعلیم پائی اور عربی و فارسی کی اعلا تعلیم کے لیے مرزا پور (یوپی) تشریف لے گئے۔ حیدرآباد واپس آنے کے بعد ۱۸۷۵ء میں حکومت حیدرآباد کے سروے اور بندوبست کے محکمہ میں بحیثیت ایک سررشتہ داران کا تقرر عمل میں آیا۔ لیکن وہ اپنی اعلا صلاحیتوں اور کردار کی بدولت ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنری، اسپیشل کمشنری، تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور تعلقداری کے اعلا عہدوں پر فائز رہے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا سے جو اس وقت چادرگھاٹ کالج کے پرنسپل تھے ربط پیدا ہوا۔ چوں کہ یہ دونوں ملک کے قومی اور ریاستی مسائل پر ہم خیال تھے اس لیے وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست اور رفیق کار بن گئے۔ ان کی یہ دوستی جو ۱۸۸۰ء سے شروع ہوئی تھی وہ ملا صاحب کے انتقال (۱۹۰۶ء) تک قائم رہی۔

ملا عبدالقیوم کی تعلیمی اور علمی خدمات:۔ ملا صاحب جب محکمہ تعلیمات میں کام کرتے تھے تو انھوں نے ریاست کے جاگیرداروں، زمین داروں اور انعام داروں کے بچوں کو لازمی تعلیم کے لیے ایک

جامع اسکیم مرتب کی۔ شاید اسی بنا پر حکومت حیدرآباد نے بھی ۱۸۷۵ء میں ایک سرکیولر کے ذریعہ ریاست کے جاگیرداروں اور انعام داروں کو ہدایت دی کہ اپنی اولاد کو اسکول میں شریک کرائیں اور اس سرکیولر کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کے جاگیری معاوضوں کو بند کرنے کی دھمکی بھی دی گئی۔

اس کے علاوہ ملّا صاحب نے حیدرآباد میں تعلیمی ترقی کے لیے کئی اصلاحی تجاویز پیش کیں۔ ان کی یہ تجویز تھی کہ اعلا تعلیم کے لیے ہونہار طلبہ کو اسکالرشپ دیے جائیں۔ تعلیمی اداروں میں کافی اضافہ کیا جائے۔ ٹکنیکل اور صنعتی تعلیم کے لیے اسکول کھولے جائیں۔ وہ برطانوی ہند میں مروّجہ انگریزی نظامِ تعلیم کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ شائد اسی بنا پر ملّا صاحب سرکاری ملازمت کے شخصی طور پر مخالف تھے۔ وہ تجارت زراعت اور صنعت و حرفت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ "اسلام میں دو باتوں پر نہایت اہتمام سے زور دیا گیا ہے، ایک صدق مقال اور دوسرا اکل حلال، اور ان کے بغیر کوئی عمل (خدا کے پاس) قبول نہیں ہوتا" اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ سرکاری ملازمت میں یہ دونوں مفقود اور غیر موجود ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ملّا صاحب نے تقریباً ایک سو (۱۰۰) سال پہلے مسلمانوں کو کتنا دور اندیشانہ مشورہ دیا تھا اور خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد کے مسلمانوں نے سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کرنا چھوڑ کر گذشتہ دو، تین دہوں سے ملّا صاحب کے مشورہ پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

ملّا صاحب کی مذکورہ بالا اسکیموں اور تجویزوں پر عمل آوری کے لیے حکومت حیدرآباد نے کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ انھیں محکمہ تعلیمات سے ہٹا کر گلبرگہ تبادلہ کر دیا گیا۔ لیکن وہ اپنی دُھن کے پکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گلبرگہ میں جاگیرداروں اور انعام داروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے "مدرسہ سرداراں" قائم کیا، جس کی افتتاحی تقریب ۱۴ر اگست ۱۸۸۸ء کو سر آسمان جاہ بہادر، وزیر اعظم حیدرآباد کے ہاتھوں انجام پائی۔

۱۸۸۹ء میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "لازمی تعلیم کے لیے ایک التجا" کے عنوان سے اردو میں شائع کی جو حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں لازمی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کے تعلق سے جو دلائل پیش کیے

گئے تھے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

(۱) تعلیم کو کیوں لازمی قرار دیا جائے، اس پر مدلل بحث کی گئی تھی۔ (۲) مذہبی کتابوں سے لازمی تعلیم کی تائید میں اقتباسات پیش کیے گئے تھے۔ (۳) لازمی تعلیم کے خلاف جس قسم کے اعتراضات کیے جاتے تھے انھیں پیش کیا اور ان کا مدلل جواب دیا گیا۔ (۴) لازمی تعلیم کی تائید میں یورپ، امریکہ اور دوسرے ممالک ــــ قدیم اور جدید کے فلسفیوں اور ماہرین کے خیالات کو پیش کیا گیا تھا۔ (۵) ہندوستان اور دکن کی تعلیمی ترقی پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

حکومت حیدرآباد نے لازمی تعلیم کی تائید میں ملّا صاحب کے پیش کردہ تمام دلائل کو مانتے اور ان کی اسکیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے لازمی تعلیم کے خلاف جو دلائل پیش کیے تھے ان میں سے چند اس لیے قابل ذکر ہیں کہ اس سے حکومت کے نقطۂ نظر اور ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حکومت کا کہنا تھا کہ لازمی تعلیم کی اسکیم پر عمل آوری سے عوام میں بے چینی اور بد امنی پیدا ہوگی اور یہ کہ تعلیم یافتہ نوجوان حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا کریں گے۔ ایک دلیل یہ بھی تھی کہ تعلیم عام ہونے سے اعلا طبقات اور عوام کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ تعلیم عام کی جائے تو بیروزگاری بڑھے گی اور لازمی طور پر عوام میں ہل چل پیدا ہوگی۔

حکومت کے ان تمام بے معنی اعتراضات کے ملّا صاحب نے مدلل جوابات دیے لیکن حکومت نے ان کی باتوں پر توجہ دینا تک گوارا نہیں کیا۔

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں۔

علمی میدان میں ملّا صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ تحقیقاتی مراکز "دائرۃ المعارف" کا ۱۸۹۱ء میں قیام ہے جو اپنی زندگی کے سو ۱۰۰ سال پورے کر چکا ہے۔ اب تک اس تحقیقی ادارہ نے درجنوں نایاب عربی مخطوطات کو مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک کے علمی حلقوں میں اس ادارہ کو ایک اعلا اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایک سال بعد ۱۸۹۲ء میں کتب خانۂ آصفیہ شروع کرنے میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہی کتب خانہ اب

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کہلاتا ہے۔

مدرسہ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کو بتدریج رائج کرنے اور دینی و مذہبی تعلیم کی مزید اصلاح کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے ایک رکن اسی مدرسہ کے قدیم طالب علم ملا عبدالقیوم بھی تھے۔ جامعہ نظامیہ سے بھی ان کا گہرا اور قریبی تعلق رہا۔

ملا صاحب کی سماجی اور سیاسی خدمات:۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی تاریخ اور وہاں پیش آنے والے سیاسی تبدیلیوں سے ملا صاحب کو گہری دلچسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک کے خلاف انگریزی اور فرانسیسی سامراجیوں کی ریشہ دوانیاں عروج پر تھیں، جس سے ملا صاحب کافی فکرمند تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کوہ قاف اور وسط ایشیا کی مسلم حکومتوں پر زار روس کا تسلط تھا، ۱۸۷۸ء تک چینی ترکستان کی حکومتیں چین کے قبضہ میں چلی گئی تھیں، ۱۸۸۰ء میں الجزائر اور تیونس پر فرانس کی عملداری ہو گئی تھی، ۱۸۸۲ء میں سوڈان بھی انگریزوں کے زیر نگیں آگیا تھا، ترکی بھی ان سازشوں سے نہ بچ سکا اور کئی بلقانی ریاستیں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ مسلم ممالک کی اس حالت زار سے سارے ہندوستان کے مسلمان متاثر تھے اور سامراجی طاقتوں کے خلاف ان میں غم و غصہ کے جذبات ابھر رہے تھے۔

اس پس منظر میں برطانیہ کے رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر آرنسٹ ہارٹ ۱۸۹۴ء میں ہندوستان کے دورہ پر اس مقصد سے آئے تھے کہ ترکی کی حکومت کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ حج کے زمانے میں مکہ اور مدینہ میں صفائی اور حفظان صحت کے انتظامات معقول نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے وہاں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ "زم زم" کا پانی جو حاجی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں وہ بھی بیماریاں پھیلانے کا ایک ذریعہ ہے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ زم زم کے کنوئیں کو بند کر دیا جائے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان ان کی اس مہم کا ساتھ دیں تاکہ اس طرح ترکی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ انھوں نے اپنی اس مہم کا آغاز حیدرآباد سے کیا چنانچہ باغ عامہ میں سرکاری حکام کے زیر نگرانی ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ اور وزیر اعظم نواب وقار الامراء شریک تھے اور عوام کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔

ڈاکٹر ہارٹ نے اپنی تقریر میں مذکورہ بالا خیالات کو موثر انداز میں پیش کیا۔ اس کے بعد ملا صاحب نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر ہارٹ کے خیالات کی پرزور طریقے سے مخالفت کی اور کہا کہ حج و زیارت کا انتظام کرنا ترکی حکومت کی ذمہ داری ہے ایسے قومی اور مذہبی معاملہ میں حکومت برطانیہ کی دلچسپی اور مداخلت غیر ضروری ہے۔ ان کی تقریر سے مجمع میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور دوسری طرف رزیڈنٹ اور وزیر اعظم و اعلا حکام مملکت دنگ رہ گئے۔ اسی موضوع پر ملا صاحب نے ایک مقالہ چھپوا کر جلسہ میں تقسیم بھی کروایا۔ ان تقاریر کے بعد جب ہارٹ نے عوام سے خواہش کی کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کریں تو شرکائے جلسہ نے (جن کی تعداد دو، تین ہزار کے قریب تھی) ڈاکٹر ہارٹ کے خیالات اور تحریک پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ریاست کے اس دور کے انگریزی رزیڈنٹ اور وزیر اعظم کی موجودگی میں ایک انگریز کن پارلیمنٹ کے پیش کردہ خیالات کا ایک ملازم سرکار کا کھلم کھلا مخالفت کرنا اور اس کی تحریک کو ناکام بنانا ایک بہت ہی جرأت مندانہ اقدام تھا جو ملا صاحب جیسی عظیم شخصیت اور مجاہد آزادی ہی سے ممکن تھا۔

ملا صاحب ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ملک و قوم کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا۔ ان ہی دنوں انھیں ایک بین ملی خدمت کا موقع ملا، ترکی حکومت نے اس وقت دمشق اور مدینہ کے درمیان ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا اور اس کام کی تکمیل کے لیے ترکی کو کثیر رقم کی ضرورت تھی۔ ملا صاحب نے لبیک کہا اور حیدرآباد میں اس مقصد کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے انجمن حجاز ریلوے تشکیل دی، سارے ملک کا دورہ کیا، جلسے منعقد کیا اور ایک گراں قدر رقم جمع کر کے حکومت ترکی کو روانہ کی اور اس طرح ترکی میں سامراجی ریشہ دوانیوں کا پردہ فاش کیا اور ہندوستانی مسلمانوں میں سامراج دشمن بیداری پیدا کی۔

چاندہ ریلوے پراجکٹ کے لیے نظام حکومت نے لندن میں قرضہ اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو ریاست کے مفادات کے خلاف تھا، اس لیے ملا عبدالقیوم اور ڈاکٹر رگھوناتھ چٹوپادھیا نے اس کے خلاف زبردست مہم چلائی تھی جس کی پاداش میں ملا صاحب کو حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔

ملّا عبدالقیوم اور قومی تحریک :- ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ حیدرآباد سے جو اصحاب باوجود سرکاری ملازم ہونے کے کانگریس میں شریک ہوئے اور مستقل مزاجی سے ساتھ دیا۔ ان میں ملّا عبدالقیوم اور ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس زمانہ میں مسلمان کانگریس سے علاحدہ تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس میں شرکت مذہبی عقائد کے خلاف ہے۔

مدراس کے اردو اخبار "فخر دکن" نے محمڈن اور کانگریس کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھا، جس میں ملّا عبدالقیوم کی کانگریس میں شرکت پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ اس مضمون کا مفصل اور مدلل جواب ملّا صاحب کے فرزند منشی عبدالمنعم نے دیا، جو لاہور کے "پیسہ اخبار" میں شائع ہوا۔

خود ملّا صاحب نے اپنے مضامین میں (جو اکثر امرتسر کے مشہور اور ذی اثر اخبار "وکیل" میں شائع ہوتے تھے) مذہبی استدلال اور دلائل سے ثابت کیا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونا چاہیے۔

کانگریس میں ملّا صاحب کے شریک ہونے پر اکثر بااثر مسلم لیڈروں اور اردو اخباروں نے اپنی تنقیدوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی تنقیدوں کا جواب دیتے ہوئے ملّا صاحب نے لکھا کہ "مدیر البشر" کا میرے نسبت یہ ریمارک کرنا کہ اس تحریک سے میری وقعت مسلمانوں کی نظروں میں جاتی رہی۔ معلوم نہیں اس سے کون سے مسلمان مراد ہیں۔ نئے فیشن یا پرانے مجھے ان نومسلموں سے کچھ بحث نہیں۔ البتہ قدیم مسلمانوں سے ضرور اعتقاد ہو سکتا ہے۔ سو ان سے مجھے اس کی ہرگز امید نہیں ہے۔ اگر بالفرض ہوں تو کیا پرواہ کیا مضائقہ"

گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

بیرونی قوموں کی غلامی اور آزادیٔ وطن کے بارے میں ملّا صاحب کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

"میرا ذاتی خیال تو یہ ہے اور ہمیشہ میں اس پر زور دیتا رہا ہوں کہ قوم کو

اس پست خیالی سے کہ غیر قوم کی غلامی کریں اور اسی کو ذریعہ فخر و مباہات اور اکتساب دولت و ثروت و عزت سمجھیں، نکالنا چاہیے اور ان کو اس بندگی و بے چارگی سے آزاد کرانا اور رہائی دلانا ضروری ہے۔"

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ "ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد ہندوستانی، اس لیے ہم کو متحد ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو نیشنل کانگریس سے تعاون کرنا چاہیے۔"

ان کا یہ کہنا دور اندیشانہ خیال تھا کہ کسی قوم کی سیاسی آزادی مکمل نہیں "جب تک کہ اسے غیر طبعی ذریعہ معیشت کو چھوڑ کر طبعی ذرائع معیشت ـــــ جو نہایت وسیع ہیں ـــــ حاصل و پیدا نہ کیے جائیں۔ اس لیے قوم کی طاقت تجارت، صنعت و حرفت زراعت اور ملازمت کے وسیع، مکتفی اور کافی ذرائع کی طرف لگانا چاہیے۔"

ملا صاحب کے جو سیاسی عقائد تھے جن کا اوپر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سر سید احمد خاں کے خیالات سے بالکل مبل نہیں کھاتے تھے، وہ سرسید کے تعلیمی اور سماجی اصلاحات کی تائید میں تھے لیکن کانگریس اور مسلمانوں کے تعلق سے ان (سرسید) کے خیالوں کو قبول کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھے۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ملا صاحب نے اپنے دیرینہ رفیق رگھوناتھ چٹوپادھیا کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں سودیشی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا جس کے وہ بڑے حامی تھے۔ ملا صاحب آل انڈیا کانگریس کے مدراس اور بنارس کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ کانگریس میں مسلمانوں کے شریک ہونے کی حمایت میں انھوں نے ایک پمفلٹ "انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمان" شائع کیا۔ ملا صاحب کے ان خیالات کی بنا پر انگریزوں نے نظام حکومت پر دباؤ ڈالا کہ انھیں ملازمت سے علاحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مجبور ہو کر ۱۹۰۱ء میں قبل از وقت وظیفہ حاصل کیا۔

ملک کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل پر ان کے جو انقلابی خیالات تھے ان کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ صحت مند صحافت اور نوجوان کی حرکاتی اداروں کی ہمت افزائی کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خیالات سے متاثر نوجوانوں۔ مولوی محمد اکبر علی، مولوی محمد مظہر علی وغیرہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ

"انجمن معارف" شروع کریں۔ جس کا مقصد حیدرآباد کی سماجی، ثقافتی اور معاشی زندگی کو سدھارنے اور ترقی دینے کی ممکنہ کوشش کرنا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر مولوی اکبر علی صاحب کی ادارت میں ماہنامہ صحیفہ (۱۹۰۵) شروع کیا گیا جو بعد میں روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔ اس اخبار کی غالباً پہلی اشاعت میں ملا صاحب نے اپنی زندگی کا آخری مضمون سپرد قلم کیا، جس میں ہندوؤں کے پیغمبروں کے بارے میں زرین خیالات کا اظہار کیا تھا۔

۱۹۰۶ء میں ملا صاحب کی موت صرف ایک عظیم شخصیت ہی کی موت نہ تھی بلکہ حیدرآباد کا ایک ایسا دور ختم ہوگیا، جس میں انھوں نے حریت، بصیرت، اخوت، علم و حکمت اور پیار و محبت کے چراغ روشن کیے تھے۔

مولوی محب حسین ۱۸۵۱—۱۹۳۰ء

آج سے کوئی (۱۰۷) ایک سو سات سال پہلے محب حسین نے حیدرآباد میں ایک صحت مند قوم پرست اور وطن دوست صحافت کی ابتدا کی اور بجا طور پر انھیں اس دور کی صحافت کا معمار کہا جا سکتا ہے۔

وہ نہ صرف ایک بلند پایہ صحافی تھے بلکہ عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی اور آزادئ نسواں کے علم بردار بھی۔ وہ "محب حسین" ہی نہیں بلکہ محب وطن بھی تھے۔ آزادی تحریک کے ایک نڈر اور بے باک سپاہی اور ایک صاحب دیوان قومی شاعر تھے۔

ان کا جنم ۱۸۵۱ء میں اپنے آبائی وطن اٹاوہ (اتر پردیش) میں ہوا اور یہیں انھوں نے بحیثیت ایک مدرس اپنی زندگی کا آغاز کیا اور کچھ عرصہ بعد الہ آباد کے صدر بورڈ میں نقشہ نویس کے شعبہ میں متعین کیے گئے۔ الہ آباد کے قیام کے زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں آپ نے شرکت بھی کی تھی۔

The Hyderabad State Committee, The freedom Struggle in Hyderabad Vol III

محسن الملک نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی چنانچہ وہ ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے اور انھیں معتمدی مال میں مترجم کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ اپنی اعلا صلاحیتوں کی بنا پر مختصر مدت میں انھوں نے یہاں کے صحافتی حلقوں میں اپنے لیے ایک بلند مقام پیدا کر لیا۔

۱۸۷۹ء میں جمال الدین افغانی پانچویں بار ہندوستان آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس وقت یہاں نہ کوئی اخبارات تھے اور نہ ادبی و سماجی ماحول۔ ان دنوں محب حسین کی ملاقات جمال الدین افغانی سے ہوئی اور تقریباً تین سال تک وہ ان کی صحبت اور علمی و سیاسی مباحث سے فیض حاصل کرتے رہے۔ ان کی یادگار صحبتوں کے تعلق سے قاضی عبدالغفار صاحب (سابق مدیر پیام) تحریر فرماتے ہیں کہ "جب میں حیدرآباد آیا تو یہاں آکر پتہ چلا کہ مولوی محب حسین مرحوم تو حیدرآباد کے ان چند ارباب ذوق میں سے تھے جو شیخ (جمال الدین افغانی) کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ اپنی تلاش کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو میں نے جوڑنا چاہا تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ افکار کے چند گوشے ایسے تھے کہ جن کے بہت گہرے نقوش مولوی محب حسین مرحوم کے افکار میں نظر آئے ہیں۔ اب میں سمجھا کہ مرحوم اسی حیات نو کا ایک پیغام تھے جس نے علامہ افغانی کی آواز کو افغانستان سے مصر و حجاز اور یورپ تک پہنچایا تھا۔ آصف جاہی دکن کے دور انحطاط میں اجتہاد اور تجدید کی اس اخلاقی قوت کو محسوس کر کے جو مولوی محب حسین مرحوم کی تحریروں میں کارفرما تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو وہی قوت حیات ہے۔ جو قوموں کے اضمحلال کی حالت کا قدرتی ردعمل ہوا کرتی ہے، جس کا ایک سیلاب جمال الدین افغانی کی زندگی میں بہہ رہا تھا۔"

حیدرآباد میں مولوی محب حسین کی صحافی، قومی، سماجی اور سیاسی زندگی کی ابتدا ۱۸۸۰ء میں ہوئی جب انھوں نے مولانا جمال الدین افغانی کی ایماء پر ایک رسالہ "معلم شفیق" نکالنا شروع کیا اور دو سال بعد وہ ہفتہ وار اخبار میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بعض ناگزیر حالات کی بنا پر اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جا سکا۔

اس ماہنامہ کے اعلا معیار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں

ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، نباتیات، معدنیات، تجارت، الٰہیات، تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات اور ادبیات جیسے مختلف النوع عنوانات پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس رسالہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں جمال الدین افغانی جو اُن دنوں حیدرآباد میں عارضی طور پر مقیم تھے۔ کے کئی محققانہ مضامین اور مقالے شائع ہوا کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں حیدرآباد کے صحافی افق پر ایک اور ماہ نامہ "معلم نسواں" تابناکی سے نمودار ہوا جو خواتین کے مسائل کا ترجمان اور آزادئ نسواں کا علم بردار تھا۔ اس رسالہ میں خواتین کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر اور پردہ کی فرسودہ رواج کے خلاف مدلل مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ حکومت وقت کی نظر میں ان مضامین میں اعتدال پسندی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا اور اس کا احتمال سمجھا گیا کہ ان مضامین سے کہیں عوام میں انتشار نہ پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر حسب الحکم سرکار اس کی اشاعت کو چند ماہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔

دس، بارہ سال بعد "علم و عمل" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار ۱۹۰۴ء میں محب حسین صاحب کی ادارت میں شروع ہوا۔

آصف جاہی فوج کے سپہ سالار افسر الملک بہادر اور ان کے خاندان سے محب حسین صاحب کا قریبی ربط تھا۔ اس بنا پر انھوں نے ماہ نامہ "افسر" ۱۸۹۶ء کی ادارت کے فرائض دو سال تک انجام دیے۔ اس رسالہ میں عام طور پر افواج، اصول جنگ اور نامور سپاہیوں کے کارناموں پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

مولوی محب حسین کی صحافتی خدمات کے تعلق سے قاضی عبدالغفار صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> "یوں تو مرحوم اپنے قلم کا جہاد آج سے نصف صدی پہلے شروع کر چکے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمال الدین افغانی کی صحبتوں کے تاثرات سے ہی ان کے ارادوں نے بہت تقویت حاصل کر لی ہوگی۔ لیکن جس زمانہ میں مرحوم اپنی اصلاحی تحریک کو اپنے روزنامہ اخبار "علم و عمل" کے ذریعہ سے پیش کر رہے تھے وہ زمانہ (۱۹۰۴) تمام ملک ایشیا میں ایک قومی انقلاب کا زمانہ تھا۔ اور ہندوستان میں بھی یہ زمانہ

ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ چنانچہ دلن میں باہر کے حالات کا ردعمل اصحاب فکر و نظر کو (جن کی تعداد بہت کم تھی) جس طرح متاثر کر رہا تھا اس کا عکس روزنامہ "علم و عمل" کے صفحات پر نظر آتا ہے۔"

اس زمانے میں حیدرآباد میں فرسودہ جاگیرداری ڈھانچے اور انگریز سامراجیوں کی ریاستی معاملات پر بڑھتی ہوئی سیاسی گرفت اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے یہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ان ہی افسوسناک حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں

"اول تو یہی بات میرے لیے کافی حیرت انگیز ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخری میں اس ملک کے رجعت پسند عناصر کے مقابلے میں مولوی محب حسین نے بغاوت کا علم بلند کرنے کی جرأت کی اور اس زمانے کی سماجی زندگی کے بت خانوں کی توہین کر کے وہ سماجی اجارہ داری کے تعصب اور غصہ کو برداشت کر سکے۔ لیکن ان کی اجتہادی قوت نے تن تنہا اور بے یار و مددگار اپنا یہ کام انجام دیا۔"

حیدرآباد جیسی مطلق العنان ریاست میں ایک صحافی کا اس وقت کے سیاسی حالات پر قلم اٹھانا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اس کا ذکر قاضی صاحب اس طرح کرتے ہیں: "وہ یہ زمانہ ہے جب حیدرآباد کی فضا آزاد سیاسی مباحث کے لیے بہت ناسازگار رہتی تھی لیکن باوجود اس کے مولوی محب حسین صاحب سیدسی تنقید کے "شجر ممنوعہ" کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ جو رشوت ستانی کے خلاف مضامین لکھتا تھا۔ جو اس بات پر زور دیتا تھا کہ حیدرآباد کے نوجوانوں کو اعلا تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ بھیجا جائے، جو جاگیرداری نظام کی مخالفت کرتا تھا، جو مزدور اور کسان کے معاشی مسائل پر قلم اٹھاتا تھا، جو صحافت کے حقوق کا مدعی بنتا تھا اور لکھتا تھا کہ ــــ "مقامی اخباروں کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ سرکاری کارروائیوں پر جائز نکتہ چینی کریں ..... اور رعایا کے حقوق کی حفاظت میں گرم رہیں۔" حیدرآباد کی صحافت کی تاریخ میں محب حسین کے رول کے بارے میں قاضی صاحب کا یہ خیال تھا کہ

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد کی وطن پرست صحافت کے معمار اول مولوی محب حسین صاحب مرحوم ہی تھے۔ جس دن حیدرآبادی صحافت کے ارتقاء کی تاریخ لکھی جائے گی کو اس کے سرورق پر پہلا نام انہی کا ہوگا۔"

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ ایک سچے قوم پرست تھے۔ وہ برطانوی حکومت کے سخت خلاف تھے اور انھیں حکومت کی اس پالیسی پر سخت اعتراض تھا کہ دیسی ججوں کو "یوروپین مقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا تھا مگر یورپ کے ہر جج کو اگرچہ وہ ابھی انگلینڈ سے آیا ہو اور ہندوستان کے کسی رسم و رواج سے واقف نہ ہو، ہمارے ہندوستانیوں کے ہر قسم کے مقدمہ کو خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی، فیصلہ کرنے کا کامل اختیار تفویض ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اختیار اول ہی سے ظلم پر مبنی تھا اور فی الحال تو محض لغو اور خلاف از مصلحت ہے بلکہ ہم بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس قسم کے امتیازات ہر ایک حکومت کے لیے آخر کو نتائج بد پیدا کرتے ہیں۔"

انگریزی حکومت کے اس کھوکھلے دعوے کا کہ وہ ہندوستانیوں کو حق شناس اور انصاف پسند بنانا چاہتی ہے۔ وہ اس طرح پردہ چاک کرتے ہیں کہ

"یہی انگلش گورنمنٹ ایک وہ گورنمنٹ ہے جو تمام ہندوستان کی رعایا کو تعصب اور ناحق شناسی سے پھیر کر انصاف اور حق شناسی پر لانا چاہتی ہے۔ مگر اگلی ہندوستان کی حکومتوں پر بیجا تعصب اور مظالم کا بار دھرتی ہے اور اپنے مکاتب و مدارس اور تاریخی کتابوں میں اگلے مسلمان بادشاہوں کو متعصب اور جابر کہتی ہے اور باوجود اس کے خود اپنی کارروائیوں پر غور نہیں کرتی۔"

انگریزی سامراجیوں نے ہندوستان میں اپنے غاصبانہ اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے خطرناک جو پالیسی اختیار کی تھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور آپس میں منافرت پھیلانے کی تھی۔ ایسی پالیسی کو بعض مفاد پرست حلقوں نے آگے بڑھایا اور کچھ عرصہ بعد دو قومی نظریہ کی وکالت شروع کر دی اور آخر اسی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ مولوی محب حسین نے بہت پہلے اس نظریہ کے

زہریلے اثرات کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس نظریہ کو حدف کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کوئی ایسی دو علاحدہ قومیں ہیں جو اپنے خون، طرز معاشرت، رسم، عادات اور عقائد میں ایک دوسرے سے مغائر ہیں۔ اگر ان کی معاشرت اور رسم و رواج پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک وسیع قوم کے افراد ہیں جو برائے نام مذہبی اعتبار سے جدا سمجھے جاتے ہیں۔"

اس موضوع پر اس قومی شاعر کے یہ اشعار سنیے ؎

کہنے سے رقیبوں کے محب ہیں بھڑکے — مل جائیں گے پھر، علم و ہنر پڑھ کے
ہندو مسلمان میں تنافر کیوں ہے — ہیں مادر ہند کے یہ دونوں لڑکے
ہندو مسلمان کی بہم ہے خُو بُو — دونوں کی زمین ایک ہے اور ایک ہے جو
کہتے ہیں عرب میں انھیں ہندی بطال — ہے ہند کی نسبت سے مسلمان ہندو
ہے دوستی اہل وطن عزیز ساق — لیکن ہے برادر کے برادر مشتاق
سانیوں سے نہیں کم ہیں محب وہ انسان — جو ہندو و مسلم میں بڑھاتے ہیں نفاق

وہ دو قومی نظریے کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے اس لیے حامی تھے کہ ان کی نظر میں بیرونی سامراجیوں سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ تھا اور انھیں آزادی وطن بہت ہی پیاری تھی چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ہمدردی وطن ہے سب اہل وطن پہ فرض
ہر شخص پر ہے سب سے مقدم ادائے قرض
کہتی ہے طفل سے یہ ولادت کے وقت ارض
کرتی ہوں آج تجھ سے بصد عجز ایک عرض
ہمدردی وطن میں ہر آفت جھیلو
مجھ پر پڑے جو وقت تو پھر جان پہ کھیلو

غیر ملکی حکومت کا دیس نکالا کرنے وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان سب ہی قوم تحریک کا ساتھ دیں اور انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اپنے رسالہ

میں انھوں نے لکھا تھا کہ:۔

"جب نیشنل کانگریس کی اصلی غایت یہ ہے کہ اہل ملک (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) کی شکایتیں گورنمنٹ تک پہنچائی جائیں تاکہ ان کی اصلاح ہو۔ ملک میں پولیٹیکل تعلیم و تربیت کا مذاق پیدا ہو، لوگ اپنے اور گورنمنٹ دونوں کے حقوق سے واقف ہوں..... تو پھر تعجب ہے کہ کیوں مغربی شمالی صوبہ کے بعض سرآوردہ مسلمانوں سے اس کی مخالفت ظاہر ہوئی۔ (یہ اشارہ ہے غالباً سرسید احمد خاں کی مخالفت کی طرف)۔ کیا اپنے حقوق کو دریافت کرنا ان پر بحث کرنا پھر انھیں یادداشت کے طور پر سرکار کی خدمت میں روانہ کرنا کوئی جرم ہے۔"

۱۹۰۷ء میں جب زار روس کے خلاف ایک ایشیائی ملک جاپان کو فتح حاصل ہوئی تو محب حسین نے اپنے اخبار "علم و عمل" میں اس کا خیر مقدم کیا اور یہ لکھا تھا کہ ہندوستان کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محب حسین ایک بلند پایہ قومی شاعر بھی تھے جس کا اندازہ آپ کو ان اشعار سے ہو گیا ہو گا جو اس مضمون میں پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اس دور کی روایتی شاعری سے بالکل مختلف تھی۔ چنانچہ ان کی شاعری کے تعلق سے قاضی عبدالغفار صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "حیدرآباد میں یہ زمانہ ایسی رنگین شاعری کا زمانہ تھا جس پر زیادہ تر لکھنؤ اور دلی کی شاعری کا عکس پڑا تھا۔ لیکن مولوی محب حسین مرحوم نے اس راستہ سے کترا کر اپنا راستہ وہ اختیار کیا جو اب ہمیں نصف صدی کے بعد قومی شاعری اور ادب برائے زندگی اور حقائق نگاری اور جدید ادب کی پہلی منزل تک پہنچاتا ہے۔ آج جس ادب کو ہم "جدید ادب" کہتے ہیں وہ شاعرانہ افکار کے اس ارتقاء کا ایک اعلا درجہ ہے جس کا آغاز دکن میں مولوی محب حسین مرحوم کی شاعری نے کیا تھا۔" قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں:"..... دکن میں شاعری کا یہ مجدد پہلی دفعہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے آزادی وطن کے لیے جان پر کھیلنے اور غلامی کے مقابلہ میں آزادی کا ادعا پیش کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔"

مولوی محب حسین صاحب کی تصانیف :- محب حسین مرحوم نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ان کے کلام کا دیوان ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے "مسدس توحید" بھی لکھا، میڈس ٹیلر کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ (سوانح عمری امیر علی ٹھگ) کے نام سے شائع کیا۔ گانٹلوس کی ناول کا بھی ترجمہ کیا۔ ان کا مشہور ڈرامہ، "وصال حق" تھا۔ تصوف کے موضوع پر تو انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں "گلزار معرفت" "عالم خیال" اور "عالم آخرت" قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف "رقعات محب" ہے جو اپنی شاگردہ افضل النساء خانم کے نام (۷۰) خطوط پر مشتمل ہے۔ جس میں توحید، سزا و جزا اور تصوف کے دوسرے مسائل پر آسان انداز میں بحث کی گئی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ صوفی مشرب ہو گئے تھے۔ آپ نے ایک بزرگ حضرت شاہ محمد صاحب صدیقی خلیفہ حضرت سردار بیگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے ذکر و شغل اور مراقبہ کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔

صوفی مشرب ہونے کے بعد بھی سیاسی اور سماجی مسائل پر مولانا کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ ایک صوفی کی حیثیت سے انھوں نے پردہ کے خلاف قوم کو یہ آخری پیام دیا تھا کہ ؎

پردہ نہ اٹھاؤ غلامی میں رہو گے　　پہنچا دے کوئی جا کے یہ پیغام ہمارا

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ محب حسین مرحوم مرتے دم تک اپنے سماجی اور سیاسی خیالات سے کنارہ کش نہیں ہوئے بلکہ اپنے خیالات کا پرچار نثر کی بجائے اپنے اشعار کے ذریعہ کرتے رہے۔

مولوی محب حسین کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا اور وہ پرانی عیدگاہ کے سامنے ایک پہاڑی پر اپنے روحانی مرشد کے پہلو میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

قاضی صاحب نے قومی صحافت کے اس معمار اول اور مجاہد آزادی کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا۔ "ذرا دیکھیے کہ یہ لکھنے والا اپنے زمانہ سے کس قدر آگے جا رہا تھا؟ آج جب میں سوچتا ہوں کہ حیدرآباد کے سیاسی خاکستر میں چالیس (۴۰)

سال پہلے کوئی ایسی چنگاری بھی موجود تھی تو میرے اس عقیدہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدرت کا نظام زندگی ہمیشہ زمانہ کی خاکستر میں ان چنگاریوں کی حرارت کو محفوظ رکھتا ہے تاکہ اسی حرارت سے پھر کسی وقت شعلے پیدا ہوں۔"

بال کرشنا ہری شافے کر کی گرفتاری ۱۸۹۷ء: بال کرشنا ہری شافے کر (Bal Krishna Hari Shafkar) ایک نامور مرہٹہ انقلابی تھے جو ریاست حیدرآباد کے مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے عوام میں بے حد مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ سنہ ۱۸۹۷ء میں پونا میں مسرس ریانڈ (Ryand) اور ایرسٹ (Ayrest) کے قتل میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ اس باغی کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لیے حکومت بمبئی اور حیدرآباد دونوں کوشاں تھے۔ اور جب مسٹر اسٹیفن سن (Stephenson) نے رائچور میں انھیں گرفتار کیا تو حکومت بمبئی نے حکومت حیدرآباد کو دس ہزار روپیوں کا انعام دیا اور یہ رقم ان مخبروں میں تقسیم کی گئی جنھوں نے حیدرآباد پولیس کو ان کی گرفتاری کے لیے خفیہ رپورٹیں دی تھیں اور ممکنہ مدد کی تھی۔[1]

بال کرشنا نے بغاوت کے پیغام کو پھیلانے اور پولیس کی گرفتاری سے بچنے کے لیے جو مصائب جھیلے اور وہ جس طرح جنگل جنگل پھرے وہ ایک دلچسپ اور پراسرار داستان سے کچھ کم نہیں۔ اس طرح پولیس کے ایک آفیسر اسٹیفن سن (Stephenson) نے ان کے پوشیدہ مقامات کا پتہ لگانے مخبری کا جال بچھانے سینکڑوں روپیوں کی ترغیب دی اور جو دوسرے ہتھکنڈے استعمال کیے وہ بھی ایک جاسوسی ناول کی حمائل ہے۔

بال کرشنا کے بیان کے مطابق جب انھیں اس بات کی اطلاع ملی کہ ان کے بھائی دامودر کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو وہ اپنے ایک دوسرے بھائی کے ساتھ خفیہ

---

1. The Hyderabad State Committee, The Struggle in Hyderabad. Vol - III (1885–1920)

طور پر پہلی اکتوبر ۱۸۹۷ء کو بمبئی چھوڑ دیا اور بائی کلہ (Byculla) اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے اور متماڑ کے لیے ٹکٹ لیا لیکن پولیس کو چکمہ دیتے ناسک ہی پر اتر گئے۔ بھسادل (Bhusawal) میں ایک رات قیام کے بعد ہٹگی (Hutgi) اور گدگ (Guduck) ہوتے ہوئے کپل (جو اس وقت سر سالار جنگ اسٹیٹ کا ایک حصہ تھا) پر اترے لیکن گاؤں میں اس لیے داخل نہ ہوئے کہ وہ کنڑ زبان سے واقف نہ تھے۔ بلکہ قریب کے ایک گھنے جھاڑ کے نیچے رات گزار دی۔ وہاں سے اناگنڈی (Anna gundi) آئے۔ یہاں بھی گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے ایک جھاڑ کے اوپر بسیرا کیا اور بعد میں قریب کی رنگناتھ نامی ایک دیول کو اپنا صدر مقام بنا لیا اور یہاں تین مہینے تک قیام کیا۔ لیکن ان کا زیادہ تر وقت قریب کی پہاڑیوں اور سیوپور (Sue Pur) اور ایوگنی (Augnee) گاؤں میں گزرتا تھا۔ جنگلوں میں اس طرح گھومنے کے دوران کاروار (Karwar) نامی ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ان کا ربط پیدا ہوا۔ ان کی مدد سے وہ کوئی گیارہ مہینوں تک جنگلوں (Sath-Padi Hills) میں روپوش رہے۔ ڈاکوؤں کے اس گروپ کے تین افراد کھانیا (Khania)، سندا (Sunda) اور عبدل (Abdul) نے ان کی کافی مدد کی تھی۔ ان کی گرفتاری سے ایک روز پہلے ان کے یہ تینوں دوست جنگل کے روپوش ٹھکانوں سے نکل کر گدگ (Guduck) اسٹیشن جارہے تھے کہ راستہ میں ان تینوں نے اپنا ڈیرا اٹھایا اور چل پڑے۔ ایک مسلمان شخص جو ادھر سے آرہا تھا، بال کرشنا کو ایک کیمپ میں چلنے کہا اور وہیں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

بال کرشنا کی یہ اچانک اور پر اسرار گرفتاری ریاست کے سی۔آئی۔ڈی آفسر اسٹیفن سن (Stephenson) کے ایک سوچے سمجھے منصوبہ اور گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ کیوں کہ عوام کے ایسے مقبول لیڈر کو جنگلوں میں روپوشی کی حالت میں گرفتار کرنا کوئی آسان اور معمولی کام نہ تھا۔ ان کی گرفتاری کے لیے اناگنڈی، سالار جنگ اسٹیٹ، ضلع گنسگورہ اور اطراف کے علاقوں میں سرکاری اور خانگی خفیہ ایجنٹوں کا جال بچھا دیا اور انھوں نے (۵) مہینے تک (جولائی تا

۱۶ر دسمبر ۱۸۹۶ء) ان علاقوں کا چپہ چپہ چھان مارا اور خود اسٹیفن سن نے بھی انتہائی رازداری اور پوشیدہ طور پر راتوں میں جنگلوں میں گھومتے تھے۔ ان تمام کوششوں کے بعد انھیں یہ اطلاع ملی کہ بال کرشنا یرکل (Yerkula) قبیلے کے ڈاکوؤں کی ٹولی کے ساتھ سات پور (Sath Pura Hills) یا سات پہاڑوں (جو سالار جنگ اسٹیٹ کے علاقہ میں تھے) میں پناہ گزیں ہیں۔ سات پہاڑوں کا یہ سلسلہ اپنے گھنے جنگلوں، پیچیدہ اور ناقابل عبور راستوں اور گہری کھائیوں کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس لیے اس باغی مجاہد کے ٹھیک مقام قیام کا پتہ لگانا بڑی مشکل کا کام تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ راست پولیس یا فوجی کارروائی کے ذریعہ انھیں گرفتار کیا جاسکتا اس لیے پولیس آفیسر نے دوسرے ذرائع اختیار کیے۔ ان افراد سے راست ربط پیدا کیا گیا جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے تعلقات برکل قبیلہ کے ڈاکوؤں سے بہت دوستانہ تھے۔ انھیں چھ سو روپیوں کے انعام کا پیش کش دے کر انھیں گرفتار کروا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بال کرشنا کو یہ باور کرایا گیا کہ پولیس کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر یہ مناسب ہوگا کہ وہ گدک اسٹیشن سے گوا کے لیے راہ فرار اختیار کریں۔ جب وہ رات کے اندھیرے میں اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ گدک اسٹیشن جا رہے تھے تو پو پھٹنے کے وقت پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق راستہ میں ان کا سامنا خفیہ پولیس کے ایک آفیسر سے ہوا۔ یہ دیکھ کر کہ ان کے ڈاکو ساتھی بھاگ گئے ہیں انھیں ایک کیمپ کے قریب گرفتار کر لیا گیا۔ اواخر ۱۸۹۸ء میں ان کی گرفتاری کے بعد ریاست حیدرآباد میں مرہٹہ انقلابیوں کی تحریک ختم ہوگئی۔

باباصاحب عرف راؤصاحب کی ضلع بیڑ میں بغاوت ۱۸۹۸ء:— اس سے پہلے کی دو بغاوتوں کا ذکر کیا جا چکا ہے جو ۱۸۱۸ء اور ۱۸۵۹ء میں ہوئی تھیں اور تقریباً چالیس سال بعد ایک اور بغاوت ۱۸۹۸ء میں ہوئی جس کا ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ بغاوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے سابقہ دو بغاوتوں سے بالکل مختلف تھی۔

سب سے نمایاں بات یہ تھی کہ اس بغاوت کو بیڑ اور اورنگ آباد کے برہمنوں کی بغاوت بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس بغاوت کے نہ صرف اہم لیڈر برہمن تھے۔

بلکہ ضلع بیڑ کے نظم و نسق اور مقامی پولیس کے برہمن ملازمین نے بھی اس میں عملاً حصہ لیا تھا۔ پھر کسی نہ کسی حیثیت سے باغیوں کی مدد کی تھی۔ اس کے برخلاف ریاست کے دوسرے علاقوں کی بغاوتوں کا ملا جلا کردار تھا اور جن میں مختلف مذاہب اور ذات پات کے لوگوں نے حصہ لیا تھا۔

بغاوت کی اس محدود کردار کی بنا پر بغاوت کے لیڈر بابا صاحب کا یہ ادعا تھا کہ بہت جلد برہمنوں کا راج قائم کیا جائے گا جس میں مرہٹوں اور تمام ہندوؤں کو ان کے موجودہ پچھڑے ہوئے اور نچلے درجے سے نکال کر باعزت مقام دیا جائے گا اور ان یوروپین حکمرانوں کا خاتمہ کیا جائے گا جو عوام کو لوٹ رہے ہیں اور گائیوں کی قربانی دے رہے ہیں۔

اس بغاوت کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا دارومدار بڑی حد تک ڈاکوؤں کی اُن ٹولیوں پر تھا جو اس علاقہ میں سرگرم عمل تھیں۔ وہ خود بھی بڑے زمین داروں کو اپنی گرفت میں رکھتے تاکہ ان سے کثیر رقم حاصل کی جا سکے۔ وہ ساہوکاروں اور مسلمانوں سے کبھی کوئی ربط نہیں رکھتے تھے۔ وہ ہر وقت نوجوان برہمنوں کی تلاش میں رہتے اور انھیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیتے۔ انھیں دیسی فوجی رجمنٹ کے عہدہ داروں اور فوجی افسروں سے روابط بڑھانے اور ان کے ذریعہ گھوڑے اور بندوقیں خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ اس پس منظر میں آئیے، اس بغاوت اور باغی لیڈروں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔

اس بغاوت کے لیڈر بابا صاحب تھے جنھیں راؤ صاحب، مہاراجہ، راجہ صاحب، وٹھل چھاٹے، (Chate) اور بلونت جگ دمبار (Balwant Jagdamba) کے ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جنوبی مرہٹہ علاقہ کے سردار (Sirdar) خاندان میں ملازم تھے اور کچھ دنوں تک گوالیار کے آس پاس کے علاقوں میں رہا کرتے تھے۔ وہ انگریزی، اردو، مرہٹی اور کنڑی زبانوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

۱۸۹۸ء میں وہ حیدرآباد آئے تاکہ انگریزوں کو دیس سے نکال باہر کرنے کے لیے ہتھیار بند لڑائی اور بغاوت کا پلان تیار کریں۔ حکومت حیدرآباد کے دو

ملازمین کشن راؤ اور داجی صاحب اور گاؤں کے ایک عہدہ دار بابو راؤ نرسنگ نے ان کے قیام کے لیے نہ صرف ہر قسم کی سہولتیں پہنچائیں بلکہ وہ عثمان آباد میں گئے تاکہ وہاں بابا صاحب کی تائید اور تعاون کے لیے فضا ہموار کر سکیں۔ بابا صاحب بیڑ گئے جہاں وہ ضلع آفس کے ایک کلرک کے یہاں ٹھہرے۔ انھوں نے بیڑ اور اورنگ آباد کے رہنے والوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہمنوا بنالیا اور کنٹنجنٹ فوج کے سپاہیوں کو (جو مومن آباد اور اورنگ آباد کی چھاؤنیوں میں رہتے تھے) ورغلانے اور بھڑکانے کی ممکنہ کوشش کی۔ اس کے علاوہ ڈاکوؤں کی ٹولی کی مدد سے بیڑ کے مختلف مقامات پر دھاوے ڈال کر کثیر رقم جمع کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ حکومت کو یہ ڈر تھا کہ مرہٹواڑہ کے دوسرے مقامات پر برہمنوں اور فوجوں میں شامل برہمنوں میں کہیں یہ "دبا" پھیل نہ جائے۔ اوائل نومبر ۱۸۹۸ء میں جب وہ حیدرآباد سے بیڑ پہنچے تو اُن کے ساتھ دو سکھ تھے۔ بیڑ پہنچ کر انھوں نے اپنے ان سکھ ملازموں کو حکم دیا کہ وہ بیڑ میں رہنے والے سکھوں سے ربط پیدا کریں اور بابا صاحب ایک مقامی مندر میں گئے دوسرے دن دفتر محافظی کے ایک ملازم زنگ راؤ کولیا (Kowlia) کے گھر گئے۔ اس کے ذریعہ ایک اور مقامی برہمن سیور ڈسان کر مڈولکر (Sewrao sankar Madulkar) عرف کاکا (Kaka) کے گھر میں اپنے قیام کا انتظام کیا۔

اپنے قیام کا بندوبست ہو جانے کے بعد بابا صاحب نے اپنے طے شدہ پلان پر عمل کرنا شروع کیا۔ ان کا پہلا قدم یہ تھا کہ بیڑ کے تمام سرآوردہ برہمنوں کو کھانے پر مدعو کیا جائے جس میں برہمن ملازم سرکار بھی شامل تھے۔ کھانے ختم ہوتے کے بعد مکان کی پہلی منزل پر (جہاں بابا صاحب رہتے تھے) تمام لوگ جمع ہوئے جنھیں مقامی روایات کے مطابق "پان سپاری" پیش کیے گئے اور کوئی ڈھائی گھنٹوں تک ان برہمنوں کے صلاح و مشورہ کا سلسلہ جاری رہا۔

ایسے مشاورتی جلسوں کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔ ان جلسوں میں بابا صاحب کے خطوط سنائے جاتے جن میں یہ لکھا ہوتا کہ "میری فوج تیار ہے تم اپنی فوج تیار کرو۔ روپے بھیجو"

بابا صاحب اپنی انقلابی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اکثر امبا، اورنگ آباد، پربلی،

ساریا اور دوسرے مقامات کو جایا کرتے تھے لیکن بیڑ اور اورنگ آباد ان کی بغاوت کے مرکز تھے۔

اس دوران جے پور، نیپال، گجرات، لکھنؤ، افغانستان، کشمیر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ برٹش رجمنٹ کے کئی فوجی افسروں کے خطوط بھی آیا کرتے تھے۔ جن میں یہ یقین دلایا جاتا کہ وہ باباصاحب کے اعلا مقاصد کی تائید کرتے ہیں اور کسی بھی وقت مدد کے لیے تیار ہیں۔ مختلف مقامات سے آئے ہوئے خطوط کا بابا صاحب یہ جواب دیتے کہ وہ تین مہینے اور انتظار کریں۔ انھیں جلد ہدایات اور روپے روانہ کیے جائیں گے۔ فوجی افسروں کو یہ لکھا جاتا تھا کہ "تیار رہو"، جب میں اپنا جھنڈا اور روپے بھیجوں گا اسی وقت حرکت میں آنا۔"

ان حالات کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ باباصاحب بھی اپنی طرف سے کچھ تیاریاں شروع کردیں۔ برہمنوں کی ایک میٹنگ میں انھوں نے یہ تجویز رکھا کہ جھنڈے، یونیفارم اور چاندی کے کمر پٹے (Silver Waist Plates) تیار کیے جائیں۔ چنانچہ یونیفارم کے پچیس (۲۵) سوٹ بنائے گئے۔

سنار کے ذریعہ چاندی کے کمر پٹے تیار کیے گئے جس پر سنسکرت میں یہ لکھا تھا کہ "ہماری تمام مساعی کامیاب ہوں گی۔"

برہمنوں کی ایک اور میٹنگ میں انھوں نے سربرآوردہ افراد میں نیزے، پرانی بندوقیں اور تلواریں تقسیم کیں۔ غالباً ہتھیار اور گولہ بارود اورنگ آباد سے لائے جاتے تھے۔ اکثر جلسوں میں وہ اس بات پر زور دیتے کہ کوئی بھی طریقہ اختیار کر کے روپے اکٹھے کیے جائیں اور یہ بھی یقین دلاتے کہ برہمنوں کا راج قائم ہو جانے کے بعد انھیں جاگیریں عطا کی جائیں گی۔ بیڑ اور اطراف و اکناف کے گاؤں میں لوٹ مار کی وارداتیں بڑھتی جارہی تھیں اس لیے یہاں کے مہتمم پولیس نے اپنی جمیعت کی مدد سے باغیوں کی ٹکڑیوں کے خلاف کاروائی شروع کر دی۔ چنانچہ مہتمم صاحب ۱۲ر مارچ ۱۸۹۹ء کو دو سواروں اور (۱۸) جوانوں کے ساتھ ڈاکن موہی (Mohi) پہنچے، جب باغیوں کو اس کا علم ہوا تو وہ دوسرے گاؤں میں چلے گئے اور لاپتہ ہو گئے۔

یکم اپریل ۱۸۹۹ء کو پولیس کے دو نوجوانوں محمد حنیف اور گوپال راؤ کو چھان بین کرنے اور حالات معلوم کرنے کے لیے دیو گاؤں بھیجا گیا۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو عوام نے انھیں گھیر لیا اور پکڑ کر چارپائی پر باندھ دیا۔ اس حالت میں انھیں باغیوں کے کیمپ میں لایا گیا۔ باغی لیڈر موتگیا (Mongia) نے حکم دیا کہ محمد حنیف کے کان کاٹ دیے جائیں۔ حنیف نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ جب اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اپنی تلوار سے باغیوں کو گھائل کیا لیکن باغیوں کی بڑی تعداد نے اس پر غلبہ پالیا۔ اس کے برخلاف گوپال راؤ برہمن نے ہاتھ پاؤں پڑ کر کسی طرح چھٹکارا حاصل کرلیا۔ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مہتمم پولیس نے ۱۹ سکھوں، ۴ جوانوں ایک جمعدار اور دو سواروں کی جمعیت لے کر پھر ایک بار باغیوں پر حملہ آور ہوا۔ دونوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں اور بندوقیں چلیں۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ باغیوں کے تعلق سے بیڑ کے تعلقدار کا رویہ بہت ہی نرم اور غیر یقینی تھا اس لیے مہتمم پولیس کوئی سخت اور فیصلہ کن قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

بالآخر حکومت کی جانب سے بیڑ کے بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لیے ذیل کی تجاویز پیش کی گئیں۔

(۱) بیڑ کے ایک گاؤں ڈھونڈی پورہ (Dhondee Pura) میں تین سال کے لیے تفریری پولیس فورس (Punctive Police Force) متعین کی جائے جو ایک جمعدار، دو عدد اور (۱۲) جوانوں پر مشتمل ہوگی۔ اس گاؤں کو اس لیے چنا گیا کہ یہاں بڑی تعداد میں برہمن بستے تھے۔ پولیس کی اس جمعیت کے جو اخراجات ہوں گے وہ صرف برہمنوں سے وصول کیے جائیں۔

(۲) تمام برہمن وکیلوں کی سندوں کو دو سال کے لیے معطل (Suspended) رکھا جائے۔

(۳) بیڑ کے لوکل فنڈ اور میونسپل کمیٹیوں سے برہمنوں کے ناموں کو خارج کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا اقدامات ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ یہ بھی طے کیا گیا کہ وہاں کے باغیوں کی سرگرمیوں پر سخت نگرانی رکھی جائے۔ اس طرح بابا صاحب کی بغاوت اختتام کو

پہنچی ۔

باباصاحب کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کے حالات :۔

(۱) سیوراؤسان کرمڈلکر عرف کاکا :۔ کرڈ برہمن تھے اور دھاروار کے رہنے والے جنھوں نے بعد میں بیڑ میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ باباصاحب کے بعد دوسرے اہم لیڈر تھے۔ بیڑ پہنچنے کے بعد باباصاحب کا قیام ان ہی کے گھر میں تھا۔ وہ باباصاحب کی تمام باغی سرگرمیوں کو منظم اور مربوط کرتے، بغاوت کے تعلق سے بیڑ کے برہمنوں کی ہر میٹنگ کاکا صاحب کے گھر پر ہوتی، ان کی موجودگی میں تمام اہم فیصلے کیے جاتے اور آئندہ کی سرگرمیوں کا پلان بنایا جاتا، وہ فوجیوں کو اکٹھا کرنے کے اہم کام میں بھی باباصاحب کی مدد کرتے تاکہ برہمن راج کا قیام جلد ممکن ہوسکے۔ ملک کے مختلف گوشوں سے اور اہم افراد کے جو خطوط وصول ہوتے اور ان کے جوابات دینے کا مرکز بھی کاکا صاحب کا گھر تھا۔ مختصر یہ کہ ضلع بیڑ میں بغاوتوں اور سازشوں کا جو جال بچھایا گیا تھا ان کے پیچھے باباصاحب اور کاکا صاحب کا ہاتھ تھا۔

(۲) رنگ راؤ :۔ وہ حیدرآباد میں محکمہ کروڑگیری میں ملازم تھے اور ضلع نل درگ کے ایک گاؤں کلم (Kalam) کے رہنے والے تھے۔ ان کا قیام رزیڈنسی کے قریب کسی مکان میں تھا۔ جب باباصاحب حیدرآباد سے بیڑ پہنچے تو سب سے پہلے رنگ راؤ سے ملے اور ان کے توسط سے کاکا صاحب اور دوسرے برہمنوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس طرح وہ باباصاحب کے شریک کار ہوگئے۔

(۳) کشن راؤ :۔ وہ حیدرآباد میں محکمہ کورٹ آف وارڈ میں ملازم تھے۔ جب ان کی ملاقات حیدرآباد میں باپوراؤ نرسنگ سے ہوئی تو انھوں نے یہ بتلایا کہ راؤ صاحب (باباصاحب) نامی ایک شخص آیا ہوا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ہتھیار خریدنے میں اس کی مدد کی جائے تاکہ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کی تیاری کی جائے۔ کشن راؤ نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ نرسنگ راؤ کے گاؤں بوبلی کے قریب ڈاکوؤں کا جو گروہ رہتا ہے اس سے ربط پیدا کیا

کیا جائے تاکہ وہ بابا صاحب کی مدد کرسکیں۔ کچھ دنوں بعد کشن راؤ اور رنگ راؤ، نرسنگ کے گاؤں گئے اور وہاں ڈاکوؤں کے سردار سے ربط پیدا کیا، روپے دیے اور اسے بابا صاحب کی مدد کرنے پر آمادہ کیا۔ ملازم سرکار ہونے کے باوجود وہ بابا صاحب کی خفیہ طور پر مدد کرتے، ان کے مقصد کو آگے بڑھانے کی ممکنہ کوشش کی۔

(۴) باپوراؤ نرسنگ :۔ ان کا تعلق پوپلی (تعلقہ تلجاپور، ضلع نل درگ) کے ایک برہمن خاندان سے تھا۔ ان کے والد اس گاؤں کے پٹواری تھے۔ کشن راؤ کے کہنے پر انھوں نے اپنے گاؤں کے ڈاکوؤں کی ایک ٹولی سے ربط پیدا کیا اور انھیں بابا صاحب کی مدد کرنے پر آمادہ کیا۔ خود بابا صاحب سے ملنے اورنگ آباد گئے۔ بابا صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ انھوں نے کیا بندوبست کیا ہے اور وہ کس طرح ان کی مدد کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیکاڈیز (Kykadees) قبیلے کے ایک سو آدمیوں کو بھرتی کرا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں معقول رقم بطور اڈوانس دی جائے۔ اس بارے میں بابا صاحب نے انھیں ایک چھٹی دی اور بیڑ جاکر کاکا صاحب سے ملنے کہا۔ بیڑ میں کاکا صاحب سے ملاقات کے بعد انھوں نے تین بندوق (Muzzle loader) اور ایک بلنڈر بز (Blunder Buss) دیا۔ جب وہ دوبارہ اورنگ آباد گئے تو انھیں کارتوس کے تین چھوٹے ڈبے دیے گئے۔ دوران گفتگو بابا صاحب نے کہا کہ دولت آباد قلعہ کے پاس پرانی بارود کا ذخیرہ ہے اگر اس میں برانڈی (شراب) ملادی جائے تو وہ پھر استعمال کے قابل ہوسکتی ہے۔ آخری دنوں میں ان کا بابا صاحب سے جھگڑا ہوگیا اس لیے وہ حیدرآباد واپس آکر پوسٹ آفس میں منشی کی خدمت پر مامور ہوگئے۔

(۵) ڈھونڈی :۔ دیوگاؤں (Dew gaon) کے پٹیل تھے ان کے والد کا نام ایٹھویا تھا۔ کاکا کے گھر میں ان کی ملاقات ''گرو'' یعنی بابا صاحب سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس علاقہ کے ڈاکو قبیلے کے سردار تھے۔ اس لیے ان کے ذمہ نوجوانوں کو بھرتی کرانے اور بغاوت کو جاری رکھنے روپیوں کی فراہمی کا کام سپرد کیا تھا۔ اس لیے وہ عام طور پر مختلف مقامات کا دورہ کرتے اور جب کبھی بیڑ آتے، روپوش رہتے۔ اپنے فرائض انجام دینے کا کا نے

انھیں بندوق، تلوار اور دوسرے ہتھیار دیے تھے۔ وہ اس بغاوت کے ایک فعال اور اہم رکن تھے۔

(۶) **باپوراؤ نرسمہوا :-** وہ ضلع درگ کے ایک گاؤں پوپلی کے رہنے والے تھے۔ انھیں بابا صاحب کے بارے میں پہلی بار رنگ راؤ نے یہ بتلایا کہ وہ ایک باغی لیڈر ہیں اور اورنگ آباد میں مقیم ہیں۔ وہ رنگ راؤ اور کشن راؤ (جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اورنگ آباد آئے۔ بابا صاحب سے ملاقات ہوتے ہی انھوں نے رنگ راؤ سے دریافت کیا کیا انتظامات ہوئے ہیں۔ اس مسئلہ پر کچھ دیر گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ داجی ہتھیاروں سے لیس دو ہزار سپاہی فراہم کرے اور راؤ صاحب (بابا صاحب) انھیں دس ہزار روپے دیں گے۔ رقم حاصل کرنے بابا صاحب نے کاکا کے نام ایک چٹھی دی جس میں ہتھیار دینے کے لیے بھی کہا گیا تھا۔ لیکن کاکا نے صرف تین بندوق اور کچھ معمولی ہتھیار دیے اور پھر اورنگ آباد جاتے کہا۔ جب وہ اورنگ آباد سے روانہ ہونے والے تھے تو بابا نے گن کیاپس (Gun-Caps) کے تین صندوق دیے اور ڈھونڈی پہنچانے کے لیے کہا۔ جو انھیں پہنچا دیے گئے۔

بابا صاحب کی بغاوت میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے اصحاب کے نام

(۱)- شاجی۔	:-	دیو گاؤں کے رہنے والے بغاوت میں اعانت کی۔	سزا کا علم نہ ہو سکا۔
(۲)- ڈھونڈی دیری گنت	:-	〃 〃	〃
(۳)- چندیا (ہریجن)	:-	〃 〃	〃
(۴)- جیوتا ولد شاجی	:-	〃 〃	حراست میں رکھا گیا۔
(۵)- باپوراؤ ولد اباجی پٹیل	:-	مانگ کا رہنے والا بغاوت میں اعانت کی	〃
(۶)- دھوریا ولد گوپلیا (ہریجن)	:-	〃 〃	〃
(۷)- مہادیو سنگھ ولد گوما سنگھ	:-	〃 〃	سزا کا علم نہ ہو سکا۔
(۸)- شاہ جی ولد ہیراجی	:-	〃 〃	〃
(۹)- پانڈو ولد ہنمنتیا	:-	دیو گاؤں کا رہنے والا 〃	حراست میں رکھا گیا۔

(۱۰)۔ ایکناتھ ولد مالو :-	دیوگاؤں کا رہنے والا	حراست میں رکھا گیا۔
(۱۱)۔ ڈھونڈی پیلی ولد پاریا:-	〃 〃	〃
(۱۲)۔ نارائن ولد باپوسنار :-	بغاوت میں اعانت کی	سزا کا علم نہ ہو سکا۔
(۱۳)۔ گوبند راؤ وکیل :-	〃	〃
(۱۴)۔ کاسی باپٹیل وکیل :-	〃	〃
(۱۵)۔ گوبند راؤ چاپکر وکیل :-	〃	〃
(۱۶)۔ کشن راؤ وکیل :-	〃	〃
(۱۷)۔ واسدیو ترے کر وکیل:-	〃	〃

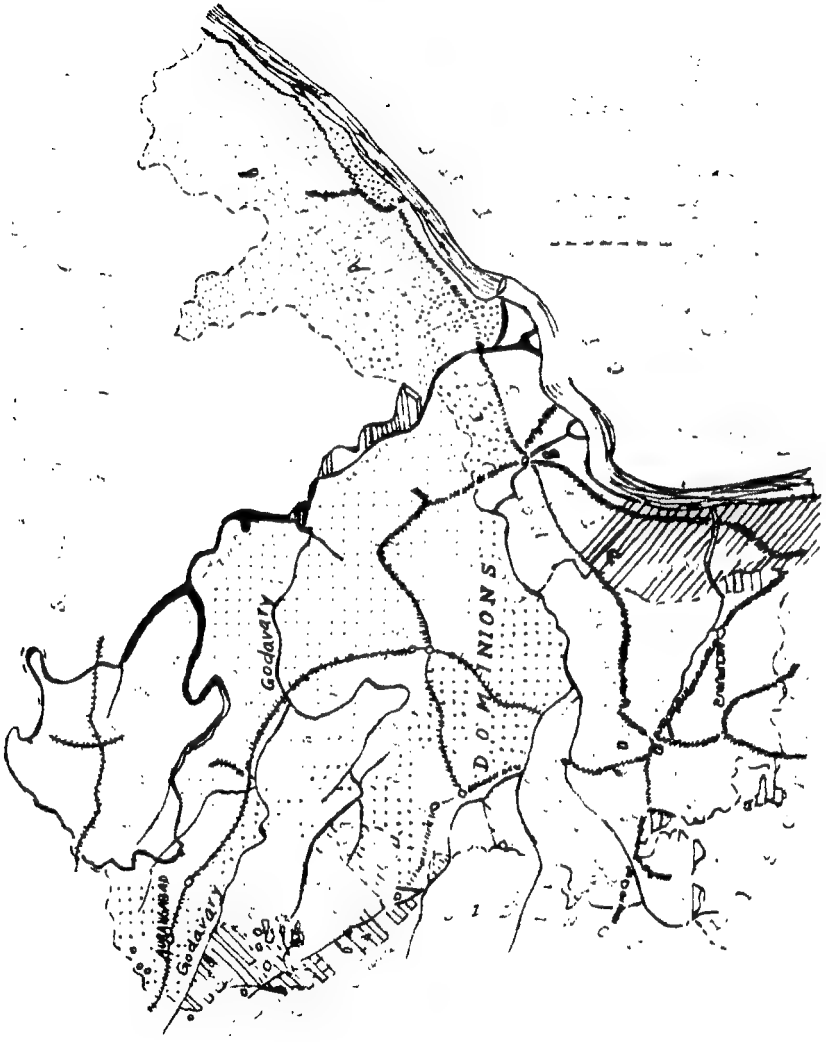
Godavary
D O M I N I O N S
Godavari

ضمیمہ (الف)

۱۔ آصف جاہی خاندان ـــــ ۱۷۲۴ـ۱۹۴۸ء

نشان سلسلہ	نام	خطاب	دور حکومت
۱	میر قمر الدین	آصف جاہ اول	۱۷۲۴ ـــــ ۱۷۴۸ء
۲	میر احمد خاں	ناصر جنگ	۱۷۴۸ ـــــ ۱۷۵۰ء
۳	ہدایت محی الدین خاں	مظفر جنگ	۱۷۵۰ ـــــ ۱۷۵۱ء
۴	سید محمد خاں	صلابت جنگ	۱۷۵۱ ـــــ ۱۷۶۲ء
۵	میر نظام علی خاں	آصف جاہ دوم	۱۷۶۲ ـــــ ۱۸۰۳ء
۶	میر اکبر علی خاں	سکندر جاہ آصف جاہ سوم	۱۸۰۳ ـــــ ۱۸۲۹ء
۷	میر فرخندہ علی خاں	ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم	۱۸۲۹ ـــــ ۱۸۵۷ء
۸	میر تہنیت علی خاں	افضل الدولہ آصف جاہ پنجم	۱۸۵۷ ـــــ ۱۸۶۹ء
۹	میر محبوب علی خاں	آصف جاہ ششم	۱۸۶۹ ـــــ ۱۹۱۱ء
۱۰	میر عثمان علی خاں	آصف جاہ ہفتم	۱۹۱۱ ـــــ ۱۹۴۸ء

۲۔ حیدر آباد کے دیوان ـــــ ۱۷۸۱ـ۱۹۱۴ء

۱	غلام سید خاں	ارسطو جاہ	۱۷۸۱ ـــــ ۱۸۰۴ء
۲	راجہ رگھوتم راؤ		۱۸۰۴
۳	میر ابو القاسم،	میر عالم	۱۸۰۴ ـــــ ۱۸۰۸ء

۴-	بدیع الزماں خاں	منیر الملک	۱۸۰۸ء	۱۸۳۲ء
۵-	راجہ چندو لعل		۱۸۳۲ء -	۱۸۴۳ء
۶-	راجہ رام بخش		۱۸۴۳ء -	۱۸۴۶ء
۷-	میر عالم علی خاں	سراج الملک	۱۸۴۶ء	۱۸۴۸ء
۸-	محمد امجد علی خاں	سیف جنگ، امجد الدولہ	۱۸۴۸	
۹-	محمد فخر الدین خاں	شمس الامراء (دوم) امیر کبیر (اول)	۱۸۴۹	
۱۰-	راجہ رام بخش		۱۸۴۹ء	۱۸۵۰ء
۱۱-	راجہ گنیش راؤ		۱۸۵۱	
۱۲-	میر عالم علی خاں	سراج الملک	۱۸۵۱ء	۱۸۵۳ء
۱۳-	میر تراب علی خاں	مختار الملک، سر سالار جنگ	۱۸۵۳	۱۸۸۳ء
۱۴-	راجہ نریندر بہادر		۱۸۸۳ء	۱۸۸۴ء
۱۵-	میر لائق علی خاں	سالار جنگ، دوم	۱۸۸۴ء	۱۸۸۶ء
۱۶-	مظہر الدین خاں	بشیر الدولہ، آسمان جاہ	۱۸۸۷ء	۱۸۹۳ء
۱۷-	فضل الدین خاں	اقبال الدولہ وقار الامراء	۱۸۹۳	۱۹۰۱ء
۱۸-	مہاراجہ کشن پرشاد		۱۹۰۱	۱۹۱۲ء
۱۹-	میر یوسف علی خاں	سالار جنگ، سوم	۱۹۱۲	۱۹۱۴ء

۳- حیدر آباد کے وزراء ۱۸۶۹ء — ۱۸۸۳ء

(۱) ۱۸۶۹ء — ۱۸۸۴ء

نشان سلسلہ	نام	عہدہ	محکمہ
۱-	میر تراب علی خاں، سر سالار جنگ اول	دیوان (مدار المہام)	
۲-	میر مہدی علی خاں، شمشیر جنگ	صدر المہام	پولیس
۳-	محمد مظہر الدین خاں، بشیر الدولہ	” ”	عدالت

۴۔ میر یاور علی خاں، شہاب جنگ	صدر المہام	متفرق
۵۔ پرورش علی خاں، مکرم الدولہ	" "	مال

(۲) ۱۸۸۲ـــــ۱۸۸۳

۱۔ میر تراب علی خاں، سر سالار جنگ اول	دیوان (مدار المہام)	
۲۔ میر مہدی علی خاں، شمشیر جنگ	صدر المہام	پولیس
۳۔ محمد مظہر الدین خاں، بشیر الدولہ	" "	عدالت
۴۔ میر یاور علی خاں، شہاب جنگ	" "	متفرق

اردو اخبارات ورسائل کی فہرست

۱۸۵۵ء ——— ۱۹۰۰ء

شمار	نام اخبار/رسالہ	نوعیت	ایڈیٹر	سنہ اجرائی
۱	رسالہ طبی	ماہ نامہ	جارج اسمتھ	۱۸۵۵ء ۱۸۵۹ء
۲	آفتاب دکن	روزنامہ	قاضی محمد قطب	۱۸۶۰ء
۳	مخزن الفوائد	ماہ نامہ	سید حسین بلگرامی (عماد الملک)	۱۸۷۴ء
۴	آصف الاخبار	ہفتہ وار	نارائن راؤ	۱۸۷۴ء ۱۸۷۸ء
۵	رسالہ مقنن دکن	ماہ نامہ	نارائن سوامی	۱۸۷۸ء
۶	ادیب	〃 〃	عبدالقیوم	۱۸۸۰ء
۷	شفیق	ہفتہ وار	سید حسین رضوی	۱۸۸۰ء
۸	معلم شفیق	ماہ نامہ	محب حسین	۱۸۸۲ء
۹	شوکت الاسلام	ہفتہ وار	جامی کرمانی	۱۸۸۲ء ۱۸۸۳ء
۱۰	ہزار داستان	ہفتہ وار	محمد سلطان عاقل	۱۸۸۳ء
	بعد میں روزنامہ میں تبدیل ہوا			
۱۱	فتون	ماہ نامہ	مشتاق احمد	۱۸۸۳ء
۱۲	ارم دکن	〃 〃	سید احمد نذیر	۱۸۸۳ء ۱۸۸۳ء
۱۳	داستان سیاح	〃 〃	سید ابراہیم عفو	۱۸۸۳ء
۱۴	مذاق سخن	〃 〃	مشتاق احمد	۱۸۸۳ء
۱۵	گلدستہ مشتاق	〃 〃	〃 〃	۱۸۸۳ء
۱۶	رفیق دکن	〃 〃	عزیز الدین	۱۸۸۴ء ۱۸۹۱ء
۱۷	پیک آصفی	روزنامہ	سید حسین	۱۸۸۵ء

۱۸- اخبار آصفی	ہفت روزہ	محمد سید سلطان عاقل	۱۸۸۵ء
۱۹- جوہر سخن	ماہ نامہ	عبداللہ خاں	۱۸۸۵ء
۲۰- دکن پنچ	ہفتہ وار	کشن راؤ	۱۸۸۷ء
۲۱- افسر الاخبار	〃 〃	مشتاق احمد	۱۸۸۷ء
۲۲- خیال محبوب	〃 〃	عبدالسلام عرشی	۱۸۸۷ء
۲۳- گل و بلبل	ماہ نامہ	الطاف حسین قابل	۱۸۸۷ء
۲۴- سفیر دکن	روزنامہ	سید امجد علی اشہری	۱۸۸۸ء
۲۵- حسن	ماہ نامہ	حسن بن عبداللہ (عماد نواز جنگ)	۱۸۸۸ء
۲۶- محبوب القلوب	ہفتہ وار	عبدالسلام	۱۸۸۸ء
۲۷- معلم نسواں	ماہ نامہ	محب حسین	۱۸۹۲ء
۲۸- آئین دکن	(قانونی رسالہ اورنگ آباد سے نکلتا تھا)	فدا حسین	۱۸۹۲ء
۲۹- سحر بیان	ماہ نامہ	مجیب احمد تمنائی	۱۸۹۲ء
۳۰- ملک و ملت	ہفتہ وار	سید احمد ناطق	۱۸۹۵ء
۳۱- منتخب روزگار	ماہ نامہ	سید علی رضا	۱۸۹۵ء
۳۲- نظارہ عالم	ہفتہ وار	سید احمد ناطق	۱۸۹۶ء
۳۳- افسر	ماہ نامہ	محب حسین اور عبدالحق	۱۸۹۶ء
۳۴- دل گداز	〃 〃	عبدالحلیم شرر	۱۸۹۷ء
۳۵- دبدبہ آصفی	〃 〃	رتن ناتھ سرشار	۱۸۹۷ء
۳۶- پیام محبوب	〃 〃	غلام حسین دار	۱۸۹۷ء
۳۷- شمس الکلام	〃 〃	سید سلمان	۱۸۹۷ء
۳۸- میڈیکل جنرل	〃 〃	لقمان الدولہ	۱۸۹۸ء
۳۹- جلوہ محبوب	〃 〃	غلام صمدانی گوہر	۱۸۹۸ء
۴۰- محبوب الکلام	〃 〃	جلیل حسن (فصاحت جنگ)	۱۸۹۸ء
۴۱- مشیر دکن	روزنامہ	پنڈت کشن راؤ	۱۸۹۸ء
۴۲- سفیر دکن	ماہ نامہ	امجد علی اشہری	۱۸۹۹ء

اہم تاریخی واقعات

۱۷۶۱ء ——— ۱۸۸۴ء

نمبر شمار	سن	تاریخ
۱-	۱۷۶۱ء	نظام علی خان کا تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ آباد سے حیدرآباد کو اپنا دارالسلطنت منتقل کیا۔
۲-	۱۷۶۹ء	میسور کی پہلی جنگ :- حیدر علی والیٔ میسور کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرہٹوں اور نظام سے سمجھوتہ کر کے میسور پر حملہ کر دیا لیکن حیدر علی نے اپنی کامیاب حکمت عملی کی بدولت مرہٹوں اور نظام کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور انگریزوں کو ۱۷۶۹ء کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔
۳-	۱۷۸۰ء	میسور کی دوسری جنگ :- مرہٹوں نے حیدر علی کے خلاف جنگ شروع کی۔ اور ۱۷۶۹ء کے معاہدہ کے مطابق انگریزوں سے مدد مانگی لیکن انگریزوں نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔
۴-	۱۷۸۲ء دسمبر	حیدر علی کا بعارضہ کینسر انتقال ہوا۔
۵-	۱۷۹۰ء جنوری ۱۲۰۳ھ	میسور کی تیسری جنگ :- کمپنی سرکار نے نظام اور مرہٹوں کا تعاون حاصل کر کے ٹیپو سلطان سے دغابازی کی اور حملہ کر دیا۔ اس جنگ کے نتیجہ کے طور پر ٹیپو کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ کمپنی سرکار نے بڑا حصہ خود ہڑپ کر لیا اور باقی حصہ کو نظام اور مرہٹوں میں تقسیم کیا۔

۶- ۱۷۹۵ء / ۱۲۰۹ھ — ۱۱ر مارچ / ۱۹ر شعبان — نظام اور مرہٹوں کے درمیان بمقام کھرڈلہ جنگ ہوئی، انگریزوں نے نظام کو مدد کرنے سے انکار کردیا۔ اس لیے نظام کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۷- ۱۷۹۵ء / ۱۲۰۹ھ — عالی جاہ نے بغاوت کی۔

۸- ۱۷۹۹ء — ۵ر مئی / ۲۹ر ذیقعدہ — میسور کی چوتھی جنگ :— ٹیپو سلطان نے معاہدہ معاونت پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور ماریشش کے گورنر سے ٹیپو کے بڑھتے ہوئے تعلقات کمپنی سرکار کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہے تھے۔ اس لیے میسور پر حملہ کردیا گیا۔ نظام سرکار نے انگریزوں کی فوجی امداد کی۔ اس جنگ میں ٹیپو سلطان شہید ہوئے اور میسور کو تقسیم کردیا گیا۔

۹- ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ — ۶ر اگست / ۱۷ر ربیع الثانی — آصف جاہ ثانی نظام علی خاں کا انتقال ہوا اور سکندر جاہ آصف جاہ ثالث تخت نشین ہوئے۔

۱۰- ۱۸۰۴ء / ۱۲۱۹ھ — ۹ر مئی / ۲۸ر محرم — ارسطو جاہ کا انتقال ہوا۔

۱۱- " — ۱۳ر جولائی / ۴ر ربیع الثانی — میر عالم کو دیوان بنایا گیا۔

۱۲- " — راجہ مہی پت رام نے انگریزوں کی مخالفت شروع کردی۔

۱۳- ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ — نورالامراء کی بغاوت

۱۴- " — راجہ راؤ رمبا نمبالکر کی بغاوت

۱۵- " — ۲۴ر اپریل / ۴ر صفر — کمپنی سرکار نے میر عالم کے مشورہ پر مہی پت رام کو شہر بدر کردیا۔

۱۶- " — ۱۸ر دسمبر / ۷ر شوال — مہی پت رام کے عہدہ پر گوبند بخش کا تقرر کیا گیا۔

۱۷- ۱۸۰۷ء / ۱۲۲۱ھ — مہی پت رام نے پہلی لڑائی میں انگریز فوج کو شکست دی لیکن دوسری لڑائی میں وہ کثیر فوج کا مقابلہ نہ کرسکے اس لیے انھوں نے ہولکر کے ہاں پناہ لینا مناسب سمجھا۔

۱۸- ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ — ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج جو سکندرآباد میں مقیم تھی اس نے بغاوت کردی۔

۱۹-	۱۸۰۹ء ۱۲۲۴ھ	۲۸ اگست ۱۵ رجب	منیر الملک دیوان بنائے گئے اور خلعت عطا کی گئی۔
۲۰-	۱۸۱۵ء ۱۲۳۰ھ	۲۸ اگست ۱۴ رمضان	مبارز الدولہ کا درزی کے مسئلہ پر انگریزوں سے جھگڑا ہوا۔ انگریزی فوج نے موصوف کی ڈیوڑھی کا محاصرہ کر لیا، گولہ باری کی گئی۔ جنگ میں مبارز الدولہ کی تیر سے ایک انگریز سپاہی مارا گیا۔ انھوں نے خاطیوں کو رزیڈنسی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔
۲۱-	"	۳۰ اگست ۱۶ رمضان	مبارز الدولہ کو پہلی مرتبہ قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا۔
۲۱-	۱۸۱۷ء ۱۲۳۳ھ	۱۲ نومبر ۲ محرم	پیشوا باجی راؤ اور اپاجی راؤ راجہ ناگپور سے مقابلہ کے لیے انگریزوں نے نظام سے مدد مانگی اور نظام نے صلابت خاں جمعدار کے تحت فوج روانہ کی۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ پونہ میں ہوا۔ مگر نظام کی فوج کمانڈر سردار خان کرنے زائی نے انگریزوں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی جاگیر چلا گیا۔ انگریزوں نے اس کا تعاقب بھی کیا بعد میں وہ پونا میں پیشوا کا ملازم ہو گیا۔ پیشوا باجی راؤ ستارہ چلا گیا۔
۲۳-	۱۸۱۷ء ۱۲۳۳ھ	۲ دسمبر ۲۳ محرم	کمپنی سرکار نے پونہ فتح کر لیا۔
۲۴-	۱۸۱۸ء ۱۲۳۴ء		فتح محمد جنگ خاں جمعدار انگریزوں کے مخالف ہو گئے۔ انھیں اورنگ آباد بھیج دیا گیا جہاں ان کا ۱۸۱۹ء / ۱۲۳۵ھ میں انتقال ہوا۔
۲۵-	۱۸۲۹ء ۱۲۴۴ھ	۲۱ مئی ۱۷ ذی قعدہ	سکندر جاہ کا انتقال
	"	۲۴ مئی ۱ ذی قعدہ	ناصر الدولہ مسند نشین ہوئے۔
۲۶-	۱۸۳۰ء ۱۲۴۵ھ		مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی کا ایک بار پھر محاصرہ کیا گیا اور قلعہ میں دوسری بار نظر بند کر دیا گیا۔ عوام نے ... کے خلاف

غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انگریز فوج کو قلعہ کی نگرانی سے ہٹادیا گیا۔

۲۷- ۱۸۳۱ء / ۱۲۴۷ھ — ۲۸ اکتوبر — مبارز الدولہ کو رہا کردیا گیا۔ وہ سرخ عماری میں قلعہ گولکنڈہ سے اپنی ڈیوڑھی تک آئے۔ عوام نے پورے جوش وخروش سے ان کا استقبال کیا۔

۲۸- 〃 〃 — محمد صلابت خاں اور محمد فتح جنگ خاں جمعدار جنھوں نے انگریزوں کی مخالفت کی تھی ان کی فوج کو انگریز افسروں نے اپنے تحت کرکے الوال کی فوج میں شامل کردیا۔

۲۹- ۱۸۳۲ء / ۱۲۴۸ھ — ۷ شعبان — دیوان منیر الملک کا انتقال۔

۳۰- ۱۸۳۹ء / ۱۲۵۵ھ — انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو آگے بڑھانے مبارز الدولہ وہابی تحریک میں شریک ہوگئے۔ بڑے پیمانے پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا ایک جامع منصوبہ بنایا لیکن یہ راز فاش ہوگیا۔

۳۱- 〃 〃 — ۱۴ ربیع الاول — مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی پر حملہ کرکے مولوی عبدالوہاب، مولوی سلیم اور دوسروں کو گرفتار کیا گیا۔

〃 〃 — ۱۴ ربیع الثانی — مبارز الدولہ کو گرفتار کرکے آخری بار قلعہ گولکنڈہ میں نظربند کیا گیا اور وہ (۱۵) سال تک نظربند رہے اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔

۳۲- ۱۸۴۳ء / ۱۲۵۹ھ — ۱۰ شعبان — رزیڈنٹ کی شکایت کی بنا پر مہاراجہ چندولعل کو جو پیشکار تھے اور دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اپنی خدمت سے علاحدہ کردیا گیا اور ان کی جگہ راجہ رام بخش کو مقرر کیا گیا۔

۳۳- ۱۸۴۵ء / ۱۲۶۰ھ — چھاؤنی سکندرآباد میں عدالت کے قیام کی اجازت دی گئی۔

۳۴- ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۲ھ — نظام کی فوج میں تخفیف کے مسئلہ پر ہنگامہ برپا ہوا۔ صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے انگریز فوج طلب کی گئی اور نظام کی فوج کے افسروں کو برطرف کردیا گیا۔

۳۵۔	۱۸۴۷ء / ۱۲۶۲ھ	۱۷ر ذی قعدہ	سراج الملک کو حسب مشورہ رزیڈنیٹ دیوانی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔
۳۶۔	۱۸۴۷ء / ۱۲۶۳ھ	۱۹ر جمادی الاول	تنخواہ نہ ملنے کے مسئلہ پر سرکاری فوج نے ہنگامہ مچادیا۔ انگریز فوج معہ توپ خانہ کے جو مالکم کے تحت تھی بارہ دری میں طلب کی گئی اور (۱۵۰) سولجروں (انگریز فوج) کو شہر کی حفاظت کے لیے دبلی دروازہ پر متعین کیا گیا۔ آخر کار دیوان کی کوششوں سے اس ہنگامہ کو فرو کیا گیا۔ لیکن نظام کو یہ بات ناگوار گزری۔
۳۷۔	۱۸۴۸ء / ۱۲۶۴ھ		معاش داروں کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن کا تقرر ہوا۔ انگریزوں کی طرف سے کیپٹن ایلس اور سرکار عالی کی جانب سے دارا جنگ اور چتامبر راؤ مقرر ہوئے۔
۳۸۔	〃	〃	جنرل فریزر اور سراج الملک جو اپنے عہدوں سے ایک سال سے معطل تھے ایک دربار میں (ان) دونوں نے نظام کی خدمت میں نذرانہ گزارنے پر انھیں اپنی خدمتوں پر بحال کر دیا گیا۔
۳۹۔	〃	〃 نومبر / ذی الحجہ	سراج الملک کو دیوانی سے علاحدہ کر دیا گیا۔
۴۰۔	۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ	۱۷ر فروری / ۲۳ر ربیع الثانی	شمس الامراء کو خلعت دیوانی عطا کی گئی۔
۴۱۔	〃	〃 ۱۰ر شعبان	شمس الامراء نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دے دیا۔
۴۲۔	۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ		فوج کے چار سو سپاہیوں نے ہنگامہ برپا کیا اور ایک انگریز افسر کو پکڑ لیا۔
۴۳۔	۱۸۵۰ء / ۱۲۶۶ء		رزیڈنسی علاقہ میں شیعہ، سنی جھگڑا ہوا۔ رزیڈنٹ کے حکم پر کوتوال بلدہ نے اس جھگڑے کو ختم کرایا۔
۴۴۔	۱۸۵۱ء / ۱۲۶۷ھ	۲۹ر جون / ۲۸ر شعبان	سراج الملک کو دوبارہ اپنی خدمت پر بحال کیا گیا۔
۴۵۔	۱۸۵۱ء / ۱۲۶۷ھ		کنٹنجنٹ فوج کے قرضہ کے عوض ایک قیمتی الماس انگریزوں کے

پاس رہن رکھا گیا۔

۴۶۔ ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۸ھ — ۳۱ر جنوری / ۲۸ر شعبان — اکبر جاہ (کوتوال بلدہ) کا انتقال ہوا۔ ان کی کثیر دولت نظام کو ملی جس سے انگریزوں کا قرضہ ادا کیا گیا۔ انھیں برہنہ شاہ صاحب کی بارگاہ میں دفن کیا گیا۔

۴۷۔ ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۸ھ — کئی مقامات پر انگریزی تعلقدار مقرر کیے گئے۔

۴۸۔ ۱۸۵۳ء / ۱۲۶۹ھ — ۱۸ر جون / ۱۰ر شعبان — نظام اور انگریزوں کے درمیان جدید معاہدہ ہوا جس کی رو سے برار کو انگریز کے حوالے کر دیا گیا اور جو مسائل باقی تھے۔ ان کی بھی یکسوئی کی گئی۔

۴۹۔ 〃 〃 — 〃 ۲۶ر مئی / ۱۷ر شعبان — سراج الملک کا انتقال ہوا۔

۵۰۔ 〃 〃 — 〃 ۳۱ر مئی / ۲۲ر شعبان — مختار الملک سالار جنگ کو دیوانی کی خلعت عطا کی گئی۔

۵۱۔ ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۰ھ — مبارز الدولہ کا نظر بندی کے دوران انتقال ہوا۔ ان کی لاش کو حیدرآباد لاکر برہنہ شاہ کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔

۵۲۔ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ — ۱۵ر مئی / ۲۱ر رمضان — ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کا انتقال ہوا۔

۵۳۔ 〃 〃 — 〃 ۱۶ر مئی / ۲۲ر رمضان — افضل الدولہ کی مسند نشینی کی رسم انجام دی گئی۔

۵۴۔ 〃 〃 — 〃 ۱۷ر جولائی — مولوی علاؤالدین اور طرہ باز خاں نے پانچ ہزار[۵] مجاہدین کے ساتھ رزیڈنسی پر حملہ کیا۔ مولوی علاؤالدین کو کالا پانی بھیج دیا گیا اور طرہ باز خاں نظام کی فوج کے خلاف مقابلہ میں شہید ہوئے۔

۵۵۔ ۱۸۵۸ء / ۱۲۷۴ھ — ۱۲ر فروری — راجہ صاحب شور اپور نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی طاقت ور انگریزی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انھیں کرنل ڈیوڈسن کے حوالے کیا گیا۔ ۱۲ر مئی کو انھوں نے عنبر پیٹھ

			میں بحالت نظر بندی خودکشی کرلی۔
۵۶ -	۱۸۵۹ء / ۱۲۷۵ھ	۲۳ مارچ / ۱۳ رمضان	۱۸۵۷ء کی جد و جہد کے سلسلہ میں محمد ابراہیم اور چاند خان کو شہر بدر کر دیا گیا۔
۵۷ -	۱۸۶۰ء / ۱۸۷۵ھ		جہانگیر خان ولد بہرام خان نے مختار الملک اور رزیڈنٹ پر گولی چلادی اور پھر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ اسی وقت گولیوں سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔
۵۸ -	۱۸۶۱ء / ۱۲۷۷ھ	جون / ذی الحجہ	ایک معاہدہ کی رو سے کمپنی سرکار نے نظام کو شوراپور، رائچور، نلدرک کے علاقے واپس کر دیے۔
۵۹ -	″	″	مختار الملک کو دیوانی سے علاحدہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن رزیڈنسی کی مداخلت کی وجہ سے یہ کوشش ناکام ہوئی۔
۶۰ -	″	″	اقدار الدولہ پر مقدمہ چلایا گیا اور دوران مقدمہ رزیڈنٹ کو رشوت دینے کی خبر پھیل گئی۔ اسی بناء پر اقدار الدولہ پر یہ پابندی لگادی گئی کہ جس دربار میں رزیڈنٹ شریک ہوں اس میں اقدار الدولہ حاضر نہ ہوں۔
۶۱ -	۱۸۶۹ء / ۱۲۸۵ھ	۱۳ ذی قعدہ	افضل الدولہ آصف جاہ خامس کا انتقال ہوا۔
۶۲ -	″	″ ۱۶ ذی قعدہ	میر محبوب علی خان تخت نشین ہوئے۔ چوں کہ وہ کم عمر تھے اس لیے ایک ریجنسی قائم کی گئی جو امیر کبیر شمس الامراء، عماد الملک اور مختار الملک پر مشتمل تھی۔
۶۳ -	۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ		مختار الملک برار کی واپسی کے مسئلہ پر لندن گئے، چند ماہ کے قیام کے بعد ناکام واپس ہوئے۔
۶۴ -	″	″	شمس الامراء کا انتقال ہوا۔ اس لیے رشید الدین خان اقتدار الملک کو ریجنسی کا رکن مقرر کیا گیا۔
۶۵ -	۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ		رشید الدین خان کا انتقال ہوا۔
۶۶ -	۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ	۲۹ ربیع الاول	نواب مختار الملک کا انتقال ہوا۔

۶۷ - ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ	میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کو پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین کیا گیا۔
۶۸ - ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ	میر لائق علی خان سالار جنگ کو دیوان مقرر کیا گیا۔ ان ہی کے دور میں فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان بنایا گیا۔
۶۹ - ۱۸۹۷ء	بال کرشنا شنافے کی گرفتاری
۷۰ - ۱۸۹۸ء	بابا صاحب کی بغاوت

کتابیات

۱۔ اردو کتابیں

(۱) پی۔سی۔جوشی — انقلاب ۱۸۵۷ء (اٹھارہ سو ستاون)
ترقی اردو بیورو،
نئی دلی، ۱۹۷۲ء

(۲) ۔ شیخ حسام الدین (مترجم) — انقلاب ۱۸۵۷ء۔ تصویر کا دوسرا رُخ
اتر پردیش اردو اکاڈمی،
لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

(۳) نصیر الدین ہاشمی — جنگ آزادی کی سچی کہانی
کرشنا سوامی مدیراج
حیدرآباد۔ ۱۹۵۷ء

(۴) میر دلاور علی دانش — ریاض مختاریہ
اعظم اسٹیم پریس،
حیدرآباد۔ ۱۹۴۲ء

(۵) محمد سراج الدین طالب — میر عالم
پرانی حویلی،
حیدرآباد۔ ۱۳۴۸ھ

(۶) محمد سراج الدین طالب — نظام علی خاں، حصہ دوم
مطبوعہ شمس الاسلام،
حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۴ء

(۷) عبدالمجید صدیقی ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۴۰ء	مقدمہ تاریخ دکن
(۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں دارالطبع، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء	تاریخ دکن (عہدِ حالیہ)
(۹) ابوالبرکات محمد قطب اللہ	تاریخ بیڑ
(۱۰) نواب فراموز جنگ	تاریخ قلعہ اودگیر
(۱۱) منشی امیر حمزہ	تاریخ کولاس
(۱۲) مرزا مہدی علی خاں	گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالم، ۱۹۰۸ء
(۱۳) مانک راؤ وٹھل راؤ	بستان آصفیہ حصہ اول
(۱۴) صمصام شیرازی	یادگار سلور جوبلی حصہ اول
(۱۵) " "	" " حصہ دوم
(۱۶) میر احمد علی رضوی	حالات ضلع کیل
(۱۷) ایشونت راؤ نمبالکر مطبع دکن پریس، دارالشفاء، حیدرآباد، ۱۳۱۱ھ	تاریخ خاندان راجہ راو رمبھا جسونت بہادر نمبالکر